زمینی ستارے

حنان علی عباسی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

اس کتاب کی کسی قسم کی اشاعت مصنف کی اجازت کے بغیر نہیں کی جاسکتی

قانونی مشیران: ملک وحید انجم، اسد عباسی ایڈووکیٹ

ملنے کا پتہ

مسٹر بکس سپر مارکیٹ اسلام آباد

علی بک ایجنسی کمیٹی چوک راولپنڈی

جدران بک شاپ اُردو بازار لاہور

برائے خط وکتابت: پی او بکس نمبر 3234 جی پی او اسلام آباد

آزمائشی اشاعت: اگست 2007ء

طبع: حسین فیاض پرنٹرز لاہور

قیمت: 400 روپے

ڈالر: 15

ریال: 30

Marfat.com

ذخیرہ
5443

انتساب

ماں کی ٹھنڈی چھاؤں

اور

ابو جی کے سائبان کے نام

Marfat.com

بانی پاکستان نے فرمایا

دولت صحت اور بہادری سے جب انسان محروم ہو جائے
تو اسے نا قابل تلافی نقصان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں! اگر
انسان حوصلہ ہار بیٹھے اسکے اعصاب جواب دے جائیں
تو سب کچھ لٹ جاتا ہے......

فرمان شاعر مشرق

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ!

Marfat.com

اظہارِ تشکر

''زمینی ستارے'' مرتب کرنے کیلئے جب سے قلم اُٹھایا، چوہدری محمد یاسین حاجی منیر اورکزئی، رضوان صادق خان، عبدالباسط عباسی، بلال احمد ڈار پروفیسر عمر ریاض، ارشد محمود، محمد صابر اور دیگر مخلص دوستوں نے میری حوصلہ افزائی میں کبھی کمی نہیں آنے دی، اِنکا تہہ دِل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

Marfat.com

ترتیب

صفحہ نمبر	
6	**مقدمہ**
17	ہسپتال شاید میری دنیا و آخرت میں بہتری کا سبب بنے
21	''نزدیک تک دیکھتی آنکھیں، دُور تک سوچتا ذہن''
26	میرے اندر کا ''پٹھانی خون'' غلط بات پہ جوش مارتا ہے
29	ذہانت کوئی بکاؤ مال نہیں
33	37 سالہ تجربے کا حامل سیاستدان، وکیل، شاعر اور مقرر
35	کامیابی کے لیئے بیساکھیوں کا سہارا نہ لینے والا سواتی
38	''قرشی دواخانہ'' کا تصور علامہ اقبال نے دیا تھا
40	افتخار عارف ''تم بھی ٹوٹ جاؤ گے''
45	ایک جاندار پھول جو کراچی کے ساحلوں پہ کھلا
53	قانون وانصاف کی نصف صدی پر پھیلی کہانی
59	زندگی کو اپنے انداز سے جینے والے جنرل مشرف کی کہانی

Marfat.com

اخبار فروش سے وزیراعظم کے مشیر اور اخبار فروشوں کے قائد تک	61
"سیاسی پنجرے" کا ایک مست پرندہ	66
میں نے حکمران جماعت کے سربراہ میاں اظہر کو واضح اکثریت سے شکست دی	70
گانا شہد میں ملا ایک زہر ہے	74
قومی ترانے کی دُھن پر اکلوتے بیٹے کی شادی کی	77
حقیقت کی تلاش کا سفر "میر سویٹ ہاؤس" سے شروع ہوا	81
نوشہرہ کے قصبے زیارت کا کا صاحب سے اسلام آباد تک	87
امن کی بانسری بجانے کیلئے میرے بھائی نے جان کی قربانی دیدی	89
حکمرانوں کے خلاف بے خوف لڑنے والا "کمزور" آدمی	92
میرے گھر کے صحن سے شروع ہونیوالا سکول آج ایک تعلیمی تحریک بن چکا ہے	95
قائد اہلحدیث کی مختصر کہانی	98
پڑھا لکھا طبقہ بھی سرمایہ داروں کا دلال بن گیا ہے	100
سابق سنیئر منسٹر سرحد اپنی داستان حیات سناتے ہیں......	102

Marfat.com

''اسلام آباد میں چلنے والی لاکھوں گاڑیوں کا قبلہ درست کیا'' 107

چھوٹے قد کا بڑا لیڈر 111

بچپن کی گلیوں میں گھروں کے شیشے میری گیند سے ٹوٹے تھے 113

ملک کی معاشی مملکت کا ''صدر'' 117

ڈاکٹر طاہر القادری کا کل اور آج 118

تختی اور سلیٹ سے شروع ہوا 121

سکول ٹیچر کا بیٹا ہوں 124

سوچ بھی بغاوت ٹھہری 127

عالم آن لائن 132

زندگی کی پہلی لہر ایک دن آئے گا.....! کی امید سے پہلی 133

میں نے انگریز سائنسدانوں کی پچاس سالہ تحقیق کو غلط ثابت کر دکھایا 135

''ہار سے ڈرنے والا شخص کبھی نہیں جیت سکتا'' 138

مزدور سے ممبر قومی اسمبلی تک 143

Marfat.com

''اِک چہرے پہ کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ''	146
میرے والد مجھ سے کہیں زیادہ باصلاحیت انسان تھے	148
وہ مرد جو مسجد سے اُٹھ کر قومی اسمبلی تک آ پہنچا	152
''ایک خواب کو تعبیر کے دھاگے میں پرونے والا''	154
لفظوں سے اَن دیکھی دنیا میں لے جانیوالا'' پاکستانی ابن بطوطہ''	159
ماضی کی صحافی، حال کی سفارت کار	162
ملکوٹ کا سردار مہتاب احمد	164
غربت کی چکی سے گزرنے والا آزادی کشمیر کی جدوجہد کا سردار	166
قاری خوشی محمد کا خوش آواز فرزند	171
ٹاٹ سے لارڈ تک	172
مولانا اعظم طارق کے بھائی اور ڈاکٹر طاہر القادری کے بیٹے سے الیکشن جیتا	176
ڈپٹی سپیکر قومی اسمبلی کے کامیاب سفر پر ایک نظر	179
''چھوٹے گھر'' سے اُبھرنے والا ''بڑا'' آدمی	183

یہ ترتیب حروفِ تہجی کی مناسبت سے دی گئی ہے

Marfat.com

بارش کا پہلا قطرہ

اسماعیل میرٹھی

گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی
پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہ خطرہ
ناچیز ہوں میں غریب قطرہ
تر مجھ سے کسی کا لب نہ ہوگا
میں اور کی گوں نہ آپ جو گا
کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا
اپنا ہی کروں گا ستیاناس
آتی ہے برسنے سے مجھے شرم
نی پتھر تمام ہیں گرم
خالی ہاتھ سے کیا سخاوت
پھیکی باتوں میں کیا حلاوت
کس برتے پہ میں کروں دلیری
میں کون ہوں کیا بساط میری
ہر قطرے کے دل میں تھا یہ غم
سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم
کھچڑی سی گھٹا میں پک رہی تھی
کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی
اک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور
ہمت کے محیط کا شناور
فیاض و جواد و نیک نیت
بھڑ کی اسکی رگ حمیت
بولا للکار کر! کہ آؤ!
میرے پیچھے قدم بڑھاؤ
کر گزرو جو ہو سکے احسان
ڈالو مردہ زمین میں جان

Marfat.com

یارو! یہ ہچر مچر کہاں تک
اپنی سی کرو بنے جہاں تک
مل کر جو کرو گے جانفشانی
میدان پہ پھیر دو گے پانی
کہتا ہوں یہ سب سے برملا میں
آتے ہو تو آؤ لو چلا میں
یہ کہہ کے وہ ہو گیا روانہ
''دشوار ہے جی پہ کھیل جانا''
ہر چند کہ تھا وہ بے بضاعت
کی اُس نے مگر بڑی شجاعت
دیکھی جرات جو اُس سخی کی
دو چار نے اور پیروی کی
پھر ایک کے بعد ایک لپکا
قطرہ قطرہ زمین پہ ٹپکا
آخر قطروں کا بندھ گیا تار
بارش لگی ہونے موسلادھار
پانی پانی ہوا بیاباں
سیراب ہوئے چمن خیاباں
تھی قحط سے پائمال خلقت
اس مینہ سے ہوئی نہال خلقت
جرات قطرے کی کر گئی کام
باقی ہے جہاں میں آج تک نام
اے صاحبو! قوم کی خبر لو
قطروں کا سا اتفاق کر لو
قطروں سے ہو گی نہر جاری
چل نکلیں گی کشتیاں تمہاری

Marfat.com

مُقدّمہ

قلم پکڑنے کی توفیق بخشنے والے خدائے بزرگ و برتر کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ''زمینی ستارے'' آپ کے ہاتھوں میں آ گئی...... یہ زندگی کے ساز پر گائے گئے اُن پچاس نغموں کا عنوان ہے جو سُوز، سازش، درد اور خوشی سے بھرے پڑے ہیں...... ہونٹوں ہونٹوں محنت کی سُرخی بانٹنے والے ان پچاس گیتوں کے خالق کسی موقع کو اپنی اُنگلی سے پھسلنے نہیں دیتے اور جہدِ مسلسل سے اپنی زندگی کی کامیابی کے اُصولوں سے بجی ایک دُھن بنا لیتے ہیں۔ گہرے سناٹوں میں گائے گئے یہ ''گیت'' سن کر آپ کی سماعتوں میں آس کے دیے جلیں گے...... اس کتاب کے کردار زندگی کی وکٹ پہ کھیلے گئے ایسے چند سٹروکس بھی تصور کئے جا سکتے ہیں جنہوں نے علاقائی سرحدوں کو عبور کر کے قومی اور کچھ نے بین الاقوامی سطح تک رسائی حاصل کی...... یا پھر اسے زندگی کے اسٹیج پر کی گئی پچاس تقریریں ہی سمجھیں جن میں اُمید کا رنگ غالب ہے...... ''زمینی ستارے'' کے صفحات یہ واضح کریں گے کہ اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے والے ان لوگوں کو اندھیرے سے روشنی تک مختلف مراحل کی چکی میں پسنا تو پڑا لیکن وہ مایوسی کے مفہوم سے نا آشنا ہو کر اپنی شخصیت تعمیر کرتے رہے۔ انہیں وہ دریا سمجھیے جسکی لہریں اپنی جولانی پر ہیں اور بلا مبالغہ ان شخصیات نے اپنے اپنے انداز اور بساط میں عوامی خدمت کی شمع جلائی ہے۔

صلاحیتوں کے جنگل ہمارے معاشرے کی جھاڑیاں باصلاحیت افراد سے بھری پڑی ہیں...... اس لیے ''زمینی ستارے'' کے لیے نگاہِ انتخاب کہیں ٹھہرتی ہی نہیں تھی کیونکہ یہاں ہر انسان کی کہانی انفرادیت رکھتی ہے۔ مختلف لوگوں کے مزاج کا خیال رکھنے کے باوجود ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو میری کتاب کی فہرست سے اختلاف ہو مگر شاید ہی کوئی اس بات سے اختلاف کرے کہ اسمیں شامل پچاس افراد سب کی طرح ہوتے ہوئے سب سے جدا ہیں...... میں نے زمین کے اوپر چمکنے والے سوچ و فکر کی جدا راہوں کے مسافر پچاس افراد کا اِنتخاب کیا اور پھر آپکی ہمراہگی میں یہ جائزہ لیا کہ اِنسان کیسے ستاروں پر کمند ڈالتے ہیں، نور کی شعاعیں کیسے پھیلاتے ہیں، نگاہیں کیسے اِنکی جانب راغب ہوتی ہیں، زیرو سے ہیرو کا سفر کس طرح طے ہوتا ہے اور قطرے قطرے سے کیسے

Marfat.com

دریا بنتا ہے۔ جب صفحے کالے کرنے شروع کیے تو آرزو تھی کہ یہ کہانی بھرپور ہو...... پھر بال کو تیز تر پھینکنے کیلئے ایک تیز باولر کی طرح ان شخصیات کے بارے میں کھوج لگانے ان کے ماضی تک گیا، چونکہ انسان دوسروں کے تجربات کی روشنی میں اپنے مستقبل کی بہتر تصویر بنا سکتا ہے۔اس کتاب کے الفاظ ممکن ہے آپ پر یہ واضح کر سکیں کہ آج ہر سُو چرچا جن کے نام کا ہے، اِن کے ننگے پاؤں میں بھی کانٹے ٹوٹے ، اِن ہاتھوں پر چھالے بھی رہے، خون پسینے سے اپنی شخصیت کا باغ نکھارا، راہ حیات کے ان راہگیروں نے الہ دین کا چراغ ملنے کا انتظار کرنے کے بجائے عزم و ہمت کے دیے سے اپنی راہوں کو روشن کیا۔

قارئین! آج عہدِ شباب کی دہلیز پہ ہوں، عمر کے اس حصہ میں اپنے آپ کو مستحکم کرنے کیلئے بہت سا کام کر سکتا تھا لیکن زندگی کا ایک قیمتی سال آپ کیلئے مختص کیا...... مجھے آپ کی کامیابی سے کیا ملنا......؟ ہاں! شاعر مشرق علامہ اقبال نے آپ کو ملت کے مقدر کا ستارہ قرار دیا ہے اس لیے آپ کے عروج سے مجھے ایک غرض ہے، آپکی روشنی سے اور بہت سے دیے جلیں گے۔ لہذا آپ کی کامیابی میری کامیابی ہے۔ جب میں نے ''زمینی ستارے'' مراتب کرنے کا ارادہ کیا تو اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنی مشکل کتاب ہوگی، شخصیات کا انتخاب اور پھر ان کے بارے میں مواد کا حصول ایک کٹھن مرحلہ تھا جسے میں نے تکمیل کی منزل تک پہنچانے کیلئے مسلسل جدوجہد کی۔ انسانی ترقی کے بارے میں نامور لوگوں سے ملاقاتوں میں جو سُنا سمجھا، اِنکے چہرے پہ جو کچھ پڑھا وہ بیان کر دیا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ اس مخلوق کی کامیابیوں کی بنیادیں کہاں رکھی گئیں......؟ اور اِن کی ناموری کا راز کیا ہے......؟۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ تمام لکھنے والوں کے مقابلہ میں ذرہ برابر بھی نہیں لیکن پُر اُمید ہوں کہ ایک سال پر محیط شب بیداری اور پھر دِن میں بھی لگاتار کام آپ کو ''زمینی ستارے'' کے قریب لائے گا...... اِس میں آپ جہاں ملکی وقومی افق پر چمکنے والے مختلف شعبوں سے متعلقہ لوگوں کو پڑھیں گے وہاں ہی آپ اس سطح پر کچھ گمنام لوگوں کو بھی پائیں گے۔

زمینی ستارے عام آدمیوں کے ''بڑا'' بننے کی روداد اور اِن لوگوں کے افکار کی ترجمان ہے اسمیں بدلتے ملکی حالات اور سماجی واقعات کے ساتھ ساتھ دلکش نایاب تاریخی تصاویر اور

Marfat.com

آٹوگراف بھی شامل اشاعت کر دیئے ہیں۔ یہ کتاب خداداد صلاحیتوں سے مٹی کو سونا بنانے کی کوشش کرنے والے بڑے لوگوں کی زندگی کے چھوٹے دنوں کی کہانی ہے مگر اس کہانی ''بڑوں'' کی دھرتی پہ موجودگی کے باوجود ہماری اجتماعی زندگی کا تاریک پہلو یہ ہے کہ تسبیح کے دانے کہلانے والے انسان بکھر رہے ہیں۔۔۔۔ان پچاس بکھرے لوگوں جنہوں نے لاکھوں زندگیوں میں جھانکنے اورعوام کے اصل مسائل کے مختلف روپ دیکھے کو صفحات پر اکٹھا کر کے ایک ''کتابی اتحاد'' بنانے کی جسارت کی ہے۔اس کتابی اتحاد میں شامل ہر فرد کو احساس ہوگا کہ زمانہ ہمیں بہت پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہے۔۔۔۔ہمیں اپنی لغزشوں کا اعتراف کرنا ہوگا۔۔۔۔اپنی صفوں کو حوصلوں سے از سر نو ترتیب دینا ہو گا۔۔۔۔ پیار کے چھینٹوں سے نفرت کی آگ بجھانا ہوگی۔۔۔۔فکر کو بیڑیوں سے آزاد کرانا ہوگا۔۔۔۔بے منزل کارواں کو ایک منزل دینا ہوگی۔۔۔۔سچے جذبے اور حقیقی تڑپ کے ساتھ ''خلائے قیادت'' کو پُر کرنا ہوگا۔تب ہمیں کامرانی اورعروج کے اُجالے آواز لگائیں گے،تو آیئے یہ عہد کریں کہ!

کلی کلی پہ چمن میں نکھار آنے تک
خزاں سے جنگ رہے گی بہار آنے تک

قارئین! کتاب میں شامل لوگ کوئی ''فرشتے'' ہیں نہ میں انکی پارسائی کا دعوی کرتا ہوں یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے نہ میں جٹلا سکتا ہوں نہ آپ انکار کر سکتے ہیں۔یہ سارے لوگ انسان ہیں اور انسانوں کی تمام خامیاں ان میں بھی موجود ہوں گی۔میں نے اِنکے لیئے زمینی ستارے کے الفاظ استعمال کیے اور ہر کوئی جانتا ہے کہ ستاروں کے سردار چاند کے چہرے پہ بھی ''داغ''تو ہوتے ہی ہیں۔مگر یہاں میں نے پوری طرح اِنکی ذات کو حدف تنقید نہیں بنایا بلکہ یہ کوشش کی ہے انکی کمزوریوں کو فراموش کر کہ تلخ حالات کا وہ منظر پیش کیا ہے جو سماجی بدصورتی دُور کرنے میں مدد دے سکے۔اپنی تحریر کو مبالغہ آرائی سے پاک کرنے کیلئے میں نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ کسی شخصیت کی مداح وثنا نہ ہو۔۔۔۔اگر مناسب تعریف ہو بھی تو سچائی کے عنصر کی وجہ سے ہونی چاہیے۔جیسے سرسید احمد خان نے کہا تھا کہ ''دِل کی بیماریوں میں سب سے مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے،جسطرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے اسی طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی

Marfat.com

خوب چیز ہے''۔اسی نظریے پر چلتے ہوئے زمینی ستارے میں شخصیات کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا بلکہ سچائی پر مبنی تعریفیں بھی کہیں کہیں آپ کو پڑھنے میں ملیں گی۔میری تحریر میں ''آپ'' کے بجائے ''تم'' کا لہجہ ممکن ہے آپ کی نظر میں کھٹکے لیکن ہرگز یہ نہ سمجھیئے گا کہ میں اپنے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔

کتاب میں شامل مختلف طبقوں سے متعلقہ یہ غیر معمولی لوگ اس بات کی دلیل ہیں کہ ہمارا معاشرہ صلاحیتوں سے محروم نہیں ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اربابِ صلاحیت دلجمعی اور یکسوئی سے ضروری کاموں میں مصروف ہو جائیں اور ایسا کام کریں جس سے انسانیت کو فائدہ ہو۔اصل کامیابی تو یہ ہے کہ کچھ بننے کیلئے یا کچھ حاصل کرنے کیلئے جدوجہد کی جائے اور اس عرصہ میں جو اُتار چڑھاؤ آئیں انہیں بخوبی عبور کیا جائے۔یہ کتاب اظہار ہے کہ!عمر اسی طرح کٹ جاتی ہے جس طرح ستارے آسمانی دنیا پر ایک رات کیلئے نمودار ہوتے ہیں،دنیا میں حکومتیں بدلتی رہتی ہیں،تاج گرتے رہتے ہیں،ظلمتیں نور کی جگہ لے لیتی ہیں اور مایوسیوں کے بادل اُمید کی روشنی کو مٹا دیتے ہیں۔زندگی سدا رہنے والی خوشیوں اور نہ ہمیشہ رہنے والے غموں کا نام نہیں بلکہ یہ نشیب وفراز کی ایک قوسِ قزاح ہے۔

اس جہاں میں ترقی کی جستجو کرنے والے ہر شخص کی اپنی منزل ہے یہ ضروری نہیں کہ ہر کوئی صدر یا وزیر اعظم بنے بلکہ ضروری یہ ہے کہ اپنی منزل کا تعین کر کے نگاہ حدف پہ رکھتے ہوئے چل پڑے کیونکہ تاریخ میں ہمیشہ کامیابی انہی کے گلے کا ہار بنی ہے جو حالات کی سنگینی کے سامنے حوصلے کی تلوار اُٹھاتے ہیں۔

اب میں سینکڑوں دِنوں کی محنت اور اپنے ناقص غور وفکر کا نچوڑ یہ چھوٹی سی کتاب آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا...... گو کہ اسے آپکی خدمت میں پیش کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا لیکن مجھے آپ کی ذرہ نوازی پر بھروسہ ہے۔باقی جب آپ میری تحریر پر غور فکر فرمائیں گے تو آپ کو خود ہی میری خواہش کا اندازہ ہو جائے گا۔جانتا ہوں کہ دِل سے اُٹھنے والی تمناؤں کی تکمیل آسان نہیں ہوتی پر دعا ہے کہ میری کتاب کے خواب کو ترقی خوشحالی اور امن ومحبت کی صورت میں تعبیر

Marfat.com

ملے۔آپ سے درخواست ہے کہ جس شخصیت کے تذکرے میں کمی بیشی دیکھیں یا کسی وضاحت واضافے کی ضرورت محسوس کریں تو برائے کرم مجھے آگاہ کریں اور کتاب کے بارے میں اپنی رائے دینا مت بھولیے گا۔

حنان علی عباسی

E-mail: pakwatan786@gmail.com

Mob: 0300-5562496

Marfat.com

ہسپتال شاید دنیا و آخرت میں میری بہتری کا باعث بنے، ابرار الحق

یہ دیوانہ کبھی ''پرینو'' کو گھر بسانے کی دعوت دیتا ہے اور کبھی سارے جہاں کو ''بلو'' کے گھر بھیجنے کی شرارت کرتا ہے..... میوزک کے شیدائیوں کے لیے ابرار الحق کا نام کوئی نیا نہیں، اس حقیقت کے باوجود کہ اس کے چند نغمے انگریزی کے رنگ کو بھی عیاں کرتے ہیں کچھ احباب کا خیال ہے کہ اسکی آواز سے پنجابی کی مقبولیت لوٹ آئی ہے۔ میوزک کے شائقین کو صرف ابرار کے گیتوں کی دھنیں ہی جھومنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ابرار الحق نے گزشتہ دس سالوں میں نہ صرف سنگیت کے چاہنے والوں کو اپنا گرویدہ بنایا بلکہ اس نے انسانی خدمت کی شمعیں بھی جلائی ہیں، ابرار الحق نے وقت کی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی آواز کی سحر کو انسانیت کی بھلائی کیلئے استعمال کیا۔ اس نے لوگوں کے سامنے ''سہارا ٹرسٹ ہسپتال'' کا منصوبہ رکھا اور اسے بے پناہ عوامی معاونت سے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اس ہسپتال سے اس وقت ہزاروں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ اس طبی تحریک کے بانی اور سٹار سنگر ابرار الحق سے کیا جانے والا انٹرویو پیش خدمت ہے۔

میری پیدائش فیصل آباد میں ہوئی کچھ عرصہ وہاں رہنے کے بعد ہم گجرات آ گئے۔ میوزک میرے اندر بچپن سے موجود تھا۔ میں میونسپل جونیئر ماڈل سکول گجرات میں زیر تعلیم رہا۔ اس کے بعد ہم اسلام آباد شفٹ ہو گئے اور سن رائز کیمبرج سکول سے میٹرک کیا۔ سرسید کالج راولپنڈی سے گریجویشن، قائداعظم یونیورسٹی سے ایم ایس سی کا امتحان پاس کیا اور پنجاب لاء کالج راولپنڈی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ میں مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں، والد سول سروس میں تھے جبکہ بڑے بھائی آرمی آفیسر ہیں۔ عملی زندگی کے آغاز پر سب سے پہلے میں نے ایچی سن میں لیکچر شپ کی تعلیم اور میوزک کا سلسلہ چلتا رہا اور میں راولپنڈی آ گیا، یہاں میری ملاقات ایک دوست نے راولپنڈی آرٹ کونسل کی محترمہ نائید منظور صاحبہ سے کروائی۔ آرٹ کونسل میں مختلف تقریبات کا انعقاد ہوتا رہتا اور میں شوقیہ طور پر وہاں چلا جایا کرتا۔ میرے ایک دوست اسد نے

زندگی زندہ دلی کا نام ہے

Marfat.com

مشورہ دیا کہ یار! اپنا میوزک گروپ بنا لیتے ہیں۔ شروع شروع میں ہماری حوصلہ افزائی نہیں ہوئی لیکن جب میں نے ''کہنے کہنے جاناں بلو دے گھر'' بنایا تو جس کو سنایا اُس نے اسے بے حد پسند کیا۔ میں نے اسے لانچ کرنے کا پروگرام بنایا اور اس سے مجھے ٹھیک ٹھاک پہچان ملی، میں نے ایچی سن کی جاب چھوڑ دی۔ پھر میرے گانوں نے بے انتہا کامیابی حاصل کی اور جنوبی ایشیاء میں پذیرائی کے ریکارڈ قائم کیے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھ سے ایک ہسپتال بنوا دیا جو شاید دنیا و آخرت میں میری آسانی اور بہتری کا باعث بنے۔ اپنے ابتدائی عمر کے دنوں کی باتیں کرتے ہوئے ابرار کہتا ہے کہ بچپن میں شرارتی تھا اس دوران جب بھی کوئی ''گنجا'' دیکھتا تو اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیتا۔ یہ شوق اب بھی کبھی کبھار زندہ ہو جاتا ہے۔

26 جون 2005ء کو ابرار الحق کی شادی میں پرویز الٰہی اور دیگر شریک ہیں

کم عمری میں کرکٹ کا شوقین تھا۔ سکول سے یونیورسٹی تک دل لگا کر کرکٹ کھیلی۔ کبھی کبھی والد صاحب بھی میرا کھیل دیکھنے میدان میں آ جاتے تھے۔ میں کرکٹ کریئر تو بنا سکتا تھا لیکن وہ عمر سے پہلے ختم ہو جاتی اس لیے میں نے تعلیم پر توجہ دی۔

بچپن

اگر میں گلوکاری کرتا تو شاید اپنے آپ سے مطمئن نہ ہوتا مگر میرے سوشل ورک نے مجھے اطمینان دیا۔ میں پیسے کیلئے نہیں گاتا اپنی عزت کا خیال رکھتا ہوں۔ شادی وغیرہ میں جا کر پرفارم کرنا پسند نہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے بہت عزت سے نوازا، جو عزت مجھے ملی ہے یہ سب اللہ کا کرم اور میری ماں کی دعاؤں کا صلہ ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میری گلوکاری کا انداز بھارتی گلوکار دلیر مہدی سے نہیں ملتا، میرا گانا ''بلو'' اس سے پہلے آیا تھا۔ اب آپ خود اندازہ لگائیں کون کس سے متاثر ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرا گیت 'بلو' پاکستان کے علاوہ بھارت اور چین میں بھی اتنا پسند کیا جائے گا۔

موسیقی کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ میں میوزک کو برا نہیں سمجھتا اور نہ ہی اس بارے میں مذہبی رویوں سے الجھتا ہوں۔ ہمارے ہاں لوگ رشوت کو اتنا برا نہیں

Marfat.com

سمجھتے جتنا میوزک کو سمجھتے ہیں۔ سوشل ورک کی طرف آنے سے متعلق انہوں نے کہا کہ بچپن سے دکھی انسانیت کا جذبہ موجود تھا۔ یونیورسٹی میں بھی ہم نے اپنی مدد آپ کے تحت ایک تنظیم بنا رکھی تھی جو جو مستحق طلباء کی امداد کرتی۔ امی مجھے کہتی کہ بیٹا! کوشش کرو جو عزت ملی ہے اسکا قرض اُتار سکو۔ میں نے پندرہ جون انیس سو اٹھانوے میں ''سہارا'' کا آغاز کیا۔ اس کا پہلا پروجیکٹ پچپن بستروں پر مشتمل ''صغریٰ شفیع ہسپتال'' تھا، جو پانچ ایکڑ زمین پر قائم کیا گیا اور اس کا کام اب پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ میرا ہسپتال بنانے کا خواب

پسماندہ علاقے کا تھا اس حوالے سے میں نے نارووال کا انتخاب کیا جہاں لوگ طبی طور پر پسماندگی کا شکار تھے۔ اب خدا کے فضل سے یہاں تربیت یافتہ ڈاکٹرز کی ایک ٹیم موجود ہے۔ میں نے ''سہارہ'' شروع کیا تو پھر شہزاد رائے آگے آیا پھر جواد آیا اور اب مزید لوگ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان لوگوں میں کچھ کرنے کا شوق موجود ہے۔ ہمارے ہسپتال سے لاکھوں مریضوں کا علاج کیا جا چکا ہے۔ اگر میری ماں آج زندہ ہوتیں تو میرے اس منصوبے پر بہت خوش ہوتیں وہ اس دنیا سے گئی تو مجھے ایسا لگا کہ میری آدھی دنیا رہ گئی ہو۔ اگر آج بھی کوئی کہے کہ تمہارے پاس جو عزت، شہرت، دولت یا کچھ اور ہے اسے دے کر ماں لے لو تو میں بخوشی قبول کرلوں گا۔

ابرار الحق کا کہنا تھا کہ مجھ میں یہ اہلیت نہیں کہ کسی کا لکھا ہوا گا سکوں، اپنے لیے اس حساب سے لکھتا ہوں کہ اسے گا بھی لوں۔ جو موسیقار شاعروں کے لکھے ہوئے نغموں اور گیتوں کی دھنیں بناتے ہیں میں ان سے بڑا متاثر ہوتا ہوں۔ میں نے کشمیر کے حوالے سے جو ترانہ لکھا تھا ''یہ علم بغاوت ہے یارو'' وہ میں نے خود لکھا تھا۔ ترانہ اچھی چیز ہے، ملک کیلئے کچھ بھی کر سکتا ہوں لیکن میری نظر میں پہلے ہی بہت زیادہ ترانے گائے جا چکے ہیں۔ میں عملی طور پر کچھ کرنا چاہتا ہوں جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔ جو کچھ میرے پاس ہے اللہ کی دین ہے۔ شاعروں میں غالب کی کیا بات ہے اور امجد اسلام امجد بہت پسند ہیں۔ میرا خیال ہے کہ حکومت کی مدد کے بغیر بھی ہم بے شمار کام اپنی ذمہ داری سمجھ کر کر سکتے ہیں کیونکہ پاکستان کو ہم ہی نے سنوارنا ہے اس حوالے سے میری شاعری ملاحظہ کیجئے!

کیا ہمارا فرض ہے خالی تماشا دیکھنا
کیا ہمیں ہر وقت کرنا ہے گلہ سرکار سے
آؤ مل کر بانٹ لیں جرم ضعیفی کی سزا

Marfat.com

اور لیں بدلے میں لاکھوں کروڑوں کی دعا

سر اُٹھا کر شہر میں چلنے کا موسم آ گیا

آؤ کے موسم بدل دینے کا موسم آ گیا

ایک بات واضح ہے کہ مستقبل میں ہرگز سیاست میں نہیں آؤں گا، سماجی خدمت تک اپنے آپ کو محدود کر دیا ہے۔ اپنے مستقبل کے اہداف کا ذکر کرتے ہوئے ابرارالحق نے بتایا کہ میں بامقصد تعلیم کیلئے سکول بنانا چاہتا ہوں جو ڈگری ہولڈر پیدا نہ کرے بلکہ مقصدیت کے تحت چلتے ہوئے بچوں میں قومی جذبہ بیدار کرے۔ ہم نے سہارہ فار لائف ٹرسٹ کی طرف سے 8 اکتوبر کے متاثرین زلزلہ کیلئے کروڑوں روپے کا ریلیف فنڈ قائم کیا اور ٹرکوں میں خیمے، رضائیاں، ٹینٹ اور کھانے پینے کی اشیاء متاثرہ علاقوں میں پہنچائی۔ میں نے زلزلہ زدہ علاقوں میں متحرک سہارہ کے ورکروں کا خود وہاں جا کر ہاتھ بٹایا۔ ہم نے پاک آرمی کی معاونت سے تیرا سو پچاس فائبر گلاس ہاوسز متاثرہ علاقوں میں قائم کئے۔ سوگ کے ان ایام میں 13 جوڑوں کی اجتماعی شادیوں کا اہتمام بھی کیا۔ متاثرہ بھائیوں کی بے مثال خدمات کے اعتراف میں مجھے نظریہ پاکستان کونسل نے گولڈ میڈل سے نوازا جبکہ صدر پاکستان کی جانب سے تمغہ ایثار عطاء ہوا۔ صدر پرویز مشرف نے اچھی خاصی رقم اپنی جیب سے میرے پروجیکٹ کے حوالے سے دی۔ جب کوئی کہتا ہے کہ ہم نے ابرار کے ہسپتال کیلئے ایک اینٹ کا تعاون کرنا ہے تو میں بے حد خوش ہوتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں جذبوں نہیں لیڈرشپ کی کمی ہے۔ پرستاروں کی دعائیں سٹار بننے کا سب سے بڑا فائدہ ہیں۔ میرے رشتہ دار میرے اوپر فخر کرتے ہیں اور میرے بارے میں مثبت رائے رکھتے ہیں۔ میں خود نصرت فتح علی خان سے متاثر ہوں اور انہیں اپنا پسندیدہ گلوکار مانتا ہوں۔ ذاتی زندگی سے متعلق وہ بتاتے ہیں کہ میں تین بھائیوں اور پانچ بہنوں میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے سب کا لاڈلا ہوں۔ کسی غلطی پر میں شرمندہ نہیں ہوتا کیونکہ غلطیاں تو انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔ میں نے خاندانی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے لیے لڑکی کے انتخاب کا فیصلہ لڑکی کے بڑوں پر چھوڑ دیا۔ گھر والوں نے بریگیڈیئر عابد کی بیٹی حریم عابد کو میرے لیے پسند کیا۔ میری بارات میں وفاقی، صوبائی وزراء، اعلیٰ فوجی حکام کے علاوہ ملک کی اہم سیاسی و سماجی شخصیات شریک ہوئیں۔ میں عام طور پر بحث نہیں کرتا لیکن اگر کوئی غلط بات کرے تو بھرپور جواب دیتا ہوں اسوقت میں اپنے مخاطب کے مرتبے کو بھول جاتا ہوں۔

Marfat.com

"نزدیک تک دیکھتی آنکھیں دور تک سوچتا ذہن"

قومی سطح پر سیاست کرنے والے افراد میں بہت کم لوگ ایک مدبر اور دانشور کی بھی شناخت رکھتے ہیں، احسن اقبال کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہے۔ انہیں تعلیمی ماحول اور رموز سیاست سے آگاہی ورثے میں ملی۔ انکے نانا عبدالرحمٰن دو دھائیوں تک جالندھر کے ایم ایل اے رہے اور انکی امی آپا نثار فاطمہ بھی جنرل ضیاء الحق کے دور میں رکن قومی اسمبلی تھیں۔ ایک منزل کے حصول کیلئے احسن کی ذاتی جدوجہد نے اس تاثر کو کافی حد تک مٹا دیا ہے کہ وہ کوئی سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہونے والا شخص ہے۔ انکا بچپن سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے افکار کے سایے میں گزرا۔ احسن نے 86ء میں امریکہ سے بزنس مینجمنٹ کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیمی سلسلے کی تکمیل کے بعد پاکستان آ گئے اور یہاں کی سیاست سے منسلک ہو گئے۔ عام انتخابات میں جب میاں نواز شریف کو بھاری مینڈیٹ ملا تو انکے ذمے مستقبل کی منصوبہ بندی کا پروگرام 2010ء لگایا گیا۔ میری ان سے انکے دفتر میں ملاقات ہوئی تو انکی طبعیت میں موجود ایک شفیق احسن بار بار اپنے وجود کا احساس دِلا رہا تھا۔ احسن اقبال 28 ستمبر 1958ء کو زندہ دِل والوں کے شہر لاہور میں پیدا ہوئے، انکے والد اقبال احمد چوہدری انجیئر تھے جنکا تبادلہ کراچی میں ہو گیا جس کے باعث انکی زندگی کے ابتدائی 12 سال ''شہر قائد'' میں گزرے۔

اپنی گزری زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے احسن اقبال نے بتایا کہ میں نے 1974ء میں پی ایف کالج سرگودھا سے میٹرک اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف ایس سی کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی آف انجیئرنگ لاہور سے مکینکل انجیئرنگ کی ڈگری حاصل کی..... زمانہ طالبعلمی سے ہی سیاست میں قدم رکھ دیا تھا۔ اس عرصہ میں طلباء سیاست میں بھرپور کردار ادا کرتا۔ چار بھائیوں اور دو بہنوں میں میرا پہلا نمبر ہے۔ 76ء میں جب والد کا انتقال ہوا تو ساری ذمہ داریاں مجھ پہ آ گئیں، اس دوران میرا ایک قدم یونیورسٹی اور دوسرا زمینوں پہ ہوتا، کئی کئی دِن بسوں میں سفر کرنا پڑتا۔ ہمیں اپنے والدین سے محنت اور جدوجہد کا جذبہ ورثہ میں ملا۔ اگر ہم آرام طلب ہوتے تو کچھ نہ کر پاتے۔ 81ء میں یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کا صدر بھی بنا تو یہاں میں نے تعلیمی ماحول کی بحالی اور مثبت سرگرمیوں کی شروعات کیلئے اپنا بھرپور

Marfat.com

کردار ادا کیا۔تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء سیاست میں وقت گزارنے کے بعد میں نے یونیورسٹی آف پنسلوانیا امریکہ کے سکول آف مینجمنٹ سے ایم بی اے کیا۔گورنمنٹ کالج آف لاہور کی ''ینگ سپیکرز یونین'' کے صدارتی انتخابات میں حصہ لیا اِسکے بعد پنجاب یونیورسٹی آف انجینئرنگ کی سٹوڈنٹ یونین کا صدر منتخب ہوکر طلباء کی نمائندگی کا سفر جاری رکھا۔میرے ماموں مسلم لیگ ''قیوم گروپ'' کے سیکرٹری جنرل تھے،انکی سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور انداز میں شریک ہوتا اور اسی طرح میری والدہ آپا نثار فاطمہ جو دومرتبہ قومی اسمبلی کی رکن رہیں،انہیں دیکھ کر مجھ میں سیاست پروان چڑھتی رہی۔والد اُن خوش نصیب انجینئرز میں سے تھے جنہیں قیام پاکستان کے بعد سکالرشپ پہ امریکہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنیکا موقع ملا۔

میری خواہش تھی کہ میں سٹوڈنٹ یونین کی لیڈرشپ کے تجربے کو صحیح سمت لگاؤں۔''لیڈرشپ کے تجربے کو صحیح سمت لگانے کیلئے خاندانی جماعت سے ہٹ کر مسلم لیگ کا انتخاب کیوں کیا''؟ میں نے مسلم لیگ سے عملی سیاست اس لیئے شروع کی کہ یہ پاکستان کی بانی سیاسی جماعت ہے۔میں سمجھتا تھا کہ پاکستان کی ترقی کے ادھورے مقاصد کی تکمیل کیلئے یہ ایک بہترین جماعت ہے،یہ بھی حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کو چند جاگیرداروں نے ہائی جیک بھی کیا تھا لیکن میاں نواز شریف نے اس میں ایک نئی روح پھونکی۔اس جماعت میں Rule of Public کی بات اور پھر اس پر عمل بھی ہوا،اس لیے میں بھی اسی جماعت میں شامل ہوگیا۔مسلم لیگ میں دھڑے بندیاں اس جماعت کی غیر معمولی مقبولیت کی نشاندہی کرتی ہیں۔

احسن اقبال کے مطابق آج کی سیاست میں اپنی جگہ بنانا بہت مشکل کام ہے۔آج وہ دور ہے جب پرانی چودھراہٹیں کبھی آپ کو آگے آنے کا موقع نہیں دیتیں۔سیاست میں جو کچھ میں نے حاصل کیا یہ میری پچھلی بیس سالہ جدوجہد کا نتیجہ ہے۔اپنی والدہ کی شخصیت کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ امی کو سوشل ویلفیئر کا بڑا شوق تھا،ہماری رہائشگاہ کراچی ڈیفنس میں تھی اسکے پیچھے محمود آباد کی کچی آبادی واقع تھی۔والدہ نے گھر کے گیراج کی جگہ پہ کچی آبادی کی بچیوں کیلئے سلائی،کڑھائی اور بنیادی تعلیم کا سکول کھول دیا۔پھر جب ضرورت بڑھی تو انہوں نے کرایے پر جگہ لے کر اسکے دائرہ کار کو بڑھایا۔گفتگو انکے آبائی گاؤں کی طرف چل پڑی تو احسن اقبال نے بتایا کہ ہم نارووال سے تعلق رکھتے ہیں۔1993ء

Marfat.com

حسن اقبال [illegible]

[illegible] دسمبر 1997ء میں [illegible] قومی اسمبلی کا رکن منتخب [illegible] حکومت کے [illegible] 2010ء [illegible] [illegible] 1999ء [illegible]

[illegible]

حسن اقبال نے بات چیت کے دوران [illegible] حسن اقبال کا [illegible] 2010ء میں [illegible]

[illegible] کے حوالے سے بات چیت کرتے ہوئے حسن اقبال نے کہا کہ [illegible]

حسن اقبال [illegible] انٹرویو

[illegible]

Marfat.com

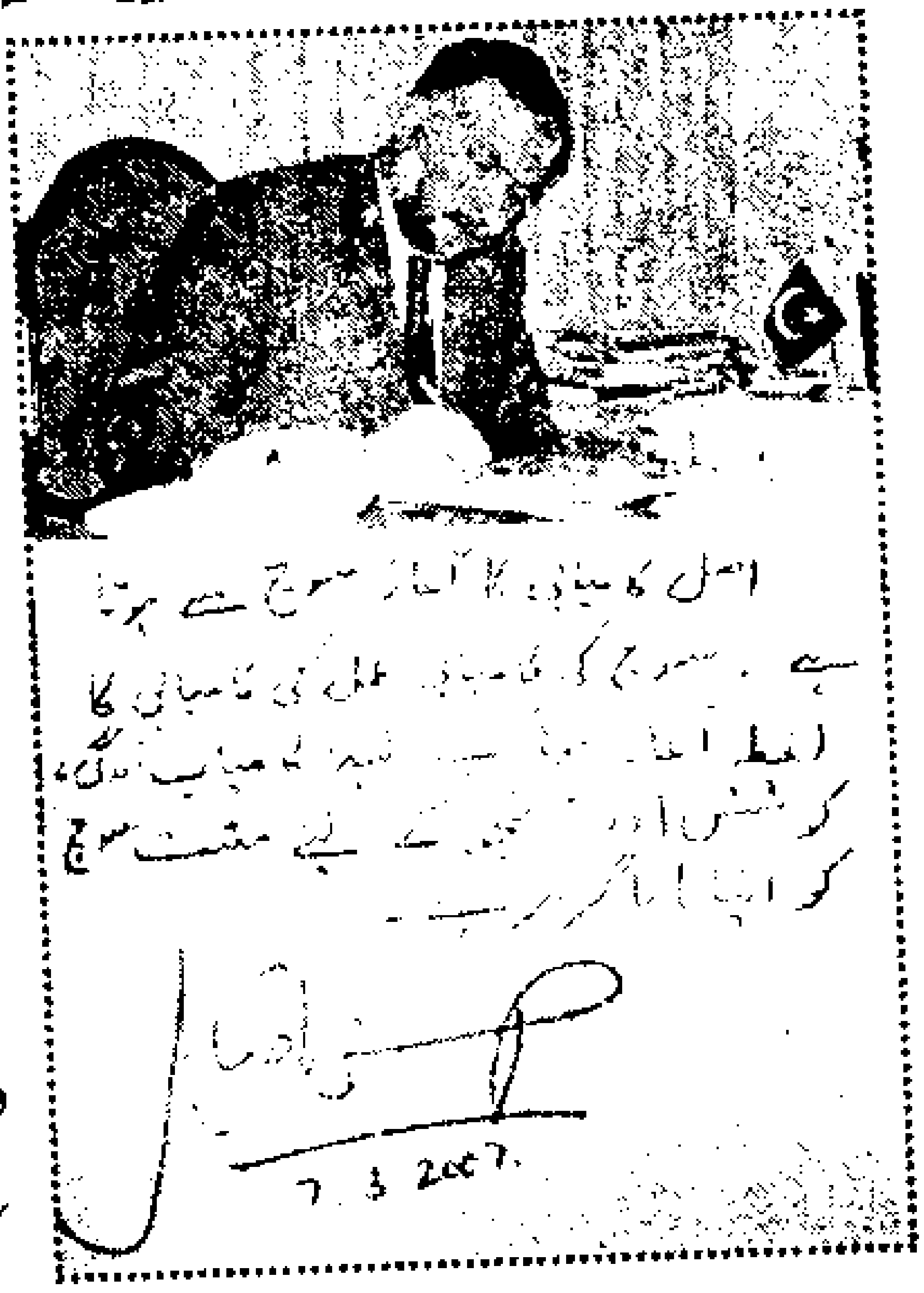

نظام تعلیم میں آج تک کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی جو ہمیں ایسٹ انڈیا کمپنی دے کے گئی تھی۔ ''پنجاب حکومت نے بھی تو تعلیمی نظام میں انقلابی اصلاحات لائی ہیں''؟ اس کے جواب میں احسن اقبال کہنے لگے کہ ''پڑھا لکھا پنجاب'' پر کروڑوں کے صرف اشتہارات چلائے گئے ہم نے تو اشتہار بازی کے بغیر ہی حقیقی تعلیمی انقلاب کا خاکہ تیار کر لیا تھا مگر بدقسمتی سے ہمیں اس میں رنگ بھرنے کا وقت نہیں دیا گیا۔ ہم ایسا نظام چاہتے تھے کہ بیکن ہاوس کا نصاب اور معیار ہی سرکاری سکولوں میں رائج ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ اس سے جرنیل، جاگیردار اور وڈیروں کے بچوں نے استفادہ حاصل نہیں کرنا تھا اس لیے اسے شروعات سے قبل ہی ختم کر دیا گیا۔ نوجوانوں کے حوالے سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یوتھ اس ملک کا مستقبل ہے انہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جھک کر رفعتیں پانے والوں اور دوسروں پر انحصار کرنے والوں کا عروج دیرپا نہیں ہوا کرتا۔ انسان کا مقدر اسکا محنت کرنے کا فیصلہ ہے۔ نوجوان کبھی شاخ نازک پہ آشیانہ نہ بنائیں چونکہ اسکی ناپائیداری انسان کو مایوسی کے اندھیروں میں دھکیل دیتی ہے۔ بات چیت کے دوران وہ مقام بھی آیا جب انہوں نے سیاست اور معلمی کے تعلق پر گفتگو کی کہنے لگے سیاست کے اندر رہ کر بھی آپ معلم کے طور پر کام کر سکتے ہیں چونکہ یہ بات شاید درست ہے کہ تبدیلی سیاست سے ہی آتی ہے۔ اپنی زندگی کے حسین ترین دنوں پر بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ 2004ء میں سعودی عرب گیا تو وہاں ویژن 2010ء طرز کے ہی ایک پروگرام جو ایک صوبے کیلئے بنا تھا کا مجھے سنیئر ایڈوائزر بنا دیا گیا، اس پروجیکٹ کے تحقیقی ایام دینی و دنیاوی ہر حوالے سے میرے لیئے کافی مفید ثابت ہوئے۔ اس پروگرام کو شاہ عبداللہ کی خواہش پر شروع کیا گیا تھا اور اسکا مقصد علم پہ مبنی ایک شہر کا قیام عمل میں لانا تھا۔ اسکے بعد میں میاں نواز شریف کے اسرار پر واپس پاکستان آ گیا۔ احسن اقبال سیاست میں فوج کے کردار کو ایک زہر قرار دیتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جنرل ایوب خان دور میں اقتصادی میدان میں بڑی ترقی ہوئی لیکن اسوقت سیاسی ماحول نہ ہونے کی وجہ سے اس ترقی کے صحیح ثمرات عوام تک نہیں پہنچ سکے۔ حالیہ غیر جمہوری حکومت نے نجکاری کے عمل کے ذریعے سب کچھ بیچنے کا کو پروگرام بنایا تھا، اس پر

Marfat.com

سپریم کورٹ کا بہت تاریخی فیصلہ آیا جسمیں سٹیل ملز کی نجکاری روک دی گئی۔اس مل کا سودا 21 عرب میں ہوا تھا اور 100 عرب کی زمین مفت دی جارہی تھی،ایک بندرگاہ،دو پاور ہاؤس اور ستر کلومیٹر ریلوے لائن بھی مفت دی جارہی تھی۔ایسے میں سپریم کورٹ نے بڑا اچھا فیصلہ کیا۔نجکاری کی منظوری وفاقی کابینہ،صدر اور وزیراعظم دیتے ہیں اس لیے اس کرپشن میں بھی وہی ملوث ہیں۔

Marfat.com

میرے اندر کا "پٹھانی خون" غلط بات پہ جوش مارتا ہے، احمد فراز

میرا قلم نہیں کردار اُس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے
میرا قلم نہیں اوزار اُس نقب زن کا
جو اپنے گھر ہی کی چھت میں شگاف ڈالتا ہے
میرا قلم نہیں تسبیح اس مبلغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
میرا قلم تو ہے امانت میرے لوگوں کی
میرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے

یہ تڑپتی فطرت کے مالک احمد فراز کا قلم بول رہا ہے جس کی نوک سے نکلنے والی سیاہی اُن انقلابی جذبات کو وہ زبان دیتی ہے جنہوں نے احمد کو سیاستدان نہ ہوتے ہوئے بھی مارشل لاء دور میں جیل کی تاریکیاں دکھائیں، خوف اور لالچ کے بغیر لکھنے والے من موہنے لہجے کے حامل اس ''پٹھان'' کو دنیا جانتی ہے۔ حرفوں میں روشنی بھرنے کا عمل انہوں نے برسوں پہلے شروع کیا۔ انکی رومانی شاعری اہل دل کی آواز تسلیم کی جاتی ہے، فراز نے استعمار اور سماجی حدود و قیود کے خلاف بھی لکھا۔ احمد فراز کی ذات پر تو متضاد آراء ہو سکتی ہیں مگر ان کی شاعری پر ہر کوئی ایک ہی رائے رکھتا ہے۔ احمد وہ شاعر ہے جسکا کلام ہر طرح کی مجلس میں سننے والے شوق سے سنتے ہیں۔ انکی شاعری کے دنیا کی اکثر زبانوں میں ترجمے کیے گئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی اور پشاور یونیورسٹی کے نصاب میں بھی فراز کا کلام شامل ہے۔ انہوں نے شاعری کا آغاز ایک رومانی اور تخیل پرست شاعر کی حیثیت سے کیا مگر وہ صرف اسی تک محدود نہیں رہے بلکہ کافی حد تک عوامی جذبات کی ترجمانی کیلئے بھی اپنے قلم کی سیاہی کو استعمال میں لایا اور ایک شعلہ نوا شاعر کے طور پر مشہور ہوئے۔ معروف امریکی شاعرہ اور تنقید نگار میری میکا نالے کے نزدیک ''احمد فراز قومیت کے تنگ نظرانہ طرز عمل سے ماوراء ہو کر وسیع معنوں میں بصیرت افروز استعارے کی زبان میں بات کرتے ہیں، میری کے مطابق فراز واقعتاً ایک بین الاقوامی شاعر ہیں جو انسان نوازی کا منفرد انداز سے درس دیتے ہیں''۔ یہ فراز ہی کا کمال ہے کہ وہ مزاحمتی شاعری میں بھی محبت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ احمد کو لوگ ایک ہر دلعزیز شاعر کے علاوہ انسانی حقوق کے عظیم علمبردار کے طور پر بھی جانتے ہیں۔

دنیا سے کنارہ کشی اور تنہائی کی دولت سے دل بہلانے والا فراز اپنے ماضی کی سیر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ میرے والد کا نام سید محمد شاہ برق تھا، 12 جنوری 1931ء کو سرحد کے شہر کوہاٹ میں پیدا ہوا۔ نویں جماعت میں جب میرا شمار ذہین اور خاموش طالبعلموں میں ہوتا تھا، زندگی میں پہلی بار اپنی ایک ہم عمر لڑکی سے رفاقت نصیب ہوئی

Marfat.com

اس عشق ومحبت نے میرے اندر شاعری کی بنیاد رکھی۔یعنی میری شاعری کا آغاز زمانہ طالبعلمی سے ہی ہو چکا تھا۔دس سال کی عمر میں والد جب میرے بڑے بھائی کیلئے سوٹ کا کپڑا اور میرے کیلئے ایک ناقص کھردرا کپڑا گھر لائے تو میں نے اسوقت یہ لکھ کر اپنے ردعمل کا اظہار کر دیا کہ

جبکہ سب کے واسطے لائے ہیں کپڑا سیل سے
لائے ہیں میرے لیئے قیدی کا کمبل جیل سے

ریڈیو پاکستان کے پروڈیوسر بنا، نیشنل سینٹرز کے ڈائریکٹر جنرل رہا، لوک ورثہ میں کام کیا اکادمی ادبیات کے چیئرمین اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے سربراہ کے طور پر بھی اپنی ذمہ داریاں سرانجام دیں۔بہت سے نوکریاں کرنے والے احمد اپنی پہلی نوکری کے بارے میں بتاتے ہیں کہ میں نے 1951ء میں اپنی پہلی ملازمت ریڈیو پاکستان کراچی میں بطور اسکرپٹ رائٹر کی۔میری شاعری کی وجہ سے پاکستان سمیت دنیا بھر میں ہر خاص وعام نے مجھے بے حد پیار دیا، میں اس معاملے میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔مارشل لاء دور میں زندگی کی ساڑھے چار سالہ جلاوطنی کے حوالے سے پوچھے گئے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میں نے مارشل لاء دور کی زیادتیوں کے خلاف پورے جلال سے اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی پر اس نظام کے خلاف بات کی۔اسوقت کے انڈین اخبارات دیکھتا جو گاندھی مخالفت سے بھرے ہوتے تو مجھے احساس ہوتا کہ آزادی اظہار رائے کتنی بڑی نعمت ہے۔ کراچی پریس کلب کے ایک مشاعرے میں کچھ شعر ہی کیا پڑھے کہ رات کو پولیس آئی اُس نے مجھے صوبہ بدری کے احکامات دے دیئے تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرا وطن مجھ پر زبردستی تنگ کیا جارہا ہے۔اسوقت میڈیا پر مختلف نوعیت کی پابندیاں بھی موجود تھیں۔میں نے سوچا کہ جب ہم اپنے صوبوں اور شہروں میں گھوم پھر نہیں سکتے تو کیا رہ گیا ہے، چنانچہ میں جلاوطن ہو گیا، میری جلاوطنی خود اختیار کردہ جلاوطنی تھی۔دیارِ غیر کے شب وروز کے حوالے سے وہ بتاتے ہیں کہ یہاں مجھے وطن کی یاد ہمیشہ ستاتی تھی۔ہجرت کی علامتیں خود بخود میری شاعری میں آئی ہیں، میری کچھ نظموں اور غزلوں پر ہجرت چھاپ ہے۔جلاوطنی اختیار کرتے وقت میں نے فیصلہ کیا تھا کہ مارشل لاء کے خاتمے تک واپس نہیں آؤں گا اور ایسے ہی کیا۔لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ واپس آکر بھی یہی محسوس ہوا کہ یہاں سے مارشل لاء ختم نہیں ہوا۔آج بھی جاری فوجی ڈکٹیٹرشپ نے میری نظموں کو پرانا نہیں ہونے دیا۔

جب پرچم جاں لے کر نکلے ہم مقتل مقتل
اسوقت سے لے کر آج تلک جلاد پہ ہیبت طاری ہے

فوجی حکومت میں کبھی قوم ترقی نہیں کرسکتی، ذہنی طور پر اس پر پابندی ہوتی ہے اس لیئے سیاسی لیڈرشپ بھی پیدا نہیں ہوسکتی۔آزادی کے نغمے گانے والا پرندہ تو ہر وقت شکاری کی آنکھ میں ہوتا ہے اور پہلا تیر اسی پر چلتا

Marfat.com

ہے۔قومیں فوجوں سے نہیں لوگوں سے بنتی ہیں۔ جب انکی گفتگو میں فیض احمد فیض زیر بحث آئے تو اُن کا کہنا تھا کہ فیض صاحب کے ساتھ گزرا وقت بڑا یادگار اور خوبصورت تھا۔''آپ کی شاعری کے بنیادی اصول کیا ہیں''؟ پر کہتے ہیں کہ شاعری ہو یا کوئی آرٹ اس کا جوہر اعظم ''محبت'' ہی ہوتا ہے۔محبت کئی رنگوں میں اپنا حسن بکھیرتی ہے،وطن سے محبت، ماں باپ سے محبت، مٹی سے محبت اور عاشق اور محبوبہ کی محبت۔لوگوں سے محبت کرنا میری شاعری کا ہمیشہ محور رہا ہے۔میری ہر کتاب میں آپکو محبت کے مختلف مرحلے نظر آئیں گے چونکہ یہ ایسا درخت ہے جو ہمیشہ سرسبز وشاداب رہتا ہے۔میرے حرف ہی میری طاقت ہیں۔ جسطرح میں کھاتا پیتا ہوں، باتیں کرتا ہوں، گاڑی ڈرائیو کرتا ہوں اسی طرح شعر بھی لکھتا ہوں۔ جب لکھنے کو جی چاہتا ہے تو لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔اسی طرح سفر میں یا محفل میں کوئی آئیڈیا آجائے تو لکھتا ہوں۔میری اکثر شاعری صبح کے وقت یا چائے کی پیالی پیتے وقت وجود میں آئی ہے۔ مجھے جتنے بھی ایوارڈز ملے ان میں سب سے بڑا ایوارڈ لوگوں کی محبت ہے۔میرے لیٹر پیڈ یا بورڈ پر یہ نہیں لکھا کہ ''ستارہ امتیاز''، ''کمال فن'' یا ''ہلال امتیاز'' نہ میرے بورڈ پر کوئی عہدہ ہوتا ''چیئرمین''، ''ڈائریکٹر جنرل'' یا ''مینجنگ ڈائریکٹر'' میرا نام احمد فراز ہے اور خاک سے اُٹھوں گا تو یہی بورڈ ساتھ لے جاؤں گا۔میں نے اکادمی کی بنیاد ڈالی اس سلسلہ میں جدوجہد کی مگر پھر فوج آگئی تو اس نے ہمیں ہٹا کر باہر کردیا۔

Marfat.com

ذہانت کوئی بکاؤ مال نہیں

دُنیا کی کم عمر ترین مائیکروسافٹ پروفیشنل ارفع کریم

2 فروری 1995ء کو فیصل آباد کے گاؤں رامدے والی میں فوجی کپتان کے گھر ایک ننھی پری اُترتی ہے۔ بیٹھنا، چلنا اور بولنا سیکھتی ہے اور زندگی کی پہلی دہائی مکمل کرنے سے قبل ہی دُنیا کی کم عمر ترین مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل کے طور پر مقبولیت کی معراج حاصل کرلیتی ہے۔ اسے صرف دس سال کی عمر میں ہی پرائڈ آف پرفارمنس ملتا ہے جسکے حصول کیلئے لوگ ساری زندگی رگڑ دیتے ہیں۔ نو سالہ کی عمر میں کمپیوٹر کی دنیا پہ کمند ڈالنے والی یہ بچی نعت خوانی کا مقابلہ ہو، بحث و مباحثہ ہو، موسیقی ہو یا بیت بازی وہ اپنی عمر کے بچوں کو بہت پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ اسے صدارتی ایوارڈ کے علاوہ مادرِ ملت فاطمہ جناح طلائی تمغہ اور سلام پاکستان یوتھ ایوارڈ 2005ء سے بھی نوازا گیا۔ ارضِ پاک کی اس باصلاحیت بیٹی نے اپنی خداداد صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے میدان میں اپنے نام کی طرح بلند مقام پایا۔ ہم جب شہر کے ایک کونے میں واقع انکے گھر کی سیڑھیاں چڑھ کے ارفع کے انٹرویو کے لیے پہنچے تو انہیں اپنا منتظر پایا، ارفع سے ملاقات کے دوران میرے ہمراہ میرے دوست حنیف عابد بھی تھے۔ دوران انٹرویو انکے گھر کی بجلی تو آتی جاتی رہی تاہم ارفع اور انکے والد کے خیالات کا دیا روشن ہی رہا۔ ارفع کے گھر میں اسکے ''دائیں بازو'' چھوٹا بھائی نو سالہ سرمد کریم اور چھ سالہ داؤد کریم دائیں جانب کمپیوٹرز پہ بیٹھتے ہیں۔ ارفع کے والد کے مطابق بارہ سال قبل جب یہ بچی پیدا ہوئی تو اسکی ذہنی سطح اسکی عمر سے کافی اونچی تھی۔ اسکے والد لیفٹیننٹ کرنل امجد کریم نے ارفع کو آگے بڑھنے کا حوصلہ فراہم کیا۔ کرنل کریم ادبی ذوق کے حامل ہیں وہ بتاتے ہیں کہ اِنکے والد عبدالکریم کوئی تعلیم یافتہ شخص نہیں تھے تب بھی علاقے میں اِنکے مخالفین بھی اِنکی ذہانت پر انہیں ''نوسریا'' نو دماغوں والا کہتے تھے، وہ علاقے کے چوہدری کے طور پر عقل سے لڑتے تھے۔ جب ارفع پیدا ہوئی تو ہمیں ابتداء میں ہی یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اسمیں کوئی غیر معمولی صلاحیت موجود ہے، وہ باتوں کو سمجھنے اور محسوس کرنے میں اپنی عمر کے بچوں سے

ارفع کریم اور وزیراعظم شوکت عزیز

دنیا کے امیر ترین آدمی بل گیٹس اور ارفع کریم کی ملاقات کے دوران لی گئی تصویر

صدر جنرل مشرف ارفع کریم کو انعام دیتے ہوئے

Marfat.com

ارفع اوران کے والد کرنل کریم

کئی زیادہ بہتر تھی۔اس نے جب سکول میں کمپیوٹر دیکھا تو اسکی ضرورت گھر میں محسوس کی۔اسوقت ہم فیصل آباد میں موجود تھے تب میں نے اسکو وہاں کے ایک مقامی ادارے ''اپیٹک'' میں داخل کروایا جہاں میٹرک بعد لڑکے کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ارفع بتاتی ہیں کہ اس ادارے میں انکے سر سہیل اور خرم نے ان پر خاص توجہ دی، انہوں نے میری تحقیق کے شوق کو بڑھایا، میں چھٹیوں کے ان دنوں میں صبح 9 بجے سے شام 6 تک وہیں کام کرتی رہتی۔اڑھائی سال کی عمر میں ہی وہ اس قدر ہوشیار ہو گئی تھی کہ جو آواز سنتی اسکی نقل اتار لیتی ،ارفع نے توتلی زبان میں ہی اپنی دادی کی گود میں بیٹھ کر چھ کلمے زبانی یاد کر لیے تھے۔گڑیوں سے کھیلنے والی اس کم عمر بچی نے کمپیوٹر کے عالمی امتحان میں کامیابی حاصل کر کے مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا ہے۔دنیا بھر میں کمپیوٹرز کو چلانے والے نظام ''ونڈوز'' امریکی کمپنی مائیکروسافٹ کارپوریشن کی ایجاد ہے کے انٹرنیٹ پر چھوڑے گئے سلیبس کے تحت جو کوئی دنیا بھر سے اپنی اہلیت ثابت کرتا ہے اسے کمپنی ''مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ ایپلی کیشن ڈیویلپر'' کی سند عطاء کرتی ہے۔دُنیا کے امیر ترین انسان اور عالمی سطح پر کمپیوٹرز کو چلانے والے نظام مائیکروسافٹ کے مالک بل گیٹس کی جانب سے اسے جو اسے مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ ایپلیکشن ڈیویلپر کی سند عطا ہوئی۔جب ایک بین الاقوامی مقابلہ جیت کر وہ یہ توصیفی سند وصول کر رہی تھی تو اسکی عمر ابھی صرف نو سال نو ماہ تھی۔15 جولائی دو ہزار پانچ کو وہ مائیکروسافٹ کی دعوت پہ وہ اپنے والد کے ہمراہ امریکہ گئی اور وہاں انہیں خاص طور پر ادارے کا دورہ کروایا گیا اور یہاں انکی ملاقات بل گیٹس سے ہوئی تو انہوں نے انہیں یقین دلایا کہ وہ پاکستان ضرور آئیں گے۔ارفع کریم کو اس کی

تخلیقی صلاحیتوں پر بین الاقوامی میڈیا نے ''پاکستان کا دوسرا چہرہ'' قرار دیا۔وہ نہ صرف انفارمیشن ٹیکنالوجی کے میدان میں کامیابیوں کے پرچم بلند کر رہی ہیں بلکہ انہوں نے اپنی خوبصورت آواز کا بھی لوہا منوایا، ابھی وہ چوتھی جماعت ہی میں تھی جب اس نے تیسرے آل پاکستان گائیکی مقابلے میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔

Marfat.com

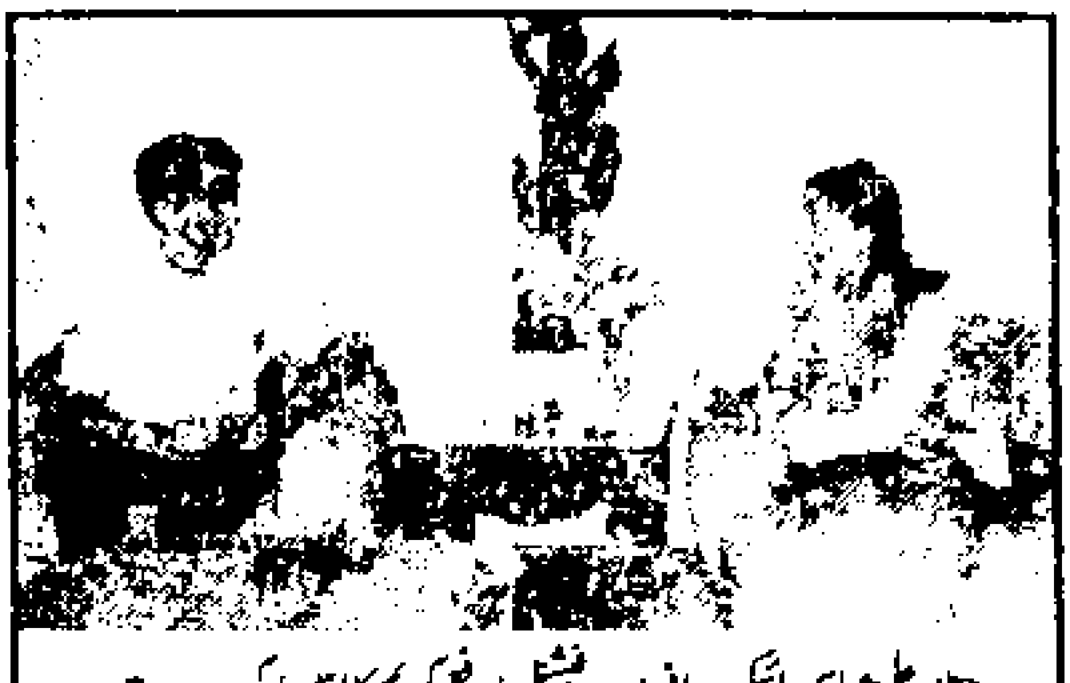
حسان علی عباسی مائیکروسافٹ پروفیشنل ارفع کریم کا انٹرویو کر رہے ہیں

دوران گفتگو ارفع نے بتایا کہ میرا فیصل آباد کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق ہے، والد کرنل امجد کریم افریقہ میں اقوام متحدہ کی امن فورس میں بھی خدمات سر انجام دیتے رہے۔ والد کی پاکستان میں عدم موجودگی کے دوران والدہ زمینوں کا کام سنبھالتی رہیں، ان سے مجھے کچھ کرنے کی روشنی ملی۔ میں نے کبھی اپنی کسی کامیابی پر فخر نہیں کیا، ہمیشہ پھل دار شاخوں کی طرح عجز وانکساری کی طرح جھک کر آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے، ذہانت کوئی بکاؤ مال نہیں، باصلاحیت افراد پر لازم ہے کہ وہ اپنے اپنے مرتبے میں جتنے بڑے ہوتے جائیں اپنے اندر اتنی ہی عاجزی وانکساری پیدا کریں۔ اللہ تعالیٰ کو یہی بات پسند ہے، میری والدہ ثمینہ کریم اولیاء کی دھرتی ملتان سے تعلق رکھتی ہیں۔ میں ڈاکٹر عطاء الرحمن کو اس لیے بہتر انسان سمجھتی ہوں کہ وہ بہت بلندیوں پہ بھی گئے اور پھر انہوں نے تکبر کو نہیں اپنایا۔ ایک سوال کے جواب میں ان کا کہنا تھا کہ موجودہ دور میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے میدان میں مثالی ترقی ہوئی ہے۔ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں گی دنیا کے بہترین اداروں سے تعلیم حاصل کر کے واپس پاکستان ہی آؤں گی چونکہ اس دھرتی کا میری صلاحیتوں پر پہلا حق ہے۔ میری دلی تمناء ہے کہ ہمارے اوپر سے ''تھرڈ ورلڈ کنٹری'' کا لیبل ہٹے، ہمیں پاکستان کو فخر کے قابل بنانا ہوگا۔ ارفع کا یہ بھی کہنا تھا کہ قوم کے مزاج میں محسن کشی کا عنصر نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی پسند

ارفع کریم اپنے بھائیوں کے ساتھ

ناپسند کے بارے میں ارفع نے کہا کہ میں سیاست کو میں بالکل پسند نہیں کرتی۔ مجھے کھیلوں میں باسکٹ بال پسند ہے۔ میں شروع میں سٹی سکول ملتان کی طالبہ تھی۔ میں خواتین کے حقوق کی حامی ہوں، چاہتی ہوں کہ پاکستان کی نصف آبادی کو تعلیمی وتربیتی ماحول ملے تاکہ یہ نئی دنیاؤں تک رسائی حاصل کر سکیں۔ میں نے اپنی ماما اور بابا سے یہ سبق سیکھا کہ جتنی زیادہ بلندی ملے اُتنے ہی زیادہ جھک جاؤ، اسی لیے میں سکول میں اپنے برتری کے احساس کو دبائے رکھتی ہوں۔ اپنی شخصیت کی تعمیر میں والدہ اور والد کے کردار کو الگ الگ بیان کرتے ہوتے ہوئی ارفع نے کہا کہ بابا نے مجھے بڑی باتیں سکھائیں جبکہ ماما بنیادی باتوں پہ زور دیتی ہیں، میں دونوں سے متاثر ہوں۔

ارفع کریم کے والد کرنل کریم بتانے لگے کہ انہوں نے ارفع کے تحقیقی شوق کی حوصلہ افزائی کی اور اگر کسی سٹیشنری کی دکان سے انہوں نے پانچ ہزار تک کی کتابیں خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میں یہ پوری کر

Marfat.com

تا رہا۔ میری نظر میں بچوں کی صلاحیتوں سے استعفادہ حاصل کرنے کا بہترین ذریعے انکے تجسس کو ابھارنا ہے۔ اور پھر معاشرے میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے بعد جو کچھ اللہ نے آپ کو دیا ہے اسکی زکواۃ نکالتے ہوئے انسانیت کی بھلائی کیلئے بھی کام کرنا چاہیے۔ ''آپکے گاؤں کے بچے تو تعلیمی و تربیتی عمل سے دور ہونگے''؟ میں نے دریافت کیا۔ ہمارا گاؤں پاکستان کے صنعتی شہر فیصل آباد سے پندرہ کلومیٹر فاصلے پر واقع ہے لیکن یہاں خاصی پسماندگی آج بھی موجود ہے۔ میرا ابھی تک گاؤں سے بھرپور رشتہ قائم ہے۔ وہاں لڑکیوں کے ایک ہائی سکول کی دیکھ بھال ہم نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ میں نے یہاں کی طالبات کو جدید ٹیکنالوجی سے روشناس کروانے کیلئے وہاں ایک کمپیوٹر لیبارٹری بھی قائم کروائی ہے۔

دھرتی کی اس بیٹی کی دُور تک دیکھتی آنکھوں اور ان میں موجود ایک تصور نے مستقبل میں اسکی کامیابی کی منزل کو اور نزدیک کر دیا ہے، ارفع میں کئی صلاحیتیں بیک وقت دست و گریبان ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس ہونہار بچی کی مرکزی قوت کس جانب جاتی ہے، یہ آنے والا وقت ہی واضح کرے گا۔

Marfat.com

37 سالہ تجربے کا حامل سیاستدان، وکیل، شاعر اور مقرر

پاکستان پیپلز پارٹی کے راہنما بیرسٹر اعتزاز احسن ایک تجربہ کار قانون دان محتاط سیاستدان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دانشور اور شاعر کے طور پر بھی مقبولیت رکھتے ہیں۔ آپکا تعلق مسلم لیگی گھرانے سے ہے، اعتزاز کے دادا چوہدری بہاول بخش 1922ء میں پہلی بار ضلع گجرات سے قانون ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح سے سیاسی طور پر قریب رہے۔ انکے والد چوہدری محمد احسن نے بھی مسلم لیگی ٹکٹ پہ قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا، اسی طرح انکی والدہ محترمہ رشیدہ احسن بھی شعبہ خواتین کی ایک متحرک لیگی رہنماء تھیں۔ اعتزاز احسن 27 ستمبر 1945ء کو مری میں پیدا ہوئے۔ انکے دادا، والد اور والدہ جب 1946ء میں قائداعظم کے حکم پہ دفعہ 144 کی خلاف ورزی پر گرفتار کر کے جیل بھیجے گئے تو اعتزاز احسن (جنکی عمر اسوقت صرف دو سال تھی) اپنی والدہ کی گود میں جیل میں رہے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم ایچی سن کالج سے حاصل کی پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے مکمل کرنے کے بعد انگلستان سے باریٹ لاء کی ڈگری حاصل کی۔ اعتزاز نے سی ایس ایس کے امتحانات میں متحدہ پاکستان میں اوّل پوزیشن حاصل کی مگر سول سروس کے بجائے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ وکالت سے عملی سیاست میں آنا انکی شہرت کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔ انکی سیاست کی ابتدا 37 برس قبل پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پہ صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینے سے ہوئی جب آپ رکن پنجاب اسمبلی بن کر صوبائی اسمبلی میں وزیر اطلاعات بنے۔ اعتزاز احسن وفاقی حکومت میں وزیر داخلہ، وزیر تعلیم اور وزیر قانون کی حیثیت سے بھی فرائض سرانجام دے چکے

اعتزاز احسن اپنے پیشہ وارانہ فرائض کی ادائیگی کے دوران چیف جسٹس پاکستان اور مختاراں مائی کے ساتھ سپریم کورٹ کی طرف جا رہے ہیں

Marfat.com

ہیں۔ انکی نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ اپنی شیریں زبان کے باعث ہر ایک سے عزت لے لیتے ہیں۔ رواں زمانے میں اعتزاز احسن کا شمار پاکستان کے چند اعلیٰ ترین وکلاء میں ہوتا ہے۔ جب پاکستان کی سب سے بڑی عدالت کا قانونی سربراہ جسٹس افتخار محمد چوہدری اپنی عدالت سے انصاف لینے آیا تو اس نے اپنا وکالت نامہ اعتزاز احسن کے سپرد کیا، اعتزاز نے اس صدارتی ریفرنس کے دوران 56 گھنٹے دلائل دیئے اور 19 دن عدالت میں کھڑے رہے، یہ تو ممکن ہی نہیں کہ انہوں نے وکیلانہ دلائل کے دوران شعر نہ سنائے ہوں۔ یہ تو اس کیس میں عدالت کے اندر کی تصویر تھی، سپریم کورٹ کے باہر بھی عجیب منظر تھا ... اگر میں آپ کو اسلام آباد کی شاہراہ دستور پر لے جاؤں جہاں سپریم کورٹ میں چیف جسٹس ریفرنس کی سماعت ہوتی

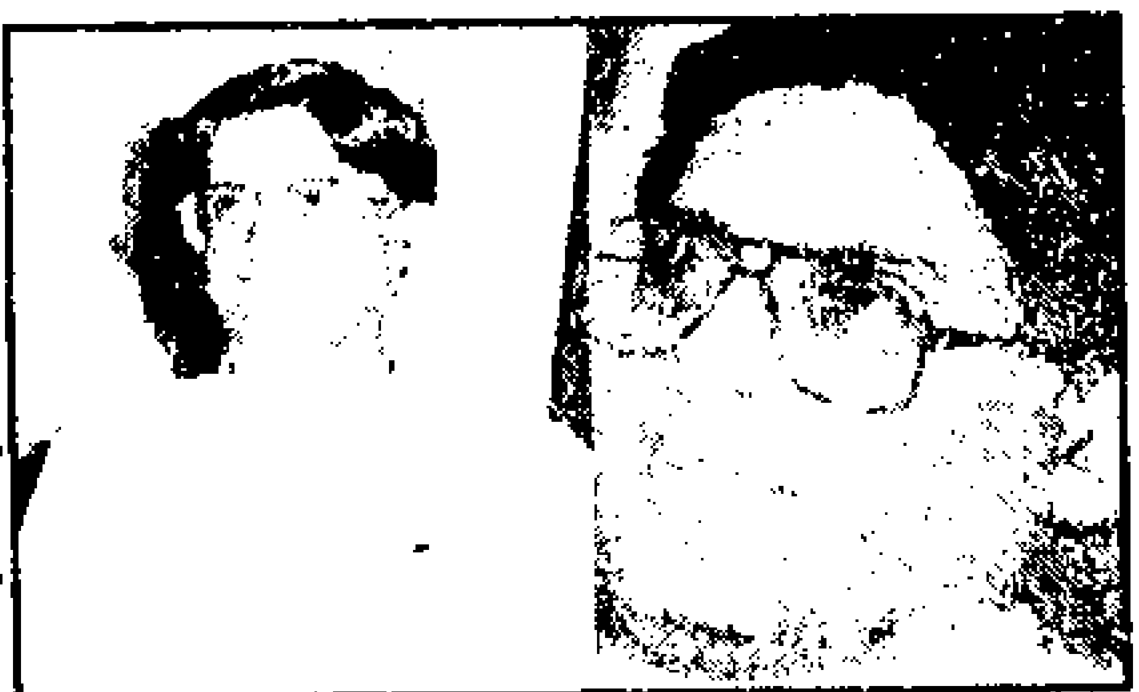

رہی تو وہاں بھی مجھے ہر طرف چیف جسٹس کے متوالوں کا جوش وخروش نظر آیا اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہاں موجود عوامی اکثریت میں احتجاج کی ایک غیر معمولی طاقت پیدا ہوگئی تھی، جب جناب چیف جسٹس باہر آتے تو بزرگ جوان ہر کوئی انکی گاڑی (جو اعتزاز چلا رہے ہوتے) کے قریب آنے کو بے تاب ہوتا اور انہیں انکی رہائشگاہ تک ''عوامی پروٹوکول'' میں نعروں اور تالیوں کی گونج کے ساتھ پہنچایا جاتا۔ اعتزاز احسن نے بھی قانون وانصاف کے حصول کیلئے ترسنے والی قوم کا اپنے منصف سے عقیدت سینکڑوں مناظر دیکھے۔ چیف جسٹس ایشو میں اعتزاز احسن کا تمام سیاسی جماعتوں کا راہنماؤں وکارکنوں کی دلیرانہ تائید وحمایت حاصل رہی۔ ایک ہی وقت میں بہترین خطابت اور شاعری انکی شخصیت کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ آپکی ادبی کتابیں بھی منظر عام پہ آئی جن میں سے ایک ''انڈس ساگا'' کافی مقبول ہوئی۔ مستنصر جاوید اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی شائع کر چکے ہیں۔ کبھی کبھی اعتزاز احسن کی زبان سے ایسے فقرے نکل جاتے ہیں جو انکے ''سیاسی حریفوں'' کے قلب میں تیر کی طرح پیوست ہو جاتے ہیں مگر کم ہی ایسا ہوا ہے کہ کسی نے بدمزگی کا اظہار کیا ہو۔ چند برس قبل منعقدہ ''ورلڈ لائرز رینکنگ'' میں 7ویں نمبر پر آئے، ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے بانی نائب صدر رہے۔ انہوں نے جنرل ضیاء کے دور میں جیل بھی دیکھی۔ ذاتی زندگی سے متعلق ان کا کہنا تھا کہ دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کے باپ ہوں، خوب گزر رہی ہے۔

Marfat.com

کامیابی کے لیئے بیساکھیوں کا سہارا نہ لینے والا سواتی

زندگی کی خوشیاں بعض لوگوں کی جھولی میں خود آگرتی ہیں اور چند اِنکے حصول کیلئے ایک طویل جدوجہد کرتے ہیں، اعظم خان سواتی بھی انہی چند میں سے ہیں..... اگر انکی سوانح حیات اور انہیں ماضی کے آئینے میں انہیں دیکھا جائے تو حیرت انگیز شبیہ ابھرتی ہے۔ مانسہرہ کے علاقے ''شجر بالا'' میں جب ننھا اعظم پیدا ہوا تو کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ اس وجود کو خدا نے کیسی نادر صلاحیتوں سے نواز رکھا ہے۔ جب اسکا قد کاٹھ نکلا، شعور بیدار ہوا تو اس جوان نے کاروبار شروع کرنے کا فیصلہ کیا، اسکا کاروبار چمک اُٹھا، اعظم خان کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ انہیں اپنی زندگی کے غیر ہموار سفر میں جھٹکے تو لگے لیکن اپنی کامیابی کیلئے بھرپور ذہنی وجسمانی کام کرتے رہے۔ تیسری دنیا کے تعارف کو انہوں نے شرمندگی کا سبب نہیں سمجھا بلکہ اپنی ذاتی جدوجہد سے وہ معاشی مقام حاصل کیا جسے آج بہت سے گورے بھی حیرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بے مثال کاروباری کامیابی کے ساتھ ساتھ ہزارہ کے کوہساروں سے اسلام آباد کے روشن ایوانوں تک کمال ذہانت سے سفر طے کیا۔

اعظم خان سواتی سلسلہ ہمالیہ کے کے ایک پہاڑ ''شجر بالا'' میں پیدا ہوئے۔ یعنی پہلے پہاڑوں کی چٹانوں پہ بسیرہ کر کہ نکلے اور اسکے بعد بھرپور کاروبار کیا اور پھر اقتدار کے ایوانوں کا بھی پھیرا لگایا۔ گورنمنٹ ہائی سکول اُوگی سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ ایف اے گورنمنٹ کالج مانسہرہ سے مکمل کیا، بی اے کا امتحان پوسٹ گریجویٹ ایبٹ آباد سے پاس کیا اور یہیں سے معاشیات میں ماسٹرز مکمل کیا۔ اعظم نے سیاست کا آغاز تو زمانہ طالبعلمی سے ہی کر دیا تھا لیکن عملی سیاست میں وہ کئی سیاستدانوں کے برعکس معاشی طور پر مستحکم ہوکر کوچہ سیاست میں اُترے۔ لیکن یہ انکی خوبی ہے کہ انہوں نے ابھی بھی ان پہاڑوں سے رشتہ نہیں توڑا۔ انہوں نے نہ صرف ذاتی محنت سے معاشی اعتبار سے خاصی

اعظم سواتی حسان علی عباسی سے گفتگو کر رہے ہیں

Marfat.com

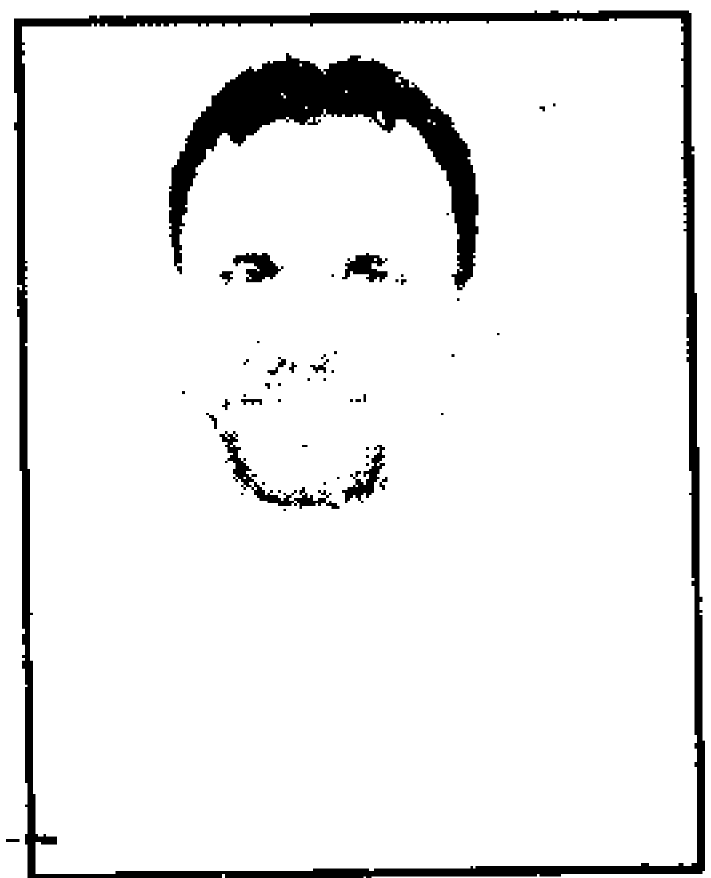

کامیابی حاصل کی بلکہ وہ تعلیمی میدان میں بھی پیچھے نہیں رہے۔خان نے ایم اے معاشیات کے بعد سندھ یونیورسٹی کراچی سے پولیٹکل سائنس میں بھی ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ایل ایل بی میں سندھ مسلم لاء کالج سے گولڈ میڈل حاصل کیا اور اسکے بعد بھی تعلیمی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے یونیورسٹی آف ہاسٹن امریکہ سے ایل ایل ایم مکمل کیا۔اپنے انتھک محنت کے بھروسے پر انہوں نے چند ہی سالوں میں ہاوس ٹن میں اپنے سٹوروں کی ایک زنجیر بنالی۔

انکا پہلا کاروباری تجربہ محمود آباد کراچی میں تھا، یہاں کوئی غیر معمولی کامیابی نہیں ملی،تو اس نے تلخ حالات کا تھپٹر کھا کر فیصلہ کیا کہ وہ پاکستان میں اب کاروبار نہیں کرے گا بلکہ دیارِ غیر جا کر کچھ بن دکھائے گا پھر 1978ء میں چند اُدھورے خوابوں کیساتھ سٹوڈنٹ ویزا پر امریکہ کیلئے روانہ ہونے والا یہی اعظم خان شبانہ روز محنت سے اپنے ''پاکستانی خوابوں'' میں جذبوں کی توانائی سے رنگ بھر دیتا ہے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو استعمال کر کے چند ہی سالوں میں ناقابل یقین کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔

اعظم نے مانسہرہ کی زرخیز دھرتی سے اُٹھ کر کاروباری لحاظ سے ملک بھر اور دنیا کے کئی حصوں میں تو شہرت حاصل کی لیکن اب بھی ان کی زندگی میں دیہات کے مخصوص طرز حیات کا گہرا اثر موجود ہے۔کسی معاشرے کے ایک فرد کیلئے اپنا آبائی وطن چھوڑ کر دیارِ غیر میں کامیاب کاروباری آدمی بننا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔لیکن پسماندہ پس منظر کے باوجود وہ نہ صرف پاکستان ایوان بالا کے ممبر منتخب ہوئے بلکہ امریکی معاشرے میں ایک نمایاں کاروباری آدمی کی شناخت رکھتے ہیں۔پاکستانی الیکشن کمیشن میں ظاہر کیے گئے اعظم خان سواتی کے اثاثوں کے گوشوارے انہیں امیر ترین پارلیمنٹرین ثابت کرتے ہیں۔انکو صرف پیٹرولیم مصنوعات کے کاروبار سے سولہ ملین ڈالر آمدنی مل رہی ہے۔اُن کی اہلیہ طاہرہ سواتی اور اعظم خان کے 1.6 بلین کے اثاثے پاکستان اور امریکہ میں موجود ہیں۔اعظم سواتی نے اپنے آپ کو اس قابل بنادیا کہ امریکن پاکستانی ان پر فخر کریں۔ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ بزنس مین اور اپنے فلسفانہ ذوق کی بدولت انہوں نے کاروباری دنیا میں مختلف ایوارڈز بھی حاصل کیے۔وہ اس حوالے سے منفرد کاروباری آدمی تھے جنہوں نے قانون کی تعلیم کے دنوں میں ہی ملین کے حساب سے کاروبار کو چلایا۔

اعظم خان سواتی امریکن معاشرے میں بھی ایک قابل احترام کاروباری آدمی اور اچھے منتظم کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔متاثرین زلزلہ کی بحالی اور تعمیر نو میں انہوں نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا،سینٹ کے

Marfat.com

پلیٹ فارم سے بزنس ٹیکسوں کی کمی کے حوالے سے بھی انکا کردار نا قابل فراموش ہے۔انہوں نے اپنی سیاسی زندگی میں جنرل مشرف کے برسراقتدار آنے کے بعد صدارتی ریفرنڈم میں تو جنرل پرویز مشرف کی بھرپور حمایت کی مگر وہ اب ''غیر جمہوری'' حکمرانوں کے خلاف اعلان جنگ کرتے نظر آرہے ہیں۔پاکستانی سینٹ میں وہ دو مرتبہ ممبر منتخب ہوئے اور اس سے قبل ضلعی ناظم مانسہرہ کی حثیت سے بھی کام کر چکے ہیں۔اعظم خان صرف اپنے لیے پیسہ بنانے میں ہی مشغول نہیں رہے بلکہ انہوں نے مستحق لوگوں کو بھی روزگار پہ لگا کرانہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کیا اور بے شمار مساجد تعمیر کروائیں۔

اعظم خان سواتی ابھی قانون کی تعلیم حاصل ہی کر رہے تھے کہ انکا کاروبار کئی ملین روپوں میں پھیل چکا تھا۔اپنی سیاست کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ میں اس وادی میں ایک محتاط اجنبی کی طرح آیا۔یہاں میں نے سب کی عزت کی اور سب نے مجھے عزت دی۔

Marfat.com

''قریشی دواخانہ'' کا تصور علامہ اقبال نے دیا تھا'' اقبال قریشی

حکمت کے پیشہ میں دواخانوں کا جھال بچھانے والا ''قریشی گروپ'' آج ایک طبی تحریک کا روپ دھار چکا ہے۔ حکیم محمد حسن قریشی نے ''قریشی مطب'' سے اس سلسلے کا آغاز کیا اور اب اِسکے کے روئے رواں اقبال احمد قریشی ہیں جن پر جب شہرت اور دولت کی دیوی مہربان ہوئی تو انہوں نے خوب سے خوب کی جستجو جاری رکھی، اور اپنے والد کے مطب کو ''قریشی گروپ'' میں بدل دیا۔ آیئے انکی کہانی بھی انہی سے سنتے ہیں۔ میں نے 68ء میں کیمیکل انجینئرنگ میں ایم ایس سی مکمل کی۔ میرے والد شفا الملک حکیم محمد حسن قریشی میدان حکمت کا ایک بڑا نام تھے۔ برصغیر پاک و ہند کی بہت اہم شخصیات کا علاج انہوں نے کیا۔ شاعر مشرق علامہ محمد اقبال انکے قریبی دوستوں میں سے تھے اور ''قریشی'' مطب کا تصور بھی انہی نے دِیا تھا۔ والد صاحب جب لاہور کی بیڈن روڈ پہ قریشی مطب کے نام سے کاروبار چلا رہے تھے تو تب علامہ اقبال صاحب نے میرے والد کو کہا کہ آپ کے معیار کی ادویات بازار میں دستیاب نہیں، اس لیے آپ قریشی دواخانے کو پورے برصغیر میں متعارف کروائیں، مصور پاکستان کے اس تصور نے میرے والد کی کاروباری سوچ وسیع کی پھر انہوں نے حکمت کا ایک وسیع نیٹ ورک قائمکر نے کی کوششوں کا آغاز کیا۔ طبی خدمات کے اعتراف میں انہیں ''شفاء الملک'' کا خطاب دیا گیا۔ میں جو آج لوگوں کو نظر آ رہا ہوں یہ دراصل میرے والد کی مسلسل محنت اور جدوجہد کا پھل ہے، انکے پاس بیٹھ کر ہی حکمت کا قاعدہ پڑھا۔ والد صاحب بھی مجھے حکمت کی جانب لانا چاہتے تھے اور یہ میرا بھی شوق تھا۔ جب ایم ایس سی سے فارغ ہوا تو والد صاحب کے قریشی مطب کو میں نے قریشی دواخانہ بناتے ہوئے سچے جذبے اور یقین کی قوت کے ساتھ ایک بڑی رقم موجود نہ ہونے کے باوجود میں مایوس نہیں ہوا۔ جب اس جانب قدم رکھا تو اس شعبہ میں میرا پہلا سال ہی میں ایک غیر متوقع تبدیلی ملی، یوں کہہ لیجئے کہ ہر طرف دھوم سی مچ گئی اور خواب تعبیر کا رنگ اختیار کرنے لگے۔ ''قریشی انڈسٹریز لمیٹڈ'' کے آغاز سے متعلق وہ بتاتے ہیں کہ جب یہ سفر شروع کیا تو اکیلا تھا، ادویات کی تیاری سے لے کر، پرنٹنگ اور پھر پیکنگ کے تمام مراحل مجھے اکیلے ہی نمٹانے پڑتے۔ یہ دور میرے لیے کافی مشکل تھا کبھی رقم کی کمی پریشانی کی تاریکیوں میں دھکیل دیتیں۔ مجھے زیرو سے کاربار شروع کرنا پڑا، اور اب یہ اس قدر پھیل چکا ہے

Marfat.com

کہ میں سکون قلب محسوس کرنے لگا ہوں۔شروع میں ہم لاہور کی اپنی فیکٹری میں تمام پرڈوکس تیار کرتے پھر ہم نے اس دوخانے کی آمدن سے حطار انڈسٹریل اسٹیٹ ہری پور میں جگہ خرید لی، اِس طرح 88ء میں قرشی دولخانہ "قرشی انڈسٹریز لمیٹڈ" بن گیا۔ یہاں ہم نے ادویات بنانے کے جدید پلانٹ لگا رکھے ہیں۔ چند ہی سالوں میں ہماری مصنوعات گاؤں گاؤں شہر شہر پھیل گئی۔ ہمارا گروپ سب پروڈکس مکمل تحقیق کے بعد عوام میں لاتا ہے۔ میں نے قدرتی طبی ذریعے علاج کو فروغ دینے اور جدید سائنسی اُصولوں کے ذریعے ادویات تیار کرنے کی عمر بھر جدوجہد کی ہے تاکہ لوگوں کو بیماریوں اور جسمانی تکالیف سے نجات مل سکے۔ایک سوال پراُن کا کہنا تھا کہ میں نے حکمت کو تجارت ضرور بنایا مگر اسکا مقصد کسی صورت ذاتی منفعت نہیں تھا، میرا مقصد ستائش وصلہ کی تمناء سے بلند ہو کر انسانوں کے درد کا مداوا کرنا رہا۔قدرت نے جڑی بوٹیوں میں بڑے قیمتی خزانے رکھے ہیں میں انہیں استعمال میں لا کر لوگوں کو سستا علاج پہنچانا چاہتا ہوں۔

Marfat.com

افتخار عارف ”تم بھی ٹوٹ جاؤ گے“

ہم خود تراشتے ہیں منازل کے سنگِ میل
ہم وہ نہیں جنہیں زمانہ بنا گیا ہو

یہ شعر افتخار عارف کی شخصیت کی منہ بولتی تصویر اور اسے انکی سوانح حیات بھی کہا جا سکتا ہے.....افتخار ایسے شخص ہیں جنکا نام انکے اوصاف کو ٹھیک ثابت کر رہا ہے۔اعلیٰ پائے کی ذہانتوں کا وہ اجتماع کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتا جو افتخار عارف میں موجود ہے۔آپ اُن لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں جو عروج کے پہاڑ پر بیٹھ کر بھی مٹی سے اپنا رشتہ نہیں توڑتے۔21 مارچ 1943ء کو لکھنو میں پیدا ہوئے۔اصل نام افتخار حسین اور ”عارف“ تخلص ہے،ادبی میدان میں نمایاں خدمات کے عوض افتخار عارف ”ہلال امتیاز“،”ستارہ امتیاز“،”صدارتی تمغۂ حسن کارکردگی“،”نقوش ایوارڈ“،”بابائے اُردو مولوی عبدالحق ایوارڈ“،”فیض انٹرنیشنل ایوارڈ“،”ڈاکٹر اقبال ایوارڈ“اور ”ساحر لودھیانوی ایوارڈ“ کے علاوہ کئی دیگر منفرد اعزازات حاصل کر چکے ہیں۔وہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کے مینجنگ ڈائریکٹر کے عہدے پر بھی فائز رہے،پانچ سال مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین کی حثیت سے بھی کام کیا اور پاکستان کے سب سے بڑے سرکاری ادبی ادارے اکادمی ادبیات آف پاکستان کی اہم ترین ذمہ داری بھی نبھا رہے ہیں۔ہماری عمر کے لوگوں کو انکے ٹیلی ویژن پروگرام ”کسوٹی“ سے شناسائی تو نہیں لیکن کہتے ہیں کہ یہ پروگرام بہت خوب ہوا کرتا تھا،ہم تو افتخار عارف کو انکی شاعری اور ذات کے حوالے سے جانتے ہیں۔بھرے زمانے کے اس تنہا شخص کو ملنے اور اس شخصیت کی عمارت میں جھانک کر دیکھنے کیلئے میں اپنے دوست بلال ڈار کے ہمراہ جب پارک ٹاورز میں واقع انکی رہائش گاہ پہنچا تو کتابوں میں گھرے افتخار عارف نے روایتی مسکراہٹوں سے استقبال کیا۔ایسے لگا کہ محبت کا بھوکا یہ شخص ہر کسی سے پیار کرتا ہے۔

افتخار عارف بتاتے ہیں کہ وہ پرانے لکھنو میں جو اسوقت تہذیبی اعتبار سے مسلم شناخت کا حامل شہر تھا کے ایک عام سے گھر میں پیدا ہوئے۔آغاز سفر سے متعلق اُنہوں نے کہا کہ میں نے ابتدائی تعلیم ایک دینی مدرسے نظامیہ فرنگی محل سے حاصل کی پھر عام تعلیم جوبلی کالج اور لکھنو کرسچن کالج سے ہوئی لکھنو یونیورسٹی سے بی اے اور پھر ایم اے مکمل کیا۔میری زندگی میں بچپن ہی سے کتاب کو مرکزی حثیت حاصل ہو گئی تھی،بچپن میں سب بچوں کی طرح کھیل کود میں بھی لگا رہتا مگر لکھنے پڑھنے اور خاص طور پر تاریخ اور

Marfat.com

شاعری پڑھنے کا بہت شوق تھا، خلفائے راشدین کے عہد کی تاریخ، بنوامیہ اور بنو عباس کے زمانے کی تاریخیں اور مسلمانانِ برصغیر کے مختلف ادوار کی تاریخیں یہ سب بڑے شوق سے پڑھتا۔ میرا آغاز مشکل کافی مشکل رہا اس لیے کہ میں ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ میرے سوتیلے نانا جو مزدور پیشہ آدمی تھے نے میری پرورش کی۔ میرے نانا ایک بازار جس میں پرانی کتابیں ردی میں بکتی تھیں وہاں سے میرے لیئے تاریخ اور شاعری کی کتابیں لایا کرتے تھے۔ ہمارے گھر میں بجلی نہیں تھی ہم لالٹین کی روشنی میں پڑھتے، ہم روزانہ ایک بوتل مٹی کا تیل خرید کر لاتے جو بارہ ساڑھے بارہ بجے ختم ہو جاتا۔ جب رات کے گہرے اندھیروں میں اسمیں سے تیل ختم ہو جاتا تو میری نیند غائب ہو جاتی اور میں کافی دیر تک پہلے پڑھا سبق دُہرانے لگتا۔ 1965ء میں پاکستان آیا، یہاں میں درس وتدریس کے شعبے سے منسلک ہونا چاہتا تھا مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ لکھنا پڑھنا میری زندگی کا محبوب مشغلہ تھا یہی شوق ہم ہندوستان سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہاں تک کہ میں نے انٹرمیڈیٹ کالجز میں بھی ملازمت حاصل کرنے کی بھرپور کوششیں کیں مگر کامیابی نہیں ملی۔ ایسے میں میرے ایک بزرگ دوست تھے یاور مہدی صاحب انہوں نے مجھے ریڈیو پاکستان میں متعارف کروایا، پھر میں ٹی وی پہ آ گیا۔ مجھے شہرت کی نعمت اوائل حیات میں ہی مل گئی تھی جب میرا پروگرام ''کسوٹی'' چلتا تھا، آج میری عمر 64 سال ہو چکی ہے اور پھر بھی لوگ میری جوانی کے زمانے کے ٹی وی ناظرین اگر مجھے راہ چلتے دیکھ لیں تو کہتے ہیں کہ آپ کا پروگرام کسوٹی ہمیں بہت یاد آتا ہے۔ میری کتابیں ''مہر دو نیم'' اور ''شہر علم کے دروازے پر'' نے بھی بہت شہرت پائی اور یہ میری وجہ شہرت بنی۔ میں اس بات پہ یقین رکھتا ہوں کہ تقدیر اور توفیق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے بہت محنت کی مگر مجھے جو کچھ ملا یہ سب پاکستان کے صدقے ہے۔ 1968ء میں میری شادی ہوئی، ایک بیٹی ہے گیتی اور بیٹا علی ہے۔ شادی اور پاکستان ٹیلی ویژن پر پروگرام ''کسوٹی'' کرنے کے بعد 1970ء میں برطانیہ جانا پڑا جہاں آغا حسن عابدی صاحب کے ادارے (بی سی آئی) سے وابستہ ہوا، اس ادارے میں میرے باس الطاف گوہر صاحب تھے جن کے پاس اسوقت تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن کی سیکرٹری جنرل شپ تھی۔ 1991ء میں واپس وطن آ گیا۔ تب سے یہاں مختلف ذمہ داریاں سرانجام دے رہا ہوں۔

افتخار عارف کا عہد شباب

ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ شاعری اور فن کی زندگی کے فارمولے نہیں ہوتے

Marfat.com

مگر اسمیں جن باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے ان میں جذبہ کا عنصر، احساس کا عنصر، فکر اور خیالات کا عنصر قابل ذکر ہیں۔ افتخار کہتے ہیں کہ بے شک ہمارے معاشرے میں شاعری کی بنیاد پر زندگی گزارنا مشکل ہے لیکن اگر میں شاعر نہ ہوتا تب بھی شاعری کرتا۔ غالب نے ایک بار کسی کو خط میں لکھا تھا کہ جو آدمی کا شوق ہو اگر وہی اسکا وسیلہ رزق ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہوتی اس معاملے میں، اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے جو وسائل درکار تھے وہ خداوند تعالیٰ نے میرے شوق ہی میں رکھے۔ یہ خدا کا شکر ہے کہ جہاں بھی گیا مجھے بیگانگی کا کبھی احساس نہیں ہوا، لوگ محبت سے ملتے ہیں۔ میں ادب میں تنقید اور شاعری پڑھتا ہوں، دنیا کی بڑی بڑی شخصیات کی سوانح پڑھنے میں بھی مجھے بہت لطف آتا ہے، خاص طور پر وہ لوگ جو دنیا میں کسی تبدیل کا باعث بنے ہوں انکی سوانح بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔

افتخار عارف کا کہنا ہے کہ اگر میں کہوں کہ میں آلودہ نہیں ہوا تو ایسا نہیں ہے، آسودگی میں کہیں کہیں آلودگی بھی آجاتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمیں اپنے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں۔ گزشتہ کئی برسوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ اگر مزید دس پانچ برس یہ چیزیں دلوں اور ذہنوں میں سلامت رہیں تو سمجھیں گے کہ بڑا کام ہوا۔

پھر ایف ٹین کے سناٹوں میں افتخار عارف نے اپنی مشہور نظم ''بارہواں کھلاڑی'' ہمیں سنائی آپ بھی پڑھ لیجئے!

خوشگوار موسم میں
ان گنت تماشائی
اپنی اپنی ٹیموں کو
داد دینے آتے ہیں
اپنے اپنے پیاروں کا
حوصلہ بڑھاتے ہیں

Marfat.com

میں الگ تھلگ سب سے
بارہویں کھلاڑی کو
ہوٹ کرتا رہتا ہوں
بارہواں کھلاڑی بھی
کیا عجب کھلاڑی ہے
کھیل ہوتا رہتا ہے
شور مچتا رہتا ہے
داد پڑتی رہتی ہے
اور وہ الگ سب سے
انتظار کرتا ہے
ایک ایسی ساعت کا
ایک ایسے لمحے کا
جسمیں سانحہ ہو جائے
پھر وہ کھیلنے نکلے
تالیوں کی جھرمٹ میں
ایک جملۂ خوش کن
ایک نعرۂ تحسین
اس کے نام ہو جائے
سب کھلاڑیوں کے ساتھ
وہ بھی معتبر ہو جائے
پر یہ کم ہی ہوتا ہے
پھر بھی لوگ کہتے ہیں
کھیل سے کھلاڑی کا
عمر بھر کا رشتہ ہے

Marfat.com

چھوٹ بھی تو سکتا ہے
آخری وصل کے ساتھ
ڈوب جانے والا دِل
ٹوٹ بھی تو سکتا ہے
تم بھی افتخار عارف
بارہویں کھلاڑی ہو
انتظار کرتے ہو
ایک ایسے لمحے کا
ایک ایسی ساعت کا
جسمیں حادثہ ہو جائے
جسمیں سانحہ ہو جائے
تم بھی افتخار عارف
تم بھی ڈوب جاؤ گے
تم بھی ٹوٹ جاؤ گے"

دوران ملاقات جب وہ نظریں اوپر اُٹھاتے تو ان میں علم وادب کی عجیب وغریب چمک ہماری نگائیں نیچے کو جھکا دتیں۔ اِنکی نظروں سے تو ابھی شفقت برسنا بند نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ہمارے تجسس کی پیاس بجھی مگر یہ سوچ کر گھر لوٹ آئے کہ سارا حُسن تو اظہار میں نہیں ہوتا کچھ ان کہی باتیں اور بن بتائے جذبے بھی خوبصورت ہوتے ہیں۔

Marfat.com

ایک جاندار پھول جو کراچی کے ساحلوں پہ کھلا!

انصار برنی کا نام دنیا کی کئی کونوں میں خدمت خلق کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں، سٹوڈنٹ لائف سے ہی وہ جمہوری اور انسانی حقوق کے حصول کی فعال جدوجہد کر رہے ہیں۔ 1977ء میں حکومت کے خلاف ''ناپسندیدہ سچ'' کہنے پر اس نے دوسال تک جیل کی کال کوٹھری میں خود آزادی سے محرومی دیکھی تو 1980ء میں قیدیوں کی فلاح و بہبود کیلئے ''انصار برنی ویلفیئر ٹرسٹ'' قائم کیا جو آج پاکستان میں انسانی حقوق پر کام کرنے والے فلاحی اداروں کی پہلی صف میں شمار ہوتا ہے۔ برنی کی کاوشوں سے قانونی امداد سے محروم ہزاروں بے گناہ قیدی جیلوں سے رہائی پا کر معاشرے میں ایک باوقار زندگی گزار رہے ہیں۔

انصار برنی ایڈووکیٹ 14 اگست 1956ء کو کراچی میں پیدا ہوئے، انکے والد سید مختار احمد برنی کسٹم آفیسر تھے جبکہ والدہ شہناز بیگم سماجی کارکن تھیں۔ انصار برنی نے نویں کلاس تک تعلیم گرینڈ فاکس انگلش اسکول مسلم آباد سے حاصل کی جبکہ میٹرک گرین لینڈ انگلش اسکول ناظم آباد سے کیا یہیں ان کی ملاقات شاہین نذیر سے ہوئی جواب شاہین برنی ہیں۔ انصار برنی نے انٹر اور بی اے اسلامیہ کالج سے کیا بعدازاں ایل ایل بی بھی یہاں ہی سے ہی کیا پھر ایم اے کراچی یونیورسٹی سے اور سری لنکا سے پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری حاصل کی۔ 28 مئی 1981 میں انصار برنی گجرات کی ایک لڑکی شاہین کے ساتھ رشتہ ازدواج میں بندھ جانے کا وہ زبردست ''دھاکہ'' کیا جسکی حدود کراچی سے پنجاب کے علاقے گجرات تک تھی۔ ان کے تین بچے فہد برنی، راحیل برنی اور ثناء برنی ہیں۔ انصار برنی ایڈووکیٹ دنیا بھر سے دوسو سے زائد اعزازات حاصل کر چکے ہیں ان میں متعدد مین آف دی ایئر، ٹاپ آؤٹ اسٹینڈنگ ینگ پرسن آف دی ورلڈ، پال ہیرس فیلوشپ ایوارڈ اور پاکستان میں انسانی حقوق کے شعبہ میں پہلی مرتبہ قومی اعزاز ستارہ امتیاز بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ملک میں انسانی حقوق کے شعبہ میں اگر پہلی مرتبہ اعزاز دیا گیا تو اس شعبہ میں پہلا اعزاز حاصل کرنے والے انصار برنی ہی ٹھہرے جنہیں 2002 میں پاکستانی صدر جنرل پرویز مشرف نے قومی اعزاز ستارہ امتیاز سے نوازا۔ انسانی حقوق کے شعبہ میں عالمی خدمات کے اعتراف کے طور پر امریکہ کی حکومت کی جانب سے امریکن اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے انصار ایڈووکیٹ کو

Marfat.com

انصار برنی سابق صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق سے مصافحہ کر رہے ہیں

انسانی حقوق کے شعبہ میں سال 2005ء کے بین الاقوامی ہیرو کے اعزاز سے نوازا۔ انصار برنی نے خلیجی اور عرب ممالک سے ہزاروں معصوم بچوں کو جبری مشقت اور نجی جیلوں سے رہائی دلائی اور معصوم بچوں کے اونٹ ریس میں استعمال پر پابندی لگوادی اور اس طرح ایک پاکستانی نے اپنی انتھک محنت اور جدوجہد سے عرب اور خلیجی ممالک میں انسانی حقوق کی تاریخ بدل دی۔ انصار برنی ایڈووکیٹ کی کاوشوں سے دنیا بھر سے کئی لاکھ بے گناہ قیدی رہائی حاصل کر چکے ہیں، کئی لاکھ اغوا شدہ اور گم شدہ بچے اپنے گھروں تک پہنچ چکے ہیں، ہزاروں صحت مند افراد جنہیں دشمنی کی بنیادوں پر ان کے رشتہ داروں نے پہلے جیلوں اور پھر پاگل خانوں تک پہنچا دیا تھا انہیں رہائی دلا کر معاشرے میں بحال کرایا۔

☆ آپ جشن آزادی کے دن پیدا ہوئے، بچپن کیسا گزرا، بچپن کی کوئی سبق آموز یاد؟

مجھے خوشی ہے کہ میں ایک ایسے دن پیدا ہوا جب پاکستان میں جشن آزادی کی خوشیاں منائی جارہی تھیں۔ اس لحاظ سے میرا پیدائش کا ستارہ اسد ہے جس کا نشان شیر ہے اور ظاہر ہے کہ شیر جنگل کا بادشاہ ہے اور شیر کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مردار نہیں کھاتا اور میں سمجھتا ہوں کہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔ میرا بچپن بہت شرارتی تھا لیکن بدتمیز ہرگز نہیں، بہت شرارتیں کرتا تھا اسلئے پٹائی بھی بہت ہوتی تھی۔ بچپن میں ہی متعدد بار خواب میں حضرت محمد ﷺ کی بشارت کا اعزاز حاصل رہا اور ان بشارتوں نے میری زندگی کو برائی سے بچائے رکھا اور ہمیشہ نیکی کی جانب مجھے مائل رکھا۔ میں اس لحاظ سے انتہائی خوش نصیب ہوں کہ مجھے متعدد مواقعوں پر حضرت محمد ﷺ کی بشارت کا شرف حاصل رہا۔ ایک مرتبہ تو آپ ﷺ مجھے اپنے قریب بٹھا کر میرے کاندھوں پر اپنا ہاتھ مبارک رکھ دیا اور آج تک مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہی ہاتھ مبارک میری قدم قدم پر راہنمائی فرماتا چلا آرہا ہے۔

☆ زندگی کا کوئی ناقابل فراموش لمحہ؟

دو واقعات ایسے ہیں جنہیں میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا ایک جب میں مدینہ منورہ میں تھا ان دنوں مسجد نبوی ﷺ میں توسیع ہو رہی تھی تو جو عرب کمپنی توسیع کا کام کر رہی تھی اس کے ڈائریکٹر کو معلوم ہوا کہ میں ان دنوں مدینہ منورہ آیا ہوا ہوں تو اس نے مجھے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا، ہماری ملاقات ہوئی تو مجھے اس

Marfat.com

صدر جنرل پرویز مشرف انصار برنی کو "ستارہ امتیاز" سے نوازتے ہوئے

نے بتایا کہ وہ میرے لئے کچھ کرنا چاہتا ہے۔ میرے ذہن میں آیا کہ کہیں یہ نہ سمجھے کے پاکستان سے آنے والے صرف امداد ہی مانگتے ہیں تو میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کوئی امداد لینے سے انکار کر دیا وہ بہت حیران ہوا کہ ایک پاکستانی ادارے کا سربراہ امداد لینے سے انکار کر رہا ہے۔ لیکن اس کو معلوم نہیں تھا کہ جو امداد میں مانگنے جا رہا ہوں وہ میرے لئے دنیا کی سب سے بڑی امداد ہو گی میں نے اسے فوری کہا کہ اگر وہ مجھے مسجد نبویؐ میں اینٹ لگانے کی اجازت دے دے تو اس سے بڑا میرے لئے کوئی اور تحفہ نہیں ہو سکتا میرا یہ کہنا تھا کہ اس نے مجھے فوری اجازت دے دی میں ان کے ساتھ مسجد نبویؐ کے اوپر پہنچ گیا تو انہوں نے کہا کہ ابھی مزدور نہیں ہیں آپ ایک کیل لگا دیں میں نے سوچا کیل تو نکل جائیگی ویسے بھی اینٹ لگانے کا اپنا مزا ہے میرے درخواست پر اس نے کہا اچھا ٹھیک ہے آپ دو گھنٹے بعد آ جائیں میں بھاگا ہوا مسجد نبویؐ کے اندر گیا اور ہاتھ جوڑ کر نبیؐ کے پاہوں مبارک کی جانب باادب کھڑا ہو گیا کہ نبیؐ کے در سے مجھے کیا حسین تحفہ ملنے جا رہا ہے مجھے نہیں معلوم کتنی ہی دیر میرے آنسو جاری رہے اور مجھ سے نبیؐ کا شکر ادا نہیں کیا جا رہا تھا کہ اللہ پاک کے فضل و کرم سے مجھے کس اعزاز سے نوازا جا رہا ہے۔ مجھے لگا دو گھنٹے اسی شکر کی ادائیگی میں گزر گئے دو گھنٹے بعد میں نے اپنے آنسو صاف کیئے اور پلٹ کر دیکھا تو مجھے اپنے ایک دوست پر نظر پڑی میں نے سعید قریشی کو بتایا کہ میں گنبد خضرا کے قریب دیوار میں اینٹ لگانے جا رہا ہوں کیا اس نے اس نیک کام میں حصہ لینا ہے تو فرط جذبات سے اس کی آنکھیں بھی پرنم ہو گئیں اور ہم دونوں اس عرب کے کمرے میں پہنچ گئے اس نے فوٹو گرافر بلایا ہوا تھا اور میں نے اپنے ہاتھوں سے ایک اینٹ اٹھائی اور اسے دیوار میں لگایا تو اس موقع پر موجود انجینیر نے کہا کہ اینٹ بلکل سہی لگی ہے آپ سیمنٹ کا گارا ڈال دیجیے اور وہ لمحہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ دوسرا واقعہ مکہ کا ہے جب مین اپنی اہلیہ شاہین، ایک دوست لیاقت حسین اور ان کی اہلیہ روبینہ کے ساتھ عمرے ادائیگی کے لئے گیا ہوا تھا صبح فجر پڑھکر آ کر سو گیا تو میرے ایک دوست کا فون آیا کہ حرم شریف میں کام ہو رہا ہے اور جس مقام پر کام ہو رہا ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں سے نبیؐ معراج پر تشریف لے گئے تھے اگر اس مقام پر کام میں حصہ لینا ہے تو جلدی سے آ جاؤ میں فوری اٹھا اور جلدی سے وضو کر کے لیاقت کے کمرے میں گیا ان کو سوتے سے اٹھایا اور ہم حرم میں پہنچ گئے، میرا دوست میرا انتظار کر

Marfat.com

اس شخص کے ہاتھوں کا ہنر یادر ہے گا

رہا تھا ہم اس کے ساتھ اس مقام پر گئے اور کام میں حصہ لیا اور اس موقعہ پر بھی مجھے اعزاز ملا کہ میں نے وہاں بھی کئی اینٹیں لگائیں اور یہ زندگی کے ایسے قیمتی لمحات ہیں جنہیں میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

☆ قید میں گزرے ایام کا کوئی فکرانگیز واقعہ؟

میں ایک طالب علم راہنما تھا 1977 میں جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگا دیا جس کی میں نے بھرپور مذمت کی اور جمہوریت کی بحالی کے لئے جدوجہد شروع کردی۔ صدر ضیاء الحق مجھ سے خوش نہیں تھے اور مجھے گرفتار کرالیا گیا، مارشل لا کی مخالفت کے جرم میں مجھے آٹھ ماہ کی سزا سنادی گئی، آٹھ ماہ بعد رہائی ہوئی تو دوبارہ گرفتار کرلیا گیا اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک دن میں سینٹرل جیل میں ایک بہت پرانے درخت کے نیچے بیٹھا تھا جو ایک اندازے کے مطابق کئی سو سال پرانا ہے، میں نا جانے کن سوچوں میں گم تھا کہ اچانک میں نے اپنے سامنے ایک پرنور چہرہ بزرگ کو کھڑے دیکھا انتہائی پرنور چہرہ لمبی اور سفید داڑھی نور کا عالم یہ تھا کہ جیسے اندھیرے میں روشنی ہوجائے۔ میں اس وقت ان کی جانب متوجہ ہوا جب انہوں نے مجھے مخاطب کیا میں حیران تھا کہ میرے قرب وجوار میں تو کوئی نہیں تھا تو یہ کون ہیں، وہ کوئی بزرگ تھے، ولی تھے یا کچھ اور، مجھے نہیں معلوم مگر تھا وہ کوئی بہت بڑی روحانی ہستی جن کا چہرہ نور سے دمک رہا تھا انہوں نے مجھے کہا کہ انصار تم کو شائد معلوم نہیں کہ تمہیں بار بار جیل کیوں بھیجا جارہا ہے، میں حیران تھا کہ یہ کون بزرگ ہستی ہیں اور ابھی میری آنکھیں ان کے چہرے مبارک سے نہیں ہٹی تھیں کہ انہوں نے خود ہی جواب دیا کہ تمہیں بار بار جیل اسلئے بھیجا جارہا ہے کہ ''اللہ تم سے اپنے بندوں کے لئے نیک کام لینا چاہتا ہے'' تم اللہ کی راہ میں انسانیت کی خدمت کرو اور بے گناہوں کی رہائی کے لئے کوشاں ہوجاؤ، اللہ تمہارا حامی و ناصر ہوگا، بس انہوں نے اتنا کہا اور میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہوگئے۔ وہ دن اور آج کا دن ہے مجھے سیاست سے کوئی واسطہ نہیں رہا، سب کچھ بھول کر ایل ایل بی کیا اور اپنے آپ کو انسانی حقوق کے کاموں اور بے گناہوں کی جیلوں، نجی جیلوں اور جبری مشقت سے رہائی کا سلسلہ شروع کردیا اور ہر ہر قدم پر مجھے اللہ پاک رضا اور ﷺ کا ساتھ ملتا چلا گیا۔ اور اب مجھے ایسا لگتا ہے کہ اللہ پاک جسکی مدد کرنا چاہتے ہیں مجھے اس کی مدد کے لئے مقرر فرما دیتے ہیں اور یہ میرے رب کا مجھ پر عظیم احسان ہے۔

☆ آپ کی پسندیدہ شخصیت اور پسندیدگی کا سبب؟

Marfat.com

اللہ رب العالمین ہیں اور محمدؐ رحمت العالمین ہیں

آیئے مل کر اللہ کے پیغام کو محبت امن اور دوستی کی صورت میں پھیلائیں

انصار برنی

میری پسندیدہ شخصیت حضرت محمد ﷺ کی ہے اور پسندیدگی کا سبب یہ ہے کہ اللہ کو کل کائنات میں سب سے زیادہ محبت آپؐ سے ہے اور نبی پاکؐ سے بڑھکر انسانی حقوق کا علمبردار اس دنیا میں نہ کوئی آیا ہے اور رہتی دنیا تک نہ ہی کوئی اتنا عظیم علمبردار آسکتا ہے۔

☆ مایوسی کے خلاف زندگی میں انصار برنی نے کس ہتھیار کو استعمال میں لایا؟

میرے نزدیک مایوسی کے خلاف سب سے بڑا ہتھیار اللہ پر مکمل یقین کے ساتھ نبیؐ سے محبت اور پیار میں اضافہ ہے، جب پریشان ہوتا ہوں تو درود شریف کا ورد بڑھا دیتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ میں مسجد نبویؐ میں پہنچا ہوا ہوں اور نبی کے قدموں میں اپنا مسئلہ لئے حاضر ہوں اور بس ساری مایوسی اور فکر ختم ہو جاتی ہے۔ آدھی رات کو اُٹھ کر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنا مسئلہ اللہ کے سامنے پیش کر دینے سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں۔

☆ وہ کون سے پوشیدہ پہلو تھے جو آپ کی ناموری کا سبب بنے؟

وہ ایک خواب جس میں نبیؐ نے میرے کاندھوں پر اپنا ہاتھ مبارک رکھا تھا۔

☆ سالوں پر محیط انسانی خدمت کا سفر کیسا رہا، اپنے کردار سے مطمئن ہیں؟

الحمد وللہ سفر بہت عمدہ جاری ہے اللہ پاک اپنے بندوں کی خدمت لے رہا ہے اور مجھے اس قابل بنایا ہے کہ میں اس کے مظلوم اور ستائے ہوئے بندوں کے لئے اپنی خدمات جاری رکھے ہوئے ہوں۔ اپنے سفر سے بہت مطمئن ہوں اس میں کوئی لالچ، کوئی خودغرضی نہیں صرف اللہ کی رضاء اور بس۔

☆ کامیابی کے راستے پر گھر والوں نے کہاں تک رہنمائی کی؟

میری کامیابیوں میں میرے نانا سید اقبال حسین اور نانی سیدہ ساجدہ خاتون کا بڑا عمل دخل رہا ہے میرا بچپن انہی کی گود میں گذرا ہے پھر نویں کلاس میں تھا کہ شاہین سے ملاقات ہوگئی جو ایم ایس سی کرنے کے بعد میری بیوی بن گئیں۔ میری بیوی کا ساتھ ایک مثالی ساتھ ہے اور میں خوش قسمت ہوں کہ اللہ نے مجھے اتنی اچھی بیوی دی ہے جس نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا ہے۔ اور مجھے انصار برنی بنانے میں اس نے انتہائی اہم

Marfat.com

رول ادا کیا ہے۔اس میں سچ ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور میرے ساتھ اللہ اور نبیؐ کے ساتھ میری بیوی ہے۔

☆ آپ کے معمولات کیا ہیں؟

میری صبح اللہ پاک کے پاک نام اور دعا سے ہوتی ہے اور باقی معمولات میں اللہ کے حضور سربسجود ہونے کے ساتھ اللہ اور اس کے نبی کی خوشنودی کے لئے انسانیت کی خدمت میرا مشن رہتا ہے۔زندگی کا ہر لمحہ انسانیت وانسانی حقوق کے کاموں میں گذارنا میرے معمولات کا حصہ ہیں۔

☆ ملک میں آج تک آنیوالی جمہوری سسٹمز کے بارے میں کیارائے دیں گے؟

میرے خیال میں ہمارے ملک میں ابھی تک جمہوری سسٹم آیا ہی نہیں۔یا فوج اقتدار میں رہی ہے یا جسے فوج کے سربراہ نے چاہا وہ اقتدار میں رہا اسلئے میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے ملک میں کبھی جمہوریت بھی آئی ہے ویسے بھی میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں اسلئے مجھے صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ ملک وقوم کے لئے کون بہتر ہے اور کون بہتر نہیں۔

☆ اگر آپ کو سربراہ مملکت کی ذمہ داری مل جاتی ہے تو کیا کرینگے؟

اللہ پاک اگر مجھے سربراہ مملکت کی ذمہ داری عطا فرماتے ہیں تو مجھے اقتدار سے محبت نہیں ہوگی اور مجھے اپنی کرسی نہیں صرف اللہ کی رضاءعزیز ہوگی اور جب آپ کو صرف اللہ کی رضاءعزیز ہوتی ہے تو آپ اس کے بندوں کے کام کرتے ہیں اللہ اور اس کے نبیؐ کے پیغام کو اپنے عمل سے عام کرتے ہیں۔اسلئے میں پاکستان کو انسانی حقوق کے حوالے سے دنیا میں سب سے بلند مقام دلانے کے لئے کوشاں ہونگا۔اقتدار کرسی کے لئے نہیں بلکہ عوام کے لئے حاصل کیا جاسکتا ہے اور اگر اللہ نے کبھی ایسا چاہا اور مجھے منصب صدارت پر فائز کیا تو پھر خلفائے راشدین کا نظام مکمل طور پر پاکستان میں رائج کردیا جائے گا۔

☆ پاکستانی قوم کے مستقبل کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

میرے مذہب میں مایوسی کفر ہے۔اقتدار کی ہوس میں اندھے ملا،سیاستدان اور جرنیل پاکستانی قوم کی قسمت سے کھیل رہے ہیں اور میں اپنی ذات میں عملی جدوجہد کے ساتھ قوم کے بہترین مستقبل کے لئے دعا گو ہوں۔

Marfat.com

میں سچ بولنا چاہیے اور انصاف کا نظام لانے کے لئے عملی جدوجہد کرنا چاہیے۔

☆ زندگی میں کبھی غلطیوں اور خامیوں کا شکار ہوئے؟

اللہ کے فضل وکرم سے کبھی کوئی غلطی جان بوجھ کر نہیں کی اور زندگی میں کبھی ایسا کوئی کام ہی نہیں کیا جو خامیوں میں شمار ہوتا ہو۔ کبھی جان بوجھ کر کسی کی دل آزاری نہیں کی اور اگر غلطی سے کسی کی دل آزاری ہو جائے تو خیال آتے ہی معذرت کر لیتا ہوں۔ انسانوں کے دلوں میں اللہ بستا ہے اسلئے جان بوجھ کر کسی کا بلا وجہ دل نہیں توڑنا چاہیے۔

☆ موجودہ حالات میں عوام کو غربت، جہالت اور مایوسی سے کیسے بچایا جا سکتا ہے؟

پاکستان میں اگر تمام مسلمان صحیح معنوں میں زکات ادا کر دیں اور یہ زکاۃ مستحقین تک پہنچ جائے اس کے ساتھ امیر مزید امیر بننے کی خواہش ختم کر کے اپنی رقوم میں غریبوں کو بھی شامل کر لیں تو۔

☆ حکومت، عوام اور بیرون ملک پاکستانیوں کے لئے آپ کا پیغام؟

بس پاکستانی بن جاؤ.... پاکستانی کو صرف ایک پاکستانی ہونا چاہیے اگر ہم سندھی، پنجابی، پٹھان، بلوچی، یا سنی، وہابی، شیاء یا کچھ اور بنیں گے تو پھر پاکستانی نہیں رہینگے بس ایک ہی خواہش ہے کہ پاکستان سے محبت کرنے والے اپنے آپ کو پاکستانی کہنے والے درحقیقت پاکستانی ہی بن جائیں۔

☆ عوامی حقوق کے لئے کی گئی اپنی کاوشوں کے بارے میں بتائیں؟

میری پوری زندگی انسانیت، انسانی حقوق اور عوامی حقوق کے لئے جدوجہد میں ہی گزر رہی ہے اور اگر میں اپنے کاموں یا کی گئی کاوشوں کے بارے میں بتاؤں تو پوری ایک کتاب لکھنی پڑ جائے گی۔

☆ میڈیا میں آنے والی منفی رپورٹس پر کیا آپکو کبھی غصہ آتا ہے؟

منفی رپورٹس اگر حقائق کے منافی ہوں تو وہ صحافی یا وہ شخص اپنا آپ بتا رہا ہوتا ہے ظاہر ہے اس میں غصہ کی کوئی بات ہی نہیں۔

☆ اپنے نیٹ ورک اور سماجی کاوشوں سے آگاہ کریں؟

انصار برنی ٹرسٹ کی برانچیں اور نمائندے ماشاء اللہ اب ساری دنیا میں ہیں اور پاکستان کا انصار برنی ٹرسٹ کے حوالے سے دنیا بھر میں روز بروز انسانی حقوق کا جھنڈا اونچا ہو رہا ہے۔

☆ انسانی خدمات کے صلہ میں آپکو 200 سے زائد اعزازات ملے، آپکی نظر میں سب سے بڑا ایوارڈ کون سا ہے؟

Marfat.com

مجھے اب تک دوسو سے زائد اعزازات مل چکے ہیں جن میں امریکہ کی حکومت کی جانب سے ملنے والا بین الاقوامی ہیرو کا اعزاز بھی شامل ہے لیکن میری نگاہ میں میرے سب سے بڑا اعزاز مسجد نبویؐ میں اینٹ لگانا اور کعبہ شریف میں جہاں سے نبیؐ معراج پر تشریف لے گئے تھے اس مقام پر اینٹیں لگانا اور کام میں حصہ لینا ہے اور پھر اس سے بڑا اعزاز کیا ہوگا کہ خواب میں اللہ کے محبوب ترین رسولؐ نے مجھے متعدد بار بشارت کرائی اور میرے کاندھوں پر اپنا ہاتھ مبارک رکھا۔

☆ کیا 26 سالوں میں انصار برنی ٹرسٹ نے اپنے مطلوبہ اہداف حاصل کئے۔ اب آپ کی بڑی خواہش کیا ہے؟

گزشتہ 26 سالوں میں کئے جانے والے اپنے کام سے میں مطمئن ہوں اب میری زندگی کی خواہش یہ ہے کہ پاکستان میں انصاف کا بول بالا ہو اور میں انسانی حقوق کے حوالے سے دنیا بھر میں پاکستان کا پرچم سب سے اونچا دیکھوں۔

Marfat.com

سید محمد ظفر سے ایس ایم ظفر تک قانون وانصاف کی نصف صدی پر پھیلی کہانی

ملک کے صفِ اوّل کے قانون دان وسیاستدان سید محمد ظفر ایس۔ ایم۔ ظفر سے مشہور ہوئے۔ آپ کی شخصیت کے کئی روپ ہیں، وکالت سے سیاست تک آپ کی زندگی جدوجہدِ مسلسل سے عبارت ہے، آپ سیاستدان اور قانون دان ہونے کے علاوہ مصنف اور مفکر بھی ہیں۔ ایس ایم ایک دودھاری تلوار کا نام ہے یعنی انکا قلم انکی زبان ہی کی طرح چلتا ہے۔ وہ سرکاری سچ نہیں بولتے اور انکے لکھے ہوئے لفظ بھی انکے بولے ہوئے الفاظ کی طرح بامعنیٰ اور گہرے ہوتے ہیں۔ چھ ستمبر انیس سوتیس کورنگون ''برما'' میں پیدا ہوئے۔ انکا خاندان برما سے ہجرت کرکے شکرگڑھ سیالکوٹ آیا۔ ستتر سال عمر ہونے کے باوجود چاک وچوبند، زندہ دِل اور پُرسکون نظر آتے ہیں۔ انکی گفتگو میں ایسا تسلسل ملتا ہے جسے لفظ پیمائش کا مرحلہ عبور کرکے نکلے ہوں۔ آپ کی شادی ملک کی مشہور گلوکارہ ملکہ پکھراج کی بیٹی سے انجام پائی۔ انکا بڑا بیٹا طارق ظفر ''نئی زندگی'' نام سے ایک غیر سرکاری تنظیم کو چلا رہا ہے۔ دوسرے بیٹے علی ظفر ایڈوکیٹ کے ذمہ ''ظفر لاء ایسوسی ایشن'' چلانا ہے جبکہ انکا تیسرا بیٹا عاصم ظفر سٹاک ایکسچینج کاروبار سے وابستہ ہے۔ ایس ایم ظفر کی اکلوتی بیٹی روشا بھی ایک غیر سرکاری تنظیم ''کشف فاونڈیشن'' کے پلیٹ فارم سے پسماندہ علاقوں کی خواتین کو آسان قرضوں کی فراہمی میں سرگرمِ عمل ہیں۔ ایس ایم اپنے بیٹوں اور بیٹی پر فخر کرتے ہیں چونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ انکی اولاد اُس شمع کو روشن رکھے گی جسے انہوں نے جلایا تھا۔ انکی بیٹی روشا کا خیال ہے کہ 2010ء میں انکا ادارہ دس لاکھ انسانوں کی مدد کرنے کے قابل ہوجائے گا۔ روشا نوبل پرائز یافتہ بنگلہ دیشی بینکار ڈاکٹر محمد یونس کے کردار سے متاثر ہوکر ورلڈ بنک کی اعلیٰ ملازمت سے مستعفیٰ ہوئیں اور انہوں نے غربت کے اندھیروں میں روشنی مہیا کرنے کے عمل کا آغاز کیا۔

63ء میں پنجاب بار کونسل کے صدر منتخب ہوئے۔ ظفر نے پہلی بار انیس سو پینسٹھ میں ایوب خان کی کابینہ میں بحیثیت وزیر قانون وپارلیمانی امور شامل ہوکر ایوان اقتدار میں قدم رکھا تھا اور چار سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔

اپنے بیتے ایام زندگی کی تصویر بناتے ہوئے ایس ایم ظفر نے بتایا کہ میں نے شکرگڑھ ہائی سکول سے نمایاں پوزیشن کے ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کیا، یہ انیس سو اکیاون کی بات ہے جب میں ایل

Marfat.com

انٹرویو کے دوران کیمرے کی آنکھ میں قید کیا گیا لمحہ

ایل ایل بی کا امتحان دے کر نتیجہ کا منتظر تھا کہ ایک دن انار کلی بازار سے اپنی سائیکل پہ گزر رہا تھا کہ مجھے وہاں جسٹس (ر) سردار اقبال نظر آئے ،انہوں نے اشارے سے اپنے پاس بلا کر پوچھا کہ تم آج کل کیا کر رہے ہو؟ میں نے جواب میں انہیں اپنے رزلٹ کے انتظار کا بتایا۔ کہنے لگے وکالت کرنی ہے؟ میں نے کہا جی ہاں۔تم میرے دفتر آنا شروع کر دو انہوں نے کہا۔ اسطرح یہ سفر شروع ہو گیا اور پھر جب رزلٹ آیا تو میں کامیاب ہو گیا۔ پھر میں نے یہاں ہی وکالت شروع کر دی ، میں دفتر میں صبح ساتھ بجے سے رات گیارہ بجے تک رہتا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ بحیثیت وکیل میرا پہلا مقدمہ انتہائی معمولی نوعیت کا تھا جسکی مجھے صرف پندرہ روپے فیس ملی۔ کئی مقدمات سردار اقبال صاحب کے ہوتے ان میں بھی پیش ہو جاتا تا اپنا تجربہ حاصل کرنے کیلئے۔ شروع شروع میں مجھے ایک عدالت سے دوسری عدالت تک پہنچنے میں خوب سائیکل چلانا پڑتی۔ دو سال بعد جب ہائی کورٹ کا لائسنس ملا تو پھر میرے مقدمات کی تعداد کافی بڑھ گئی۔ شروع میں ہر قسم کے مقدمات لے لیا کرتا تھا جس سے مختلف قانونی معاملات سے آشنائی ہوئی۔ اپنی وکالت کے آغاز میں جن عدالتوں میں پیش ہوا وہ مجسٹریٹ اور جج صاحبان ایسا رویہ اپناتے جس سے خود وکیل محنت کی طرف راغب ہوتا، وہ لوگوں کو اچھی بحث پر شاباش اور غیر ضروری بات پر جھڑک دیتے تھے۔

جوں جوں میری وکالت کی شہرت بڑھی مجھے پشاور، سیالکوٹ ،شیخوپورہ، گوجرانوالہ، جہلم، گجرات، قصور اور بہاولپور سے بھی مقدمات ملنا شروع ہو گئے۔ اسطرح اپنی وکالت کے آغاز سے تیرا سال بعد تک مجھے اپنے کام میں یکسوئی سے مصروف رہنا پڑا۔ آج میں جب اپنے ماضی میں جھانکتا ہوں تو مجھے رنگون کی گلیاں یاد آتی ہیں، وہاں اپنے سکول، اساتذہ اور کھیل کے میدان کے ساتھ پھر وہ لوگ یاد آتے ہیں جو اسوقت ہندوستانی تھے پھر جب پاکستان بنا تو پاکستانی کہلائے۔ میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں کہ کس طرح انہوں نے اپنا ملک جہاں وہ اقلیت میں تھے چھوڑ کر ایک دوسرے ملک میں نام کمایا۔ ایک سوال پر انہوں نے کہا کہ ہم چار بہن بھائی تھے۔ سب سے بڑی بہن روحا بانو، بڑے بھائی سید محمد اقبال تھے، تیسرے نمبر پہ میں تھا اور سب سے چھوٹی بہن کا نام حور بانو تھا۔ میرے والد خواجہ حسن نظامی کے خلیفہ تھے۔ بہت سے احباب میرے والد کو

Marfat.com

اللہ کا ولی سمجھتے تھے۔ انکی زندگی پر ایک کتاب ''حیات کشفی'' بھی شائع ہو چکی ہے۔ والد کی شخصیت میں عشق رسول ﷺ بڑا واضح تھا سیرت کمیٹی کے نام سے ایک تنظیم انہوں نے بنا رکھی تھی اور اسکے تحت وہ ایک رسالہ ''ایمان'' بھی نکالتے تھے۔ والد مسلم لیگ کے ممبر تھے اور انکے پاس مختلف قائدین بھی آتے تھے مجھے یاد ہے انکے پاس ایک بار مولانا ظفر علی خان آئے تھے اور انہوں نے میرے والد کے بارے میں ایک نظم بھی لکھی تھی، جس کا ایک شعر یہ تھا!

کل سُنا تھا نام کشفی شاہ کا
آج دیکھا ہے کام کشفی شاہ کا

اسی طرح کئی دیگر شخصیات بھی ملنے آتیں، ہم بچوں کے دِلوں میں بھی ایسی شخصیات کی بڑی اہمیت تھی۔ میری والدہ ان پڑھ تھیں تاہم انہوں نے قران پاک پڑا ہوا تھا۔ والدہ پرانے زمانے کی سیدھی اور سادہ خاتون تھیں جب کوئی اُن سے اُردو میں بات کرتا تو وہ پنجابی میں جواب دیتی اور جب کوئی پنجابی بولتا تو وہ اُردو میں بات کرنے لگتی تھیں۔

سید محمد ظفر کو لوگ ایس۔ ایم۔ ظفر کیوں کہتے ہیں......؟ جب میں نے گورنمنٹ کالج لاہور کی کالج یونین کا سیکرٹری جنرل کے عہدے کیلئے الیکشن لڑا تو میرے دوستوں نے بورڈ وغیرہ لکھوانے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ میرے نام میں انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں الفاظ زیادہ استعمال ہوتے تھے، جس پر دوستوں نے تجویز دی کے پورے نام کے بجائے ایس ایم ظفر لکھا جائے۔ میں نے اسے قبول کر لیا، اسکے بعد میرا نام ایس ایم۔ظفر مشہور ہو گیا۔ اب تو اگر کوئے سید محمد ظفر کہے تو میں چونک اُٹھتا ہوں کہ مجھے مخاطب کیا گیا ہے یا کسی اور کو۔ بچپن میں جن حالات اور واقعات کا انسان کو سامنا کرنا پڑھتا ہے انکے جوانی اور بڑھاپے میں کسی نہ کسی شکل میں اثرات ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ جب ہماری فیملی برما سے واپس آ رہی تھی تو اسوقت بھی رنگون پر ہوائی حملہ ہوا تھا۔ ہمارے جہاز کو ایمر جنسی میں نکالا گیا، طیارے نے بڑے ہچکو لے کھائے، بہر حال ہم کلکتہ پہنچ آئے اور پھر وہاں سے بذریعہ ٹرین سفر کر کے لاہور پہنچے اور پھر اپنے گاؤں شکر گڑھ روانہ ہوئے۔ جب ہم یہاں آئے تو ہمارا گاؤں غیر ترقی یافتہ علاقہ تھا ہم نے ایک جدید شہر میں زندگی گزارنے کے بعد ایک پسماندہ گاؤں کا رُخ کیا تھا۔ گاؤں میں تین چار کمرے کا ہمارے گھر تھا جسکا

Marfat.com

بیشتر حصہ کچا تھا۔ رفع حاجت کیلئے ہم کھیتوں میں جاتے اور نہانے کیلئے گھر میں بالٹی کا پانی اتنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اسی طرح زندگی گزرنے لگی اور پھر بہت جلد ہم اس ماحول میں مانوس ہو گئے۔

میرے والد ٹھیکیدار تھے اس لیے انکا انجینئرز سے بڑا واسطہ پڑتا تھا، انہیں انجینئر کی اہمیت کا اندازہ بھی تھا۔ ویسے بھی اس دور کے انجینئر لائق اور ایماندار ہوا کرتے تھے لہذا، والد صاحب کی خواہش تھی کہ میں بھی انجینئر بنوں۔ میں نے ان کی خواہش کے مطابق انجینئرنگ میں ایف ایس سی کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا مگر اگلی کلاس میں مغل پورہ انجینئرنگ کالج میں مجھے تو داخلہ مل گیا مگر یہاں میرے کچھ جگری دوستوں کو داخلہ نہ مل سکا۔ پھر اچانک میرے دل نے چاہا کہ ہم وکیل بنیں۔ گھر سے آنے والی داخلہ فیس کی رقم میرے ہاتھ میں تھی اب اسے انجینئرنگ کالج میں جمع کروانا تھا کہ اندر سے آواز شدت سے آنے لگی کہ انجینئر نہیں بننا۔ میں نے اس آواز کو اہمیت دیتے ہوئے انجینئر کے بجائے وکیل بننے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ فیس کی یہ رقم لاء کالج میں بطور داخلہ جمع کروا دی۔ جب میرے والد کو پتہ چلا کہ میں نے گورنمنٹ کالج میں وکیل بننے کیلئے داخلہ لیا ہے تو انہوں نے اعتراض یا ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ وکالت میں آنے کی وجہ قائداعظم کی شخصیت سے انتہائی متاثر ہونا تھا۔ میں نے اپنی تقاریر اور وکالت میں دلائل کو اہمیت دینے کا سٹائل بھی قائداعظم سے حاصل کیا۔ میں آپ کو بتاؤں کہ میرے دستخط بھی قائداعظم سٹائل میں ہیں۔ جب قائداعظم اسلامیہ کالج لاہور آئے تو مجھے انکے جلسے میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ میں نے وہاں قائداعظم کو دیکھا اور انکی تقریر بھی سنی۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے دلچسپ بات کی کہ وکالت کی مثال ایسی ہے جسے جتنی پرانی شراب، اتنی زیادہ قیمت میں جتنا پرانا وکیل ہوں میری فیس بھی اسی حساب سے زیادہ ہے۔ ہالینڈ کی عدالت میں چلنے والے پاکستانی ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ کراچی یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر قدیر خان 61ء میں مغربی جرمنی گئے وہاں وہ دو سال تک

Marfat.com

مقیم رہے۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب کی شادی ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو ہالینڈ سے تعلق رکھتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی بیگم کا نام ہینی تھا انہوں نے انکی خواہش پر یا اپنی تعلیمی ضرورت کے تحت ہالینڈ جانے کا فیصلہ کیا اور وہاں ڈیلف کی ایک ٹیکنیکل یونیورسٹی میں ''میٹ لرجی'' کے خصوصی شعبے میں داخلہ لیا اور پھر ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر قدیر تعلیم سے فارغ ہوئے تو انہوں نے ہالینڈ کی ایک کمپنی ایف ڈی او میں ملازمت اختیار کر لی۔ اسوقت بھارت نے ایٹمی تجربہ کر دیا تھا اور پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو اپنے ملک میں ایٹمی پروگرام کو آگے بڑھانا چاہتے تھے اور انہوں نے قدیر خان کو پاکستان آنے پر رضامند کر لیا۔ چنانچہ ڈاکٹر اے کیو خان نے کہوٹہ پلانٹ پر کام شروع کر دیا۔ اسکے تقریباً تین سال بعد ایک امریکی ہفت روزہ نے یہ انکشاف کیا کہ پاکستان یورینیم پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور کسی بھی وقت ایٹمی دھماکہ کر سکتا ہے، اس خبر کے پانچ یا چھ ماہ بعد ہالینڈ کے ایک ٹی وی نے یہ خبر دی کہ ڈاکٹر اے کیو خان ہالینڈ کی ایک کمپنی سے وہ ٹیکنالوجی لے کر جانے میں کامیاب ہو گیا ہے جو برطانیہ، ہالینڈ اور جرمنی کے مشترکہ تعاون سے ایٹمی ٹیکنالوجی پر ریسرچ کرتی ہے اور یورینیم تیار کرتی ہے۔ ہالینڈ کی کمپنی Almelo ڈاکٹر خان پر چوری کا الزام عائد کیا تھا۔ اکتوبر انیس سو تراسی کو ہالینڈ کے سفیر نے ڈاکٹر قدیر خان کے نام ہالینڈ کی عدالت کے بھیجے گئے سمن وزارت خارجہ کے ذریعے پہنچائے جن سے واضح ہوا کہ ڈاکٹر قدیر پر ہالینڈ کی ایک عدالت میں فوجداری مقدمہ زیر سماعت ہے۔ وزارت قانون نے اس بارے میں یہ رائے دی کہ چونکہ ہالینڈ اور پاکستان مین کوئی ایسا معاہدہ موجود نہیں کہ ایک دوسرے کے مطلوب ملزمان سے کسی سمن کی تعمیل کروائی جائے، لہذہ سمن واپس ہالینڈ بھیج دیا جائے۔ لیکن یہاں بدقسمتی سے وزارت قانون نے یہ رائے دینے میں تاخیر کر دی اور وزارت خارجہ کی جانب سے متعلقہ عدالت کو جواب 31 اکتوبر 1983ء کے بجائے پندرہ نومبر 1983ء کو پہنچایا گیا۔ اس دوران ڈاکٹر خان کو انکی عدم حاضری پر مجرم قرار دے دیا گیا، اور انہیں چار سال کی قید کا حکم سنایا گیا۔ ڈاکٹر خان کو اس کا بڑا رنج تھا اور وہ اسے وقار کا مسئلہ بنائے ہوئے تھے۔ چنانچہ میرے ساتھ انکی ملاقات طے ہوئی انہوں نے واضح کیا کہ وہ ڈٹ کر اس الزام کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، لہذا بری ہونے سے کم پر بات نہیں بنے گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وزارت قانون پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے انہوں نے حکومت مخالف ہونے کے باوجود مجھے اپنا وکیل مقرر کیا۔ جب ڈاکٹر قدیر خان نے اپنے مقدمے کی پیروی کیلئے میرا نام تجویز کر کے بھیجا تو وزارت قانون کے علاوہ اسے جنرل ضیاء کی طرف سے ''نہیں'' کر دیا گیا مگر ڈاکٹر خان کی ذاتی خواہش پر مجھے ہالینڈ جانے کا موقع ملا۔ اس کیس میں

Marfat.com

ڈاکٹر صاحب کی طرف سے یہ اپیل ہوسکتی تھی کہ انہیں پیش ہوئے بغیر سزا نہیں ہوسکتی۔ ہم نے ہالینڈ کی عدالت میں یہ مواقف اختیار کیا کہ ڈاکٹر قدیر خان پاکستان کے ایک ایسے ادارے کے ملازم ہیں جسکا یہ دستور ہے کہ اگر اس ادارے کا کوئی ملازم بیرون ملک جائے گا تو اسے سات سال قید ہوسکتی ہے، ان کا یہاں پیش ہونا انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہوگا۔ ہماری یہ دلیل عدالت نے تسلیم کرلی اور ہماری اپیل کی سماعت شروع کردی گئی۔ اپیل کی منظوری کی اطلاع ہمارے لیے بہت بڑی خوشخبری کی طرح تھی یہ سن کر ہم نے بھنگڑہ ڈالا۔ میں نے عدالت میں ایک اور نقطہ پیش کیا اس پر ہمارے دیگر ڈچ وکلاء نے اتفاق نہیں کیا مگر میں اسی پہ ڈٹا رہا اور اللہ کے فضل سے اسی پوائنٹ پر ہمارے حق میں فیصلہ ہوگیا۔ بعد ازاں وہ وکلاء پاکستان آئے اور انہوں نے یہ اعتراف کیا کہ اس مقدمے کی کامیابی کا سہرا ایس ایم ظفر کے سر ہے، کیونکہ ہم تو اس خاص نقطہ کو پیش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ یورپ میں نیولین کوڈ کے تحت تفشیش کے دوران ملزم کو عدالت میں پیش کرنا ضروری ہوتا ہے، میں بضد تھا کہ دورانِ تفشیش ڈاکٹر قدیر کو پیش ہونے کا موقع نہیں دیا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ عدالت نے انہیں سمن بھیجا اور وہ پیش نہیں ہو پائے، عدالت نے انہیں سزا سنا دی۔ یہ کاروائی متعلقہ قانون کے تحت درست نہیں تھی۔ اسی نقطہ پر ڈاکٹر صاحب کی سزا ختم ہوئی۔

Marfat.com

زندگی کو اپنے انداز سے جینے والے جنرل مشرف کی کہانی

جنرل پرویز مشرف کے نام سے کون واقف نہیں۔ یہاں انکا ذکر صدر پاکستان نہیں بلکہ ایک سلف میڈ انسان کی حثیت سے ذکر کیا جا رہا ہے۔ آیئے انکے ماضی کے چھپے گوشوں سے پردہ اٹھائیں اور محسوس کریں کہ وقت انسان کو کیسے کیسے مراحل سے گزارتا ہے۔

جنرل پرویز مشرف دریائے گنج کے قریب دہلی کے علاقہ کچا سعد اللہ جان کی مشہور نہر والی حویلی میں سید مشرف الدین کے ہاں 1943ء میں پیدا ہوئے۔ انکے والد اور والدہ زرین مشرف نے انکا نام ''پرویز'' رکھا، پیار سے ''پلو'' بھی کہلاتے۔ مشرف الدین کے ذرائع آمدن محدود تھے لیکن زرین مشرف کی خواہش تھی کہ انکے بیٹے اچھی تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ پرویز کو چرچ انگلش ہائی سکول میں داخل کروایا گیا یہ ادارہ اسوقت کی بہترین درسگاہوں میں شمار ہوتا تھا۔ انکے والد اسوقت ہندوستان کے دفتر خارجہ میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ جنرل مشرف کی والدہ نے دہلی یونیورسٹی سے انگلش لیٹریچر میں ایم اے کیا ہوا تھا اسلیئے اپنے دفتری اوقات کے بعد وہ اپنے بچوں پر خود توجہ دیتی۔ انکے والد نے اپنے خاندان کے دیگر افراد کے سامنے یہ نعرہ بلند کرتے ہوئے پاکستان آنے کا فیصلہ کرلیا کہ ''ہم نے پاکستان میں رہنا ہے جو قائداعظم نے بنایا ہے، ہم نے اس وطن کو سنوارنا ہے''۔ کراچی آنے کیلئے انہوں نے جس ٹرین کا انتخاب کیا وہ مسافروں سے بھری تھی۔ دوران سفر مشرف الدین اپنے اہل خانہ کی حفاظت کے علاوہ اُن ساتھ لاکھ روپوں کی بھی حفاظت کرتے رہے جو پاکستان کے نئے دفتر خارجہ کیلئے تھے اور انہیں یہ رقم کراچی پہنچانے کی ذمہ داری ملی تھی۔ ہجرت کے تین سال بعد اس خاندان کو دوسری ہجرت کرنا پڑی جب پرویز کے والد کا تبادلہ ترکی کے پاکستانی سفارتخانے میں کر دیا گیا۔ پرویز کے بھائی جاوید کو احساس تھا کہ تعلیم ہی کامیابی کی کنجی ہے جبکہ پرویز مشرف کا ذہن شرارتوں کی طرف زیادہ مائل رہتا تھا

صدر جنرل پرویز مشرف اوران کی اہلیہ

ایک مصور جنرل پرویز مشرف کی سڑک کنارے تصویر بنا رہا ہے

Marfat.com

،انکا بچپن انہی عام سے شرارتی لڑکوں کیطرح گزرا۔ پرویز مشرف کے مطابق سکول میں میرے بڑے بھائی جاوید مشرف ذہین طلباء میں شمار کیے جاتے تھے اور مجھے اساتذہ ہمیشہ میرے بڑے بھائی کی وجہ۔۔ بچہ۔ نیتے تھے۔ جب اخبارات میں فوجی بھرتیوں کا اشتہار شائع ہوا تو پرویز نے بھی ٹیسٹ دیدیا۔ انہیں سلیکٹ کرلیا گیا۔ پرویز مشرف نے 60ء میں ایف سی کالج لاہور اور 62ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی جوائن کی۔ اپریل 1964ء میں پرویز نے جب کاکول اکیڈمی سے 29واں پی ایم اے کورس مکمل کیا تو اسے سیکنڈ لیفٹننٹ کے طور پر ذمہ داریاں ملیں، 66ء میں وہ کپتان بنا دیئے گئے۔ اسی طرح ترقی کی منازل طے کرتے کرتے پرویز پہلے چیف ایگزیکٹو بنے اور 12 اکتوبر 1999 کے بعد صدر پاکستان کے طور پر دنیا کے سامنے آئے۔

Marfat.com

اخبار فروش سے وزیر اعظم پاکستان کے مشیر اور اخبار فروشوں کے قائد تک

ہماری سماجی زندگی میں اخبار فروش کیا اہمیت رکھتے ہیں.....؟ اِس کا اندازہ ہر اخبار پڑھنے والا ہی کر سکتا ہے جو ہر صبح ''تازہ اخبار اے'' کی جانی پہچانی آواز کا بے تابی سے منتظر رہتا ہے۔ ایک ''اخبار چی'' کو اگر ایک دِن اخبار نہ ملے تو اسے کسی چیز کی کمی اور تشنگی کا احساس رہتا ہے یہ کمی قریہ قریہ اخبار پہنچانے والے ''اخبار فروش'' کی صرف ایک چھٹی یا ناغے سے پیدا کر سکتے ہیں۔ گویا سماجی زندگی کے مکمل تصور سے ہاکر کے وجود کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس برادری کے اجتماعی مسائل کے حل کیلئے مختلف ادوار میں ایک پلیٹ فارم کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی اور قیام پاکستان کے ایک برس بعد پہلی بار 48ء میں لاہور کی سطح پر اخبار فروشوں کی تنظیم معرض وجود میں آئی۔ اسکے بعد مختلف چھوٹی بڑی تنظیمیں بنتی ٹوٹتی رہیں مگر برسوں پہلے معرضِ وجود میں آنے والی ''آل پاکستان اخبار فروش فیڈریشن'' نے اس طبقے کے حقوق کے حصول کے لیے ملکی سطح پر پہلی بار ایک منظم جدوجہد کا آغاز کیا۔ پاکستان بھر کی اخبار فروش برادری اس چھتری تلے جمع ہوگئی۔ اس فیڈریشن کے حوالے سے ہر دور میں مختلف شخصیات نے کام کیا لیکن بلاشبہ اس پلیٹ فارم سے محنت کشوں کے مسائل کے حل کیلئے مزدور راہنما ٹکا خان کی خدمات ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں۔۔ ٹکا خان کی زیر قیادت اخبار فروشوں کو ''اخبار مارکیٹ'' کی صورت میں چھت میسر آئی اور اس برادری کے ہزاروں لوگوں کو ایک معقول آمدنی مہیا ہوئی۔ ملک بھر کی اخبار فروش برادری نے انکی بے مثال خدمات کے اعتراف میں انہیں تاحیات فیڈریشن کے سیکرٹری جنرل کے طور پر چن لیا۔ اور ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں تو وزراء اعظم بند کمروں میں اپنے مشیر چنتے ہیں لیکن ٹکا خان کو جلسہ عام میں نگران وزیر اعظم معراج خالد نے اپنا ''مشیر'' بنایا تھا۔ خان عوامی اسمبلی میں مشیر بننے والا شاید پہلا شخص ہے۔ خان نے کچھ مہینے ''خیمہ سیاست'' میں چلہ کشی تو کی مگر پھر ''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا''۔

چائے سے محبت کرنے اور اکثر سگریٹ کا دھواں اُڑانے

Marfat.com

والے میں نے جتنے احباب کو جانتا ہوں ان میں ٹکا خان پہلا درجہ رکھتے ہیں۔خان کہلانے والے ٹکا کے اندر ایک چھوٹا سا درویش بھی کمبل اوڑھے بیٹھا ہے۔ٹکا خان سے انکی کہانی سننے میں کئی مرتبہ اخبار مارکیٹ گیامگر وہ ہرشہر کے کارکنوں کے حالات ومشکلات سے باخبر رہتے ہیں اور انکے حل کیلئے کاوشیں کرتے ہیں۔اس لیے بات چیت کا تسلسل ہمیشہ ٹوٹ جاتا۔آخر ایک دن وہ اپنے مشاہدات کی یادوں میں ڈوب کر بولا! میری ماں کے مطابق میں 5 مارچ 1955ء کو پیدا ہوا۔میرا نام سُلطان ٹکا جو ایک مشہور روحانی شخصیت گزرے ہیں انکے نام پر رکھا گیا لیکن میرے ماموں انور عباسی جب مجھے سکول لے گئے تو وہاں انہوں نے انجانے میں نام سُلطان ٹکا کے

ملاقات کے دوران لی گئی تصویر

بجائے ٹکا خان لکھوا دیا جو آج تک چل رہا ہے۔والد شاہ میر کسی زمانے میں بہت خوشحال تھے،لیکن میری پیدائش سے ایک برس قبل انکے کاروبار میں نقصان کے باعث ہمارے گھریلو حالات کمزور ہو چکے تھے۔اسطرح جب میں پیدا ہوا تو ایک دولت مند کا نہیں بلکہ ایک مزدور کا بیٹا تھا۔زندگی میں بہت دُکھ کے منتر پڑھے اسلیے غریبوں سے ہی پیار ہے۔غریب باپ کا بیٹا ہونے کے باوجود گورنمنٹ ہائی سکول مری کا امیر ترین طالبعلم تھا کیونکہ میں تعلیم کے ساتھ ساتھ دودھ اور فروٹ بیچا کرتا جس سے کچھ روپے کمالیتا۔میں صفر تھا...... محنت کی، خدا کے فضل، ماں کی دعاؤں میرے ساتھ تھیں، آج جس مقام پر ہوں اسکا میرے ذہن میں کوئی خاکہ نہیں تھا۔میری زندگی کا مقصد خدمت خلق تھا، نمود و نمائش کو کبھی اولیت نہیں دی۔جس کمائی کا مزا خون کو خشک کرنے، پسینہ بہانے اور مشکلات برداشت کرنے میں ہے وہ شیشے کے گھروں میں بیٹھ کر حساب لینے میں نہیں۔جب میں نے اخبار فروشی شروع کی تو ایک سایہ دار درخت کے نیچے اخبار مارکیٹ ہوتی تھی۔ہماری کوششوں سے 82ء میں بار مارکیٹ اسلام آباد بنی۔اب اخبار مارکیٹ کراچی، سیالکوٹ، حیدرآباد اور راولپنڈی کے علاوہ دیگر شہروں میں بھی مارکیٹیں زیر تعمیر ہیں۔ٹکا کہتے ہیں کہ کام کرنے کیلئے کرسی کا ہونا ضروری نہیں ہوتا، جب میں بچہ تھا تو میں نے برسوں جیب خرچ اکھٹا کر کے اپنی مسجد کیلئے تین ہزار کا لوڈ سپیکر خریدا۔مسجد ہمارے پڑوس

Marfat.com

میں تھی۔ رات جب والدہ سو جاتی میں مسجد میں سوئے مسافروں کو گھر سے سالن چوری کر کے روٹیاں بازار سے خرید کر کھانا کھلاتا۔ میرے والد غریب تھے لیکن انہوں نے ہمیشہ خودداری کا درس دیا۔ 13 سال کی عمر میں ہی میں سنجیدگی کی منازل طے کر چکا تھا۔ میں نے زندگی کا ایک طویل عرصہ تمام بڑے شہروں میں اخبار مارکیٹس قائم کرنے، اخبار فروش کو سفری و رہائشی سہولیات مہیا کروانے، انہیں ڈیوٹی فری موٹر سائیکلز کی فراہمی اور ان محنت کشوں کے بچوں کو طبی و تعلیمی سہولیات مفت فراہم کرنے کی جدوجہد کی ہے اور میں اپنی اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب رہا ہوں۔

میں نے اخبار فروشوں کو جاگیرداروں سے بچایا، اور تنظیم کے اندر جمہوری نظام رائج کیا۔ انکی ترجمانی کیلئے ''روزنامہ مسلمان'' کا اجراء کیا تا کہ اس پلیٹ فارم سے انکی آواز اقتدار کے ایوانوں تک پہنچائی جا سکے۔ میری خواہش ہے کہ اس ملک کے محنت کشوں کا اپنا ٹی وی چینل ہو۔ میری مناسب تعلیم ہے میں ڈگریوں والے علم پہ یقین نہیں رکھتا۔ اگر معاشرہ ڈگری کو قابلیت کا معیار سمجھتا ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ مولانا مودودی کے پاس کون سی ڈگری تھی، نوابزادہ نصر اللہ کون سے گریجویٹ تھے۔ جب خدا کسی سے کام لیتا ہے تو ڈگریاں نہیں دیکھی جاتیں۔ مشرف حکومت نے انتخابات میں حصہ لینے کیلئے بی اے کی شرط عائد کی ہے میں اسکا حامی نہیں ہوں۔

''آپ بائیس سالوں سے یونین کے سیکرٹری جنرل آ رہے ہیں کبھی اندر سے بغاوت کا سامنا کرنا پڑا''؟ میں نے پوچھ لیا، بغاوت ہمیشہ وہاں جنم لیتی ہے جہاں اختلافِ رائے ہو، چھوٹی چھوٹی ناراضگیاں تو ہمارے درمیان بھی موجود ہیں مگر کبھی یہ صورتحال پیدا نہیں ہوئی۔ کام کرنے کا مزہ وہیں آتا ہے جہاں اپوزیشن ہو۔ حزب اختلاف کی موجودگی میں انسان اپنے عیب چھپا کر کام کرتا ہے۔ تنظیم میں اختلاف رائے رکھنے والوں کی عزت کرتا ہوں، ہماری فیڈریشن کا باقاعدہ آڈٹ ہوتا ہے، پائی پائی کا حساب ہوتا ہے۔ ہم کام کرتے ہیں اس لیے اخباری مالکان اور عوام کے اندر ہماری احترام موجود ہے۔

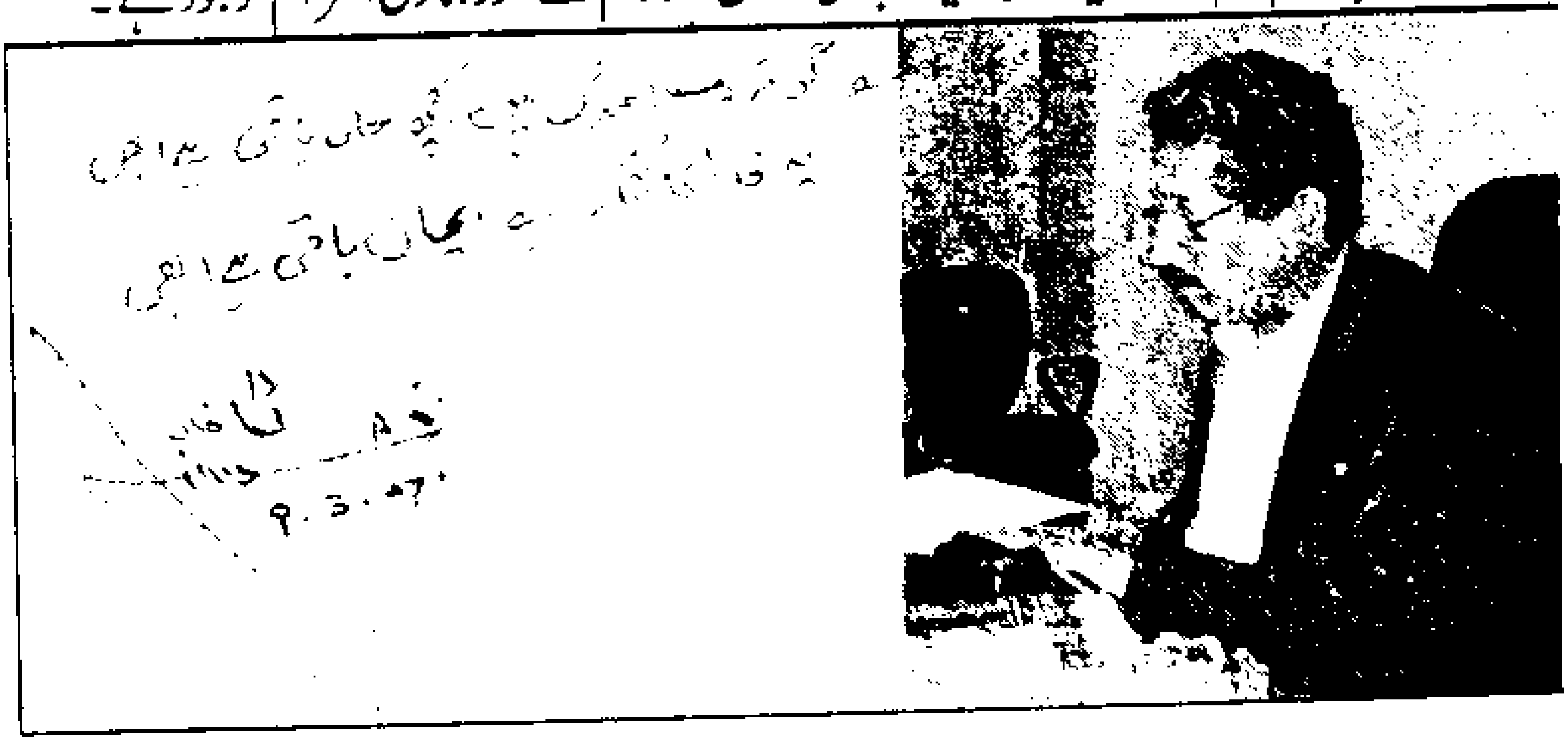

Marfat.com

ہم نے ہر قسم کی قربانیاں دے کر اخبار فروشوں کی دِن رات خدمت کی انہیں بولنے اور اپنا حق مانگنے کا ڈھنگ سکھایا۔ جب خون گرم تھا تب بھی لڑے اور آج جب عمر کے سایے ڈھلنے لگے ہیں تب بھی اپنے غریب بھائیوں کیلئے کام کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ مجھے بلیک میلنگ سے نفرت ہے، زندگی بھر عاجزی کا دامن نہیں چھوڑا۔ ٹکا خان بتاتے ہیں کہ سردار عتیق خان ''وزیر اعظم آزاد کشمیر'' اکثر کامیاب سیاستدان بننے سے قبل انکے ہاں آیا کرتے تھے۔ یار! باؤن سال کا ٹکا خان کم از کم اپنے ضمیر سے مطمئن ہے۔ دلی خواہش ہے کہ جب دنیا سے جاؤں تو تاریخ کے منظر نامے پر میرا نام کسی کونے میں درج ہو۔ ایک سوال پر انکا کہنا تھا کہ میرے نزدیک کلچر میں جائز تبدیلی ٹھیک ہے لیکن ہمیں اپنی روایات اور کلچر کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

یہ مولا کا بڑا شکر ہے کہ اخبار مارکیٹ سے اخبار فروش برادری کے علاوہ معاشرے کے دیگر بے سہارہ لوگ بھی مستفید ہوتے ہیں۔

پاکستان کے مزدوروں کو ہماری فیڈریشن کے وجود سے اپنے حقوق کا شعور ملا۔ چونکہ ہم یکجہتی کی علامت بنے اس لیے دوسری تنظیموں نے بھی ہماری تقلید کی۔

آل پاکستان اخبار فروش فیڈریشن کے سیکرٹری جنرل ٹکا خان کے خیال میں پاکستان کا مستقبل تب روشن ہوگا

جب اس کی 98 فیصد آبادی سے حکمران ہونگے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا آج تک تختِ اقتدار پر فائز رہنے والوں کو عوام کے حقیقی مسائل سے اگاہی نہیں رہی۔ ہمیں سٹیس کو چھوڑ کر کردار کی عزت کرنا ہوگی۔ میری نظر میں جب کردار کا احترام ہوگا تو اس ملک کی بیوروکریٹس اور عام عوام کرپشن نہیں کریں گے جس دِن کردار کو وقار ملنا شروع ہو گیا اس دِن لوگ اپنی عزت کیلئے روپے کے بجائے کردار بنائیں گے۔ ٹکا خان نے کہا کہ ایک گہری سازش کے تحت قوم کے جسم کو ایک زندہ لاش میں تبدیل کیا جا رہا ہے چونکہ زندہ لاشیں کوئی حدف حاصل نہیں

Marfat.com

کرسکتیں، منتشر قو میں کچھ بھی نہیں کرسکتیں ہمیں اپنے روشن کل کیلئے اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا ہوگا اور پاکستانیت کے جذبے کے تحت مستقبل کے خوابوں میں رنگ بھرنا ہوگا۔

انہوں نے اس بات پہ بھی زور دیا کہ صاحبان اقتدار کو بنک اکاونٹ کے بجائے قبر کا اکاونٹ بنانا چاہیے۔ وزیراعظم کے مشیر کے طور پر اقتدار کی بستی کا پھیرا لگانے والے ٹکا خان کے خیال میں ''سیکورٹی گارڈ کلچر'' انسان کو انسانوں سے دور کر دیتا ہے۔ میرا خدا پر گہرا یقین ہے میں اپنے پروٹوکول کے وسائل مستحق افراد میں بانٹ دیتا ہوں۔

''آج کے اخبار فروش کے بڑے مسائل کیا ہیں''؟ ہم ملک کے 80 ہزار محنت کش اخبار فروشوں کیلئے سرکاری طور پر رہائشی پلاٹس بنانے کا مطالبہ کرتے ہیں اور تمام شہروں میں اخبار مارکیٹوں کے قیام کی بات کرتے ہیں۔ ہم اخبار فروشوں کیلئے موٹر سائیکلز پر ٹیکس ختم کرنے اور اخبار فروشوں کے انفرادی مسائل کے حل کی آواز اُٹھاتے ہیں۔ آرزو ہے کہ اپنی برادری کے مسائل کو میری زندگی میں ہی حل کی صورت ملے۔ اپنی پسندیدہ شخصیت کے بارے میں بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ انسانیت کے ہیرو حضرت محمد ﷺ میرے ہیرو ہیں، انکا ہر پہلو مجھے اچھا لگتا ہے۔ وہ قیامت تک انسانوں کیلئے نشان راہ کی مانند ہیں۔

Marfat.com

"سیاسی پنجرے" کا ایک مست پرندہ

جاوید سیاسی پنجرے کا ایک ایسا مست پرندہ ہے جو اپنے شور سے حکمرانوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا، ایام اسیری میں بھی خود یہ نہیں کہتا کہ " آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے" بلکہ بزرگ، نوجوان اور معصوم بچے اسکی رہائی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ گو ہاشمی کم عمری میں جرنیل ضیاء الحق کی کابینہ میں میاں نواز شریف اور راجہ ظفر الحق کے ساتھ وزیر رہے لیکن واضح ہے کہ ہاشمی نے جس کا ساتھ دیا کھل کر دیا اور جسکی مخالفت کی کھل کر کی۔ یہ ایسا پہلا فرد ہوگا جو آٹھویں کلاس سے مسلسل باغی کہلانے پہ فخر کرتا ہے۔ ملتان سے بارہ کلومیٹر دور چھوٹے سے گاؤں مخدوم رشید کے جاوید ہاشمی نے قومی افق تک آنے میں بڑے پاپڑ بیلے۔ زمانہ طالبعلمی میں ہی جاوید ہاشمی میں وکھری راہوں پر چلنے کی ایک چنگاری موجود تھی پھر قدم قدم پہ پیش آنے والے حالات اس چنگاری کو شعلے کا روپ دیتے ہیں۔ ہاشمی نے 71ء سے آج تک [redacted] مختلف مقامات پر "سیاسی بدتمیزی" کا مظاہرہ کیا... سزائیں کاٹیں، سسٹم سے بغاوت کا رسک لیا، یعنی جیل اور جاوید ایک دوسرے سے اجنبی نہیں ... اپنے جلاوطن لیڈر کے سیاسی جانشین کے طور پر آزمائش کے کٹھن مراحل عبور کیے۔ یہ منظر میری یادداشت میں محفوظ ہے کہ جاوید ہاشمی نے ایک گمنام خط باعنوان "فوجی قیادت کے نام" اسمبلی کے کیفے ٹیریا میں لہرایا تھا اسوقت میں نے صحافت میں آنکھیں کھولی تھیں۔ اس خط کے اجراء پر ہاشمی کو ایک بار پھر 29 اکتوبر 2003ء کو انکی سرکاری راہشگاہ پارلیمنٹ لاجز سے ننگے پاؤں گرفتار کیا گیا یہ ہاشمی کے کیریئر کی تیسویں گرفتاری تھی۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی جانب سے "ضمیر کا قیدی" قرار پانے والے جاوید ہاشمی کے بارے میں میاں نواز شریف کا کہنا ہے کہ جاوید ہاشمی ہم سب کیلئے فخر اور اعزاز کی علامت بن گیا ہے۔ اب وہ اعلانیہ باغی قرار دیئے جانے لگے ہیں۔ "ہاں میں باغی ہوں" انکی ایسی باغیانہ تحریر ہے جسے جاوید ہاشمی کا قلم ہی تحریر کی صورت دے سکتا تھا۔ ناپختہ طلباء کی راہنمائی سے باشعور عوام کی قیادت تک وہ بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھ چکے ہیں۔ میری ان سے کوٹ لکھپت میں ملاقات ہوئی۔ انکے سیاسی بیانات ایک خاص اور جداگانہ اہمیت رکھتے۔ ملک کے نامور صحافی مجید نظامی ملتانی مٹی کے ماضی کے سیاسی کردار کی روشنی میں صحیح ہی کہتے ہیں کہ "ہاشمی جیل میں اپنے علاقے کے جاگیرداروں، وڈیروں اور مخدوموں کی اقتدار پرستی اور مصلحت پسندی کا کفارہ ادا کر رہا ہے جو کئی سالوں پر

Marfat.com

مرحوم نواب زادہ نصراللہ خان اور ہاشمی کے درمیان قہقہوں کا تبادلہ

محیط ہے"۔

وہ پیدائشی باغی ہیں انہیں بچپن میں اپنے والد نے ایک بار مولانا مودودی کی کتابیں پڑھنے پر گھر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ جاوید ہاشمی ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی بصیرت کے قائل ہیں انکا کہنا ہے کہ بھٹو اپنی قبر سے اپنی بیٹی کو دو مرتبہ وزیر اعظم بنوا چکے ہیں۔

یہ جولائی کی گرمی کے ایام ہی تھے جب 1949ء میں جاوید ہاشمی نے ملتان سے بارہ کلومیٹر دور ایک چھوٹے سے قصبے "مخدوم رشید" میں متوسط گھر کے اندر آنکھ کھولی۔ ہاشمی نے بتایا کہ یہ قصبہ تقریباً ایک ہزار سال قبل انکے جدامجد حضرت مخدوم عبدالرشید حقانی نے آباد کیا تھا۔ ان میں بچپن ہی سے باغی بننے کے آثار نظر آتے تھے۔ ہاشمی بتاتے ہیں کہ ہمارے گھریلو حالات کا دارومدار فصل کے اچھے ہونے پر تھا جب فصل خراب ہو جاتی تو ہمارے اوپر تنگی آجاتی۔ تاہم میرے والد نے مشکل ترین حالات میں بھی میری والدہ کو غریبوں کی مدد سے کبھی نہیں روکا۔ میں اسلامی جمعیت طلبہ کے پلیٹ فارم سے سیاست میں متعارف ہوا۔ نوجوانوں کو جاوید کا مشورہ یہ ہے کہ اپنی زندگی کا مقصد ضرور بنائیں، اپنے ضمیر، علم اور مشاہدے کی روشنی میں راستہ ڈھونڈیں اور اس پر چل پڑھیں۔

یہ شخص ملتان کے چھوٹے سے گاؤں مخدوم رشید کا "جاوید" ہے۔ ہاں! وہ جاوید ہاشمی جس نے صرف 9 سال کی عمر میں مزاحمتی زندگی کا آغاز کرتے ہوئے سربراہ مملکت کے حق میں نعرہ بازی کرنے کا اپنے استاد غلام فرید کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ تب سے آج تک اس نے بے شمار بار سسٹم سے بغاوت کا رسک لیا۔ اسے کون بتائے کہ:۔ وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں

جاوید ہاشمی اس مٹی سے بنا ہے جسمیں محنت، ہمدردی، انسان دوستی اور بغاوت کے عناصر گندھے ہوئے ہیں۔ مخدوم نے اس مقام تک آنے میں بڑے پاپڑ بیلے۔ سٹوڈنٹ لائف کے دوران ہی ان میں حق گوئی کی چنگاری موجود تھی۔ 71ء سے آج تک مختلف مقامات پر "سیاسی بدتمیزی" کا مظاہرہ کیا۔ درجنوں بار جیل گئے، زندہ رہنے اور زندگی کو خوبصورت بنانے کا جذبہ تو اس شخص میں بھی موجود ہے مگر وہ اس درخت سے کافی مماثلت

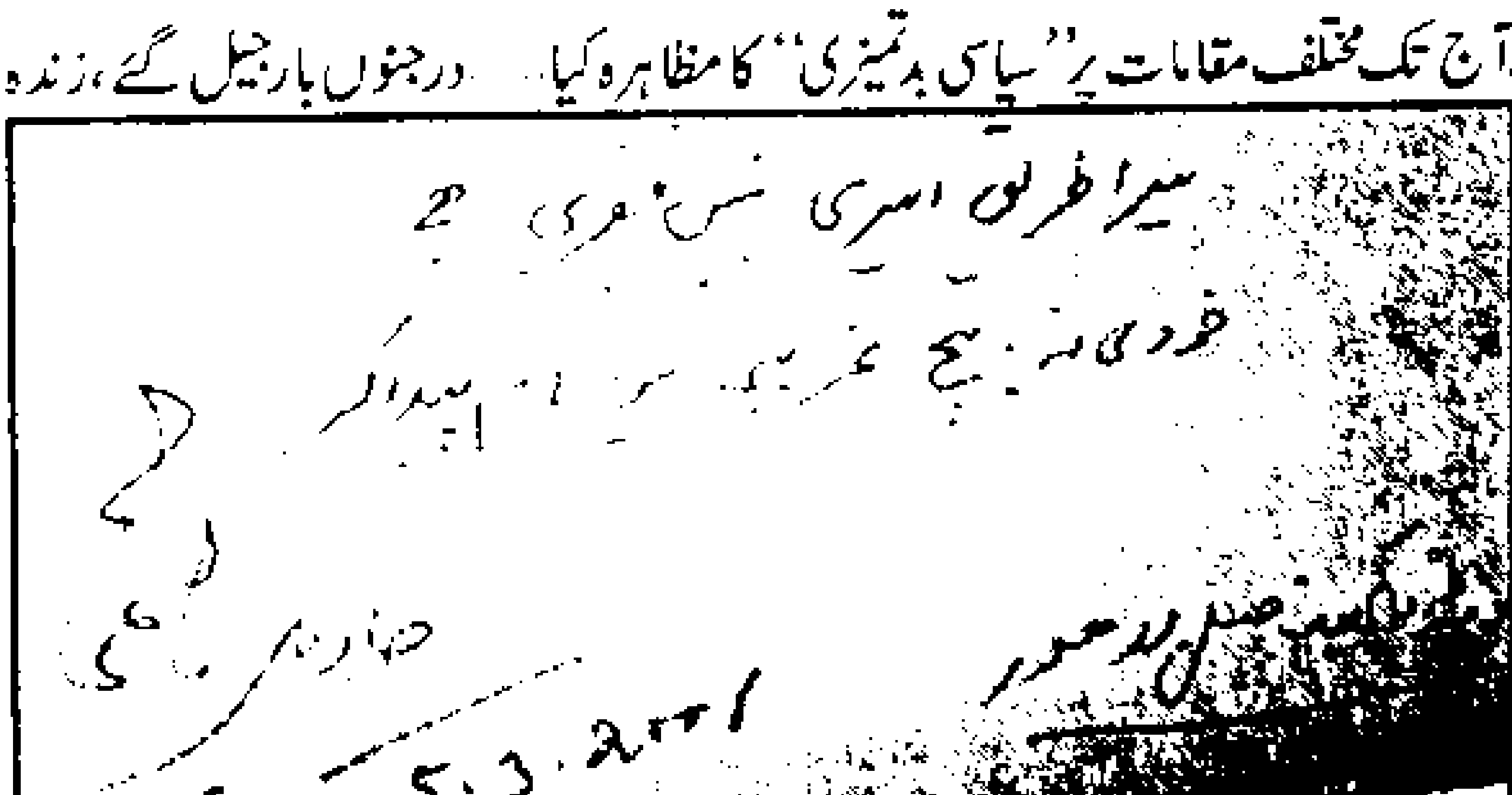

Marfat.com

مولانا فضل الرحمن اور جاوید ہاشمی، پس منظر میں چوہدری امیر حسین بھی عیاں ہیں

رکھتا ہے جسکی چھاؤں میں بیٹھ کر بے شمار لوگوں نے اپنی تھکن اُتاری اور وہ ذاتی طور پر سورج کی تیز شعاعوں میں اپنے آپ کو جلاتا رہا۔ پاکستانی حکمرانوں پر شدید تنقید کرنے کے حوالے سے مخدوم کے بیباکانہ اقدامات تاریخ کا حصہ ہیں اور جمہوریت کے لیے اس کا جنون قابل دید ہے۔

سابق وزیر اعظم نواز شریف کی فیکٹری اتفاق فاونڈری سے چند میٹر فاصلے پر واقع کوٹ لکھپت جیل لاہور میں ایام اسیری گزارنے والے عصر حاضر کے ''نامور باغی'' جاوید ہاشمی کے ساتھ موسم بہار میں کم و بیش ساڑھے تین گھنٹے ساتھ گزرے جہاں وہ جلاوطن نواز شریف کے سیاسی جانشین کے طور پر آزمائش سے گزر رہے ہیں۔ جب جیل میں داخل ہوا تو دیوار پر تحریر ''نفرت انسان سے نہیں جرم سے ہے'' کے دلکش جملہ نے استقبال کیا۔ حالیہ طویل قید کاٹنے کے باوجود جیل میں ہاشمی کو ہشاش بشاش اور پُرعزم دیکھ کر میں حیران ہوا۔ رنگوں بھری دنیا سے دوری انکے جذبات میں کی توانائی ہے مگر اب انہوں نے تلخ گفتگو کے بجائے اپنی تحریر میں جذبات کو منتقل کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ امر میرے لیے باعث حیرت تھا کہ تین گھنٹے کی اس نشست میں جاوید صاحب نے اپنی قید پر تبصرہ کرتے ہوئے حکومت کو تنقید کا نشانہ نہیں بنایا۔ بات چیت کے دوران انہوں نے کہا کہ مجھے انقلابی سرگرمیوں میں بہت نشیب و فراز سے گزرنا پڑا ہے۔ مخدوم ہاشمی نے کمرے میں آویزاں مختلف ادوار میں آنے والے جیل سپرنٹنڈنٹس کے ناموں کی تختی پر اشارہ کیا اور کہا کہ میری جدوجہد کا Short cut یہ ہے کہ اس لسٹ میں موجود پہلے سپرنٹنڈنٹ کے دور میں بھی میں یہاں موجود تھا اور آج بھی ہوں، مجھے ذاتی زندگی گزارنے کا کم ہی موقع ملا، کئی بار مجھے پس دیوار زنداں دھکیل دیا جاتا رہا مگر ہر بار میری آواز بلند تر ہوتی گئی، پھر دھیمے لہجے میں انہوں نے کہا کہ میں تخت و تاج کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر تختہ دار کے سائے تلے آ کر بیٹھ گیا۔

بقول صادق نسیم: ؎ تیرے تاج سے اُونچا ہوں میں کہ دار پہ ہوں
لگی ہے جان کی بازی تو کون دب کر رہے

اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل بشیر خان کے کمرے میں بیٹھے میں ان سے پوچھ لیتا ہوں کہ آپ جیل کیوں آتے ہیں؟ وہ بتاتے ہیں کہ میں اپنی رائے کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور اپنی اسی عادت کی وجہ سے جیل کاٹ رہا ہوں۔ سوچ کی طاقت اور قوت عمل مجھے ہر بار جیل بھجواتی ہے۔ بچپن میں ہی میرے اندر ایک بوڑھا شخص موجود تھا، میں اپنے بچپن میں جو سوچتا تھا آج اسکی جدوجہد کر رہا ہوں، بچپن، جوانی اور اب ڈھلتی عمر میں بھی جیل مقدر بنی ہے، یہ شوق ابھی ختم نہیں ہوا۔

مخدوم جاوید ہاشمی گفتگو میں ایسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں کہ سننے والے کو یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ اسکی

Marfat.com

ہی زبان بول رہے ہوں۔ اگر پاکستانی عوام کتابی معاشرے کے قیام میں کامیاب ہو گئے تو سماجی انقلابات قلم کے زور پر آنا شروع ہو جائیں گے۔ میں نے واپس اسلام آباد آ کر ہاشمی صاحب کی ملاقات کے احوال پر مبنی ایک کالم لکھا جسمیں واضح تجزیہ کر دیا تھا کہ اب میری ان سے ملاقات جلد جیل کی سلاخوں کے باہر ہوگی، اور چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آج 3 جولائی کو چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چوہدری کی زیر سربراہی تین رُکنی بینچ نے انکی ضمانت کا حکم جاری کر دیا ہے۔

مجھے جاوید ہاشمی کا یہ عمل اچھا لگا کہ انہوں نے اپنے تجرباتِ زندگی کی تقسیم میں بخل سے کام نہیں لیا بلکہ اپنی آپ بیتی ''ہاں میں باغی ہوں'' میں وہ تمام پہلو اُجاگر کر دیئے جو انہیں اس مقام تک لائے، اسمیں انسانی عظمت کے وہ نقوش واضح ہیں جسمیں مقصد، وفاداری عزم اور نا مساعد حالات میں بھی خوشی کے گیت گانے کا ولولہ تازہ ملتا ہے ...... انکی تحریروں میں مایوس لوگوں کیلئے اُمید کا رشتہ زندگی سے منقطع نہ کرنے کا درس ہے۔ ہاشمی صاحب مشاورت کو اہمیت دیتے ہیں انہوں نے اپنے بچپن کے دوست ذوالفقار بخاری اور میرے سامنے اپنی دوسری کتاب ''تختۂ دار کے سائے تلے'' کا فائنل مسودہ سامنے رکھ دیا جو چند دنوں میں شائع ہو رہی ہے ...... پھر اسکے کچھ حصے پڑھ کر سنائے ...... ''ہاں میں باغی ہوں'' کی نسبت مجھے انکی دوسری تصنیف میں انکے vision میں واضح وسعت نظر آئی۔ صحافت اور ادب کے تعلق پر انہوں نے کہا کہ بھائی! ''یہ صحافت تو ادب کو کھا گئی ہے''۔ ملاقات کئی حوالوں سے انوکھی رہی دوران ملاقات ہلکے ہلکے قہقہے بھی گونجتے رہے، سنجیدہ موضوعات بھی زیر بحث آئے۔ وہ تاریخ ساز ہونے کی دعویداری تو نہیں کرتے مگر تاریخ سازی میں بھرپور کردار ادا کرنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ میری سیاسی زندگی کے طویل سفر میں متعدد بار کٹھن مسائل اور آئے لیکن میں نے حالات سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا انہوں نے اپنی کتاب کے مسودے کا صفحہ اُلٹتے ہوئے کہا ...... یہ بھی ہاشمی صاحب کا کمال ہے کہ جیل میں بھی جس طرف جاتے ہیں ہلچل مچا دیتے ہیں، ہجوم میں لوگ راستہ چھوڑ دیتے ہیں، گفتگو کر رہے ہوں تو انہیں دیکھ کر خاموش ہو جاتے ہیں اور بیٹھے ہوئے لوگ انہیں دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو جاتے تھے۔ مخدوم ہاشمی کی بیٹی رکن قومی اسمبلی میمونہ ہاشمی بھی انکے جیل میں ہونے کے دوران سیاسی محاذوں پر لڑتی رہیں، انہوں نے اپنے علاقے میں ''میمونہ ویلفیئر ٹرسٹ'' کے پلیٹ فارم سے تعلیمی میدان میں بھی کافی کام کیا۔ میمونہ نے بہاوالدین ذکریا یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کر رکھا ہے۔

Marfat.com

میں نے حکمران جماعت کے سربراہ میاں اظہر کو واضح اکثریت سے شکست دی، صاحبزادہ جلیل شرقپوری

جنرل پرویز مشرف کے عہدِ صدارت میں ہونے والے پہلے عام انتخابات میں وزارتِ اعظمیٰ کے امیدوار میاں محمد اظہر کو حیرت انگیز شکست دے کر قومی اسمبلی تک پہنچنے والے صاحبزادہ جلیل احمد شرقپوری قومی اسمبلی کی نشست چھوڑ کر ضلع ناظم شیخوپورہ بن گئے۔ حالات کی تبدیلی نے تو انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا لیکن انکی طبیعت کے انداز میں تغیرات نہیں آئے۔ جلیل کے اوپر سیاسی ماحول اثر انداز نہیں ہوا، اسکے آس پاس طوفان اُٹھتے رہے، آندھیاں چلتی رہیں لیکن وہ ہمیشہ اپنے مخصوص انداز میں ان اندھیوں اور طوفانوں کا منہ پھیر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحبزادہ جلیل احمد شرقپوری سیاسی وادی میں اپنی ذہانت سے غیر معمولی کردار ادا کر رہے ہیں۔ جلیل احمد دین کو سیاست سے الگ نہیں سمجھتے اور اتحاد بین المسلمین کے داعی سمجھے جاتے ہیں۔ انکا تعلق پنجاب کے مشہور روحانی مرکز ''آستانہ عالیہ شرقپور شریف'' سے ہے جہاں سے شاعر مشرق علامہ اقبالؒ بھی عقیدت رکھتے تھے۔ میاں جلیل احمد نے زمانہ طالبعلمی میں ہی خانقاہ سے نکل کر رسم شبیری ادا کرنے کی آواز سنی تو طلباء کی رہنمائی شروع کر دی۔

بعض اشخاص ایسے ہوتے ہیں جن سے ہونے والی ایک ملاقات ہی اپنائیت کا ایک بھرپور احساس بخشتی ہے، جلیل احمد شرقپوری بھی انہی لوگوں میں سے ہے۔ 2002ء کے انتخابات کے نتیجے میں بننے والی اسمبلی میں وہ پہلی بار ممبر منتخب ہو کر آئے تو تب میری بھی صحافت میں آنکھیں کُھل چکی تھیں، ایک دن یونہی ایوان کی لابی میں گھومتے پھرتے ان سے ملاقات ہو گئی، پھر ملاقاتوں کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ آستانہ عالیہ شرقپور شریف کے سجادہ نشین حضرت صاحبزادہ جمیل احمد شرقپوری کے تین بیٹوں میں جلیل احمد آخری نمبر پہ ہیں۔ انکے سب سے بڑے بھائی صاحبزادہ خلیل احمد شرقپوری روحانی اعتبار سے پنجاب بھر میں عقیدت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، دوسرے صاحبزادہ سعید احمد شرقپوری دو مرتبہ رکن صوبائی اسمبلی رہے جو مریدین کی روحانی راہنمائی کے ساتھ گزشتہ 35 سالوں سے عوامی خدمت میں بھی مصروف عمل ہیں۔ سعید جب بولتے ہیں تو انکی آنکھیں سُننے والے کی توجہ، ذات اور خیال کو اپنے ساتھ یوں نانک لیتی ہیں کہ پھر علیحدہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور انکے الفاظ انسان کو غور و فکر کے سمندر میں دھکیل دیتے ہیں۔

Marfat.com

میاں جلیل احمد کے والد گرامی صاحبزادہ جمیل احمد شرقپوری

کل کے لائل پور اور آج کے فیصل آباد شہر میں بیٹھ کر میاں جلیل احمد نے بتایا کہ وہ چھ مارچ انیس سو باسٹھ کو پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم شرقپور شریف سے حاصل کی، چوراسی میں گریجویشن گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور سے مکمل کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے مکمل کیا۔ میں بچپن ہی سے سنجیدہ بچوں میں شمار کیا جاتا، شروع سے خواہش رہی ہے کہ ایسا کام کیا جائے جو معاشرے کو صحیح سمت لے جائے۔ میں طالبعلم راہنما کے طور پر لاہور کے تعلیمی اداروں میں قیام امن کیلئے جدوجہد کرتا رہا اور طلباء میں امن اور مقصد سے آشنائی کا شعور بیدار کرنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ جب طالبعلم تھا تو ایک سوچ تھی کہ اگر سیاست کرنی ہے تو اپنا بزنس ہونا چاہیے، چونکہ میرے خیال میں سیاست دولت کا ذریعہ نہیں۔ اس لیے میں نے اپنا کاروبار شروع کیا، اللہ پاک نے کامیابی دی۔ میرے بڑے بھائی صاحبزادہ میاں سعید احمد شرقپوری اسوقت سیاست میں متحرک تھے میری اس جانب آنے کی سوچ نہیں تھی۔ 2002ء کے انتخابات میں مجھے حادثاتی طور پر سیاست میں آنا پڑا اور پھر میرا مقابلہ وزارت عظمیٰ کے امیدوار سے تھا جنکی انتخابی مہم میں انتظامی مشنری استعمال ہو رہی تھی۔ لیکن مجھے نہ صرف میاں اظہر صاحب پہ نو ہزار نو سو ووٹوں کی برتری حاصل ہوئی بلکہ میرے مقابلہ کرنے والے پانچوں امیدواروں کا ووٹ ملا کر بھی مجھ سے کم بنتا تھا۔

سٹوڈنٹ سیاست سے متعلق پوچھے گئے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میں طلباء کی سیاست کے خلاف تھا لیکن جب ہم طالب علم تھے تو اسوقت طلباء تنظیمیں بہت متحرک تھیں، مجھے انجمن طلباء اسلام کے تنظیمی کام نے متاثر کیا شاید اس لیے کہ یہ سیاستدانوں کے ہاتھوں میں استعمال نہیں ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ میری زمانہ طالبعلمی میں ''اے ٹی آئی'' سے دیرینہ وابستگی رہی۔ میں نے اپنے بزرگوں کے کردار سے تکبر سے بچنا سیکھا، انہوں نے دنیاوی عہدوں سے انسانوں کی محرومیوں دور کرنے کی تلقین کی۔ والدین کی دعائیں اور رہنمائی نے ہمیشہ ساتھ دیا اور میں نے انکی دعاؤں کے سایے میں بے شمار کامیابیاں حاصل کیں۔ بچپن سے آج تک ہمیشہ وہ کام کیا جسکی تکمیل کی اُمید ہو۔ شروع سے خواہش رہی

Marfat.com

صاحبزادہ جلیل احمد ''زمینی ستارے'' کے لئے حسان علی عباسی کو انٹرویو دیتے ہوئے

ہے کہ میرا ہر اُٹھنے والا قدم اسلام، پاکستان اور غریب عوام کیلئے ہو۔

''آپ نے اسلام آباد کو چھوڑ کر شیخوپورہ کا انتخاب کیا، بتائیے یہ تجربہ کیسا رہا''؟ اپنے عہد ضلعی نظامت میں ہم نے ضلع شیخوپورہ میں طبی سہولیات کی فراہمی کیلئے مثالی اقدامات کیے، ضلع بھر کے ہسپتالوں کی ایمرجنسی میں مفت ادویات فراہم کرنے کا اہتمام کیا۔ کسانوں کو سہولیات دیں، سکولوں کے غیر حاضر اساتذہ کی حاضری کو یقینی بنانے کیلئے اقدامات کیے، کرپشن فری نظام لانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر اسمیں ہمیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی، ہم نے ضلع کی پولیس اور پٹواری کی کرپشن کو کافی حد تک ختم کر دیا اور اگر صحیح معنوں میں لوکل گورنمنٹ آرڈیننس پر علمدرآمد کروالیا جاتا تو یہاں کے اور بھی بہت سے مسائل کو حل ملتا۔ اپنی رکاوٹوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ بیوروکریسی بلدیاتی نظام کے ثمرات عام آدمی تک نہیں پہنچنے دے رہی، یہ آئیڈیل سسٹم ہے مگر کرپٹ سرکاری کارندے اس نظام کو اپنے فائدے کیلئے استعمال کر رہے ہیں۔ مقامی حکومتوں کے آرڈیننس میں جو اختیارات ضلع ناظم کو دیئے گئے عملاً وہ اسکے پاس نہیں۔ اس نظام میں بہتری کی گنجائش موجود ہے۔ اِس سسٹم پر پوری طرح عملدرآمد سے ہی خوشحالی کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میں پوری دنیا دیکھ چکا ہوں، جب بھی قوموں کی زندگی کا جائزہ لیا تو احساس ہوا کہ پاکستانی قوم دنیا کی بہترین قوم ہے مگر اسکی بدقسمتی یہ ہے کہ اسے آج تک قائداعظم کے بعد ساٹھ سالوں میں کوئی ایسا لیڈر نہیں ملا جو اسے صحیح سمت لے جاتا۔ اگر آج کے گمراہ نوجوانوں کو راہنمائی کے موتی میسر آجائیں تو یہ معاشرتی افق پر وقار مقام حاصل کر سکتے ہیں، لیکن یہاں ذاتی مفادات کے ٹکراؤ نے عوامی مفادات کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھ کر مستقبل کا لائحہ عمل مراتب کریں۔ حکمرانوں کو وجہ تخلیقِ پاکستان کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی پالیسیاں مراتب کرنی چاہیے۔ جب بات میاں صاحب کی پسند کی چلی تو انہوں نے کہا کہ میں مولانا عبدالستار خان نیازی کو پسندیدہ شخصیت مانتا ہوں، انکی حق گوئی اور جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے کی

Marfat.com

روش نے مجھے بہت متاثر کیا۔ صاحبزادہ جلیل احمد کی منفرد بات یہ ہے کہ وہ حکومتی حلیف ہونے کے باوجود کہتے ہیں کہ محسن پاکستان ڈاکٹر قدیر خان کی نظر بندی ہر پاکستانی کیلئے شرمندگی کا سبب ہے، ہم قدیر خان کو وہ مقام نہیں دے سکے جو دینا چاہیے تھا اور جلیل جمہوریت کے حوالے سے بھی دوٹوک مواقف رکھتے ہیں، اِنکا کہنا ہے کہ پاکستان کی بقاء جمہوری نظام میں ہی ہے، نصف صدی سے زائد عرصہ ہم نے گزار دیا مگر ہمارے ہاں آج تک ایسی حقیقی جمہوریت نہیں آسکی جو اسلامی اور عوامی اصولوں کے عین مطابق ہو۔ اپنی گفتگو کے دوران ایک موقع پر وہ کہنے لگے کہ ہر سیاستدان کو یہ سوچنا چاہیے کہ پاکستانی پہلے اور اسکی پارٹی بعد میں ہے۔ چونکہ سیاسی جماعتیں بھی پاکستان کیلئے ہیں، میں نے مسلم لیگ ''ن'' کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے الیکشن میں حصہ لیا۔ اس دوران مجھے پارٹی چھوڑنے پر وزارتوں کی بھی پیشکش ہوئی لیکن میں نے اپنی قیادت کی ہدایات کی روشنی میں قومی اسمبلی کے رکن کی حثیت کام کیا اور پیشکشوں کو ٹھوکر ماری۔ پھر جب میں نے محسوس کیا کہ ہم عوامی خوشحالی کے جو خواب لے کر اس ایوان میں آئے تھے وہ تو شرمندہ نہیں ہو رہے اور ہمارا قیمتی وقت ضائع ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں نے قومی اسمبلی کی نشست سے استعفیٰ پیش کر دیا اور پھر لوکل باڈیز کے غیر جماعتی انتخابات سر پر تھے میں نے مسلم لیگ ''ن'' سے اپنی وابستگی ختم کر کے ضلع کے جملہ متحرک سیاستدانوں کی ''ضلعی ناظم'' کی نشست پر الیکشن میں حصہ لینے کی پیشکش قبول کر لی۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ''ن'' کے ووٹوں کو غلط استعمال نہیں کیا بلکہ اس نشست سے اپنا استعفیٰ پیش کر کے ایک بار پھر عوامی عدالت سے رجوع کیا اور پھر اللہ کے فضل سے مجھے صوبہ پنجاب میں تمام ضلعی ناظمین سے زیادہ ووٹ ملے۔

Marfat.com

گانا شہد میں ملا ایک زہر ہے، جنید جمشید

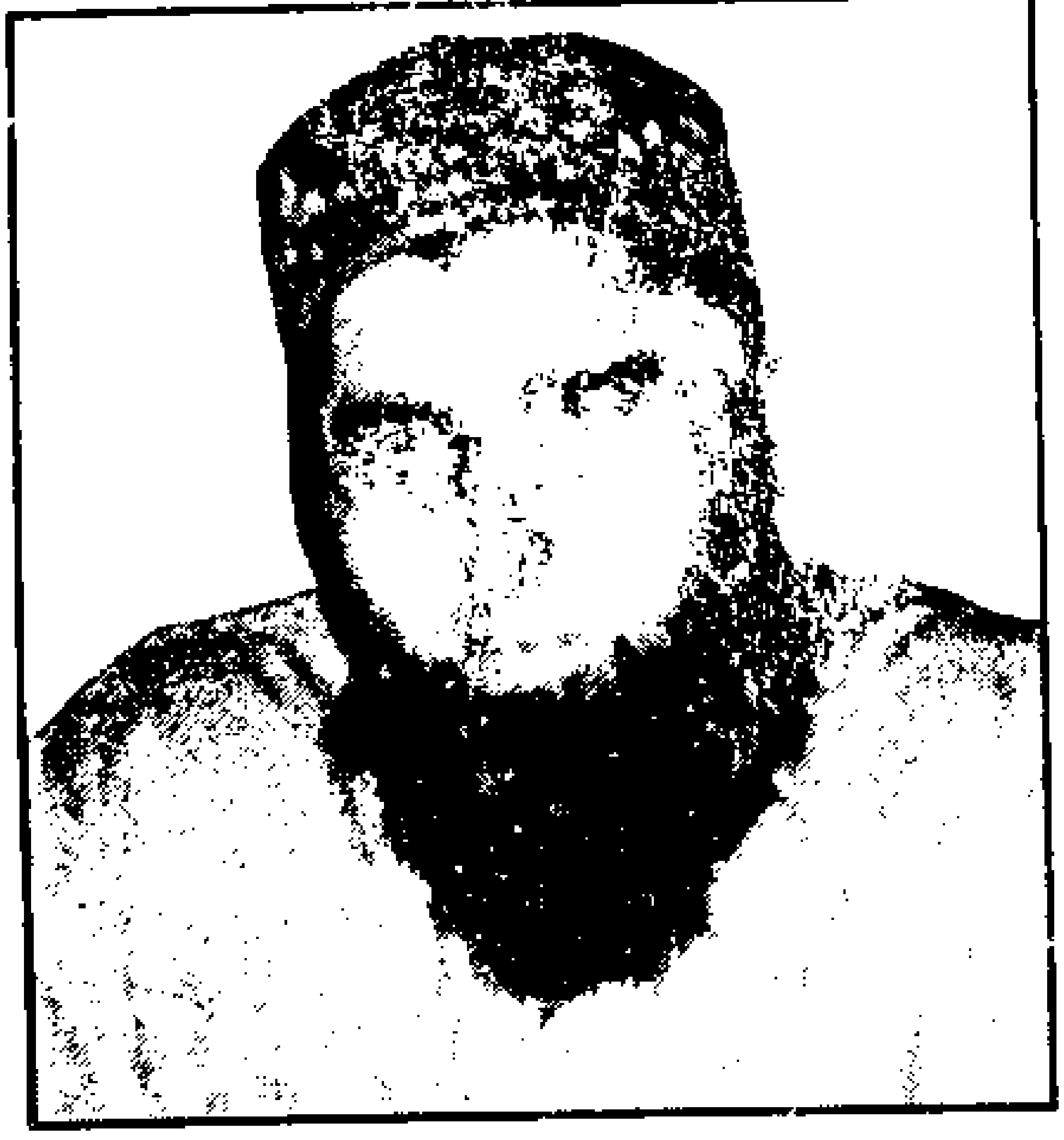

کبھی جنید جمشید کی آواز ہر طرف گونجتی سنائی دیتی تھی...... انسان کے زخموں کو اس طرح کریدتی کہ ہر دھڑکن میں ایک سکون اور چبھن کا احساس ہوتا، یہ آواز کرب کی ایک انوکھی لذت سے آشنا کراتی ...... اس خوبصورت اور سُریلی آواز کے سب معترف تھے ...... دکھ پیاروں سے بچھڑنے کا ہو ...... دیس یا گھر سے دوری کا ہو رنج بے بسی کا ہو یا تنہائی کی تکلیف ...... جنید کے لبوں سے نکلے الفاظ ہر دکھ سے ہم کلام ہوتے تھے۔ جنید کی آواز محرومیوں کی مصوری سمجھی جاتی تھی...... وہ موسیقی کے ''کارڈ'' پہ دنیا بھر کی سیاحت کرتا مگر سکون کے نوالے کو ترستا ہی رہا۔ جنید جمشید جذباتی لوگوں کے خون میں بجلیاں بھر رہا تھا کہ اچانک اسکے من میں ایک ایسا بلب جل اُٹھا جس نے اسکے اندر کی دُنیا بدل دی ...... اسے احساس ہوا کہ بس بہت ہو چکا...... وہ گھنی داڑھی سجا کر ٹخنوں سے اوپر شلوار کر کے گلوکاری سے کنارہ کشی کا نعرہ بلند کرتا ہے اور پھر تبلیغ اسلام کیلئے اپنے آپ کو وقف کر دیتا ہے، گانا بجانا سب کچھ بند کر کے ذکرِ الٰہی کو سینے سے لگا لیتا ہے۔

جنید جمشید اپنی کہانی سناتے ہوئے بتاتے ہیں کہمیں 3 ستمبر 1964ء کو پی اے ایف بیس مسرور کراچی میں پیدا ہوا۔ اپنے بہن بھائیوں ہمایون، منزہ اور عمر تینوں سے بڑا ہوں، میں نے مکینیکل انجینئرنگ کر رکھی ہے۔ والد جمشید اکبر پنجاب کے ضلع اٹک کے قصبے گوجرہ میں ایئر فورس کے ملازم تھے جو بعد میں ایئر کمانڈور کے عہدے پر سے ریٹائر ہوئے، ہم نسلاً پٹھان ہیں، میرے ڈیڈی نے ساری عمر اپنے بچوں کی اعلیٰ تربیت اور رزقِ حلال کا عملی سبق دیتے ہوئے گزاری۔ والد صاحب نے فوج میں ایک کامیاب کریئر گزارا، ملازمت کے دوران انہوں نے 65ء اور 71ء کی جنگیں بھی لڑیں، ہماری امی ''نفیسہ'' بھی ایک منفرد خاتون ہیں، انکا تعلق ہندوستان کی پرانی ریاست ''لوہارہ'' کے نوب خاندان سے ہے۔ ہمارے والد نے چونکہ اپنا بچپن بڑی جذباتی محرومی کے ساتھ گزارا تھا اس لیے وہ اپنی اولاد کو بھرپور توجہ فراہم کر کے اسکی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے گھر میں اس خاص ڈسپلنکی وجہ سے ایک فوجی کیمپ لگتا، ہم صبح 5 بجے بیدار ہو کر سکول کی تیاری کرتے، اٹھارہ برس کی عمر تک میں نے کھلی آنکھوں سے رات کے بارہ بجتے نہیں

Marfat.com

دیکھے۔سکول کی زندگی میں میری زیادہ تر دلچسپیاں پڑھائی کے بعد کھیلوں اور پھر تقریروں میں ہوا کرتیں 1980ء میں کراچی سے میٹرک کرنے کے بعد اپنی خواہش کے مطابق پاکستان ایئر فورس میں جی ڈی پائلٹ کیلئے اپلائی کردیا مگر نظر کمزور نکل آئی اور پائلٹ نہیں بن سکا۔جب طالبعلم تھا تو مذہب سے رشتہ صرف اسلامیات کا پرچہ حل کرنے تک محدود تھا۔ہمارے بچپن کے دوران ڈیڈی کی محدود تنخواہ پر گھر اور چار بچوں کی تعلیم کے اخراجات پورے کرنا عملاً ناممکن تھا،ایک فوجی کی اولاد ہوتے ہوئے بیٹ مین،سلیوٹ،ٹیپ ٹاپ،وردی،چمکتے رینک،شاندار میس یہ سب کچھ ہم نے گھر سے باہر ہی دیکھا ۔ایف ایس سی کے بعد میں نے گلوکاری شروع کردی،جب میری عمر انیس سال تھی تو ایکمرتبہ میری امی لندن جارہی تھیں تو تب بھی میں نے انہیں وہاں سے اپنے لیے گٹار لانے کا کہا۔پہلے گھر میں گانے کا شوق

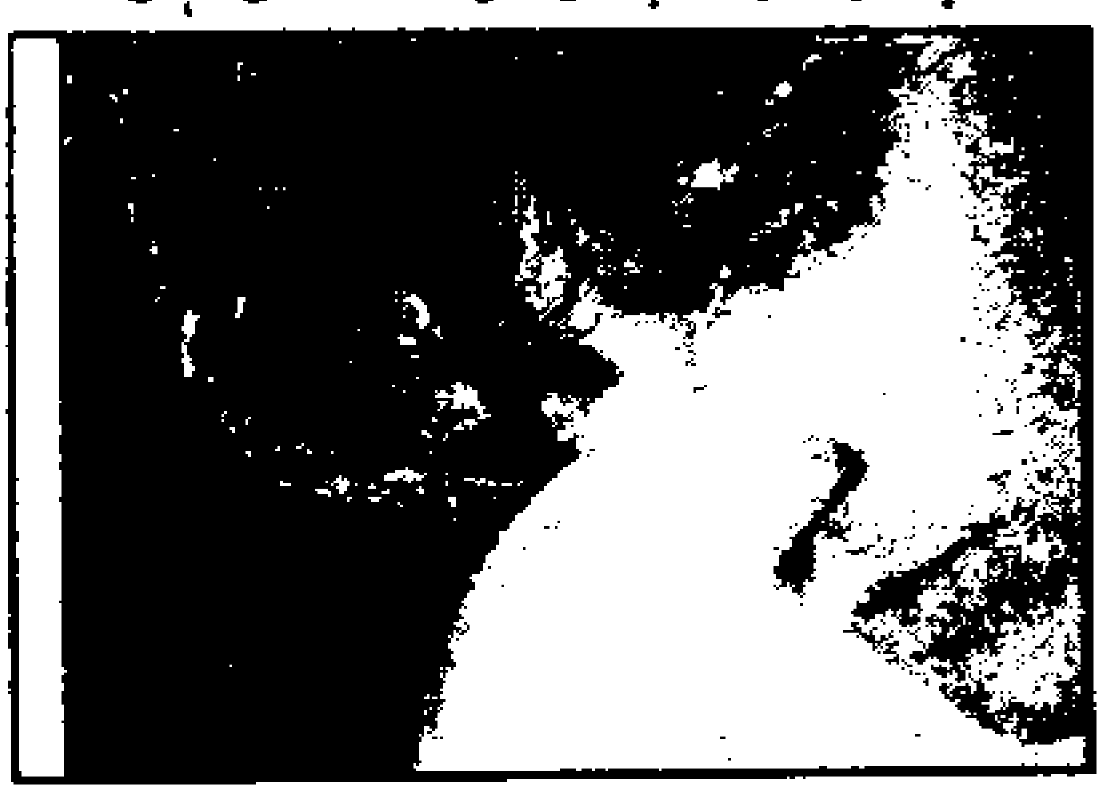

بھائی کو تھا،وہ گاتا اور میں گٹار بجاتا رہتا مگر پھر جب میرا بھائی کالج گیا تو میں نے بھی گانا شروع کردیا۔اسوقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میں اتنا بڑا گلوکار بن جاؤں گا۔اپنا میوزک گروپ بنانے کے بعد چھوٹے موٹے شوز کرنے شروع کردیئے۔چھوٹا بھائی ہمایون کالج میں تھا میں اسکی معاشی معاونت کرنا چاہتا تھا اور والد کا بوجھ بانٹنے کی بھی شدید خواہش تھی۔جب پروگرام شروع کیے تو سب سے پہلے اسلام آباد کے ایک ریستوران ''مسٹر چپس'' میں ساڑھے چار گھنٹے گایا،اسکے عوض ہوٹل کے مالک نے 1500 روپے دیئے۔کچھ عرصہ اسی طرح کام کرتا رہا پھر 1987ء میں ایک دن مجھے میرے ساتھی روحیل کا فون آیا کہنے لگا کہ'' جنید پی ٹی وی والوں نے ہم سے رابطہ کیا ہے کہ فوراً آجاؤ''۔یہ پی ٹی وی اکیڈمی کی ایک سٹوڈنٹ کا پروجیکٹ تھا جسکی آؤٹ ڈور ریکارڈنگ تھی۔اسکی تکمیل کے بعد ٹی وی پروڈیوسر شعیب منصور صاحب نے ہمیں ملنے کے لیے بلایا اور کہا کہ ایک قومی نغمہ ریکارڈ کرنا ہے۔میں نے حامی بھرلی۔اس کے بعد میری شہرت کے پھول کھلتے گئے،میرا ایک قدم ملک کے اندر اور دوسرا ملک سے باہر ہوتا۔میوزک کے ساتھ ساتھ میں نے پاکستانی ملبوسات کو نیا رُخ دے کر پیش کرنے کے لئے ڈریس ڈیزائننگ بھی شروع کی۔ہماری پراڈکٹس روایتی ہاتھوں سے بنی ہو تیں قمیض کرتے،شیروانی،واسکٹ کوٹ وغیرہ۔ہم اپنی بوتیک میں دولہا دلہن کا مکمل پیکج رکھتے۔میوزک گروپ ''وائٹل سائنز'' کا بانی جنید اب اپنے ماضی کا ان لفظوں میں رونا روتا ہے کہ'' میں ایسا گلاس تھا

Marfat.com

جسمیں کھارا پانی بھر گیا تھا بالآخر کھارا پانی میٹھا ہوگیا''۔اب وہ اشاعتِ اسلام کیلئے اپنے آپ کو وقف کر چکے ہیں۔جنید جب اس میدان میں اپنی خوبصورت آواز کے شعلوں کو استعمال کرتے ہیں تو بجھے دِل روشن ہو جاتے ہیں۔رنگین دنیا سے نکل کر نکلنے والی اسکی گھنی داڑھی بہت سے جنید جمشید پیدا کر رہی ہے۔جُنی کی زندگی کا مطالعہ کر کہ انسان میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس کے دِل کی حالت کب اور کیونکر بدل جاتی ہے یہ کوئی نہیں جانتا۔سجدے میں ملنے والا سکون بے مثال حثیت رکھتا ہے اور ہدایت اصل وہی ہے جو جوانی کے خوبصورت لمحات میں مل جائے۔اس کے اندر کی دنیا بدلتی ہے تو وہ گانے بجانے کو شہد میں ملا ایک زہر قرار دیتا ہے۔جنید جمشید کہتے ہیں کہ گائیکی کے عروج پر ابن خلدون اور علامہ اقبال کو پڑھنے سے ان پہ یہ حقیقت واضح ہوئی کہ''کسی بھی معاشرے کی تباہی میں سب سے بڑا ہاتھ موسیقی کا ہوتا ہے''۔دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے ابدی حیات تو مرنے کے بعد ملے گی اسلیئے ہمیں اسکی تیاری کرنا چاہیے۔''ابتدائے عشق'' سے متعلق انکا کہنا ہے کہ میری طبعیت میں ایسی شرارت تھی کہ تبلیغی جماعت والوں کا مذاق اُڑانے سے باز نہیں آتا۔نغمہ ساز و آہنگ میں ایسے گرفتار تھا کہ ایک قدم ملک کے اندر اور دوسرا باہر ہوتا،شہرت کی چمک مجھے سوچنے کے عمل سے دُور رکھتی رہی۔ایک دِن سخت گرمی میں گاڑی میں اے سی چلا کر سرگرم سفر تھا کہ اچانک روڈ پر ایک تبلیغی جماعت کو دیکھا جو شدید گرمی میں اپنا پیغام پھیلانے میں مصروف تھی،مجھے احساس ہوا کہ میں مال و دولت اور ناموری کیلیئے اے سی گاڑی میں جاتے ہوئے بھی نخرے کرتا ہوں اور یہ لوگ مال و متاع ہر چیز سے ماوَرا ہو کر اپنی جانوں کو آزمائش میں ڈالے ہوئے ہیں،مجھے خیال آیا کہ مجھ سے پہلے بھی ہزاروں گلوکار آئے۔یہ خیال دراصل مقصد حیات سے آشنائی کا میرے اندر ایک بیج ثابت ہوا اور انقلاب کی پہلی گھڑی ٹھہرا۔پھر میرے اندر ایک مثبت تبدیلی آگئی تو میں نے خوش گو ہونے کی نعمت کا استعمال تو جاری رکھا ہوا ہے بس سامع اور رُخ بدل دیئے ہیں۔آواز کے عطیہ سے پہلے دُنیا حاصل کی تھی اب اسے خالق حقیقی کے اظہار تشکر کیلیئے استعمال میں لاتا ہوں یعنی پہلے دُنیا کے گیت گاتا تھا اب اللہ کے گیت گاتا ہوں۔کرکٹر سعید انور کو میں دینی لائن پہ لایا اور یوسف یوحنا میری کوششوں سے محمد یوسف بنا۔جنید جمشید کی بیوی عائشہ کا کہنا ہے کہ میں نے جنید سے متاثر ہو کر ان سے شادی کی،پہلے بھی وہ اچھا لگتا تھا اور جب اس کے نظریات میں تبدیلی آگئی ہے تو اور اچھا لگنے لگا ہے۔خودکش حملوں کے بارے میں جنید جمشید کا مواقف ہے کہ اگر مسلمان خودکش حملوں میں ملوث ہیں تو یہ بہت افسوسناک ہے۔میرا دِل نہیں مانتا کہ خودکش حملے مسلمان کرتے ہیں چونکہ مسلمان ظلم کا جواب ظلم سے نہیں دیتا۔

Marfat.com

میں نے قومی ترانے کی دھن پر اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کی۔ جے سالک

جے سالک اس ملک کا شاید واحد وزیر ہو جو وزارت میں ہوتے ہوئے بھی ٹیکسی پر سفر کرتا رہا، جسکے پاس نہ اُونچا گھر ہے اور نہ ہی گھر کے باہر گاڑیوں کی قطار، بلکہ اسکے آگے پیچھے ''گیارہ نمبریے'' (دو پاؤں پر چلنے والے) ہی نظر آتے ہیں۔ ان ''محرومیوں'' کے باوجود جے عالمی شہرت کی حامل شخصیت ہے۔ سالک میں ایک ایسے اداکار کی صفات موجود ہیں جو ایک سے زیادہ کردار خوش اسلوبی سے ادا کرسکتا ہے اور کسی بھی کردار میں اپنے آپ کو گم کر دینے کا فن اسے خوب آتا ہے۔ اس نے عوامی مطالبات منوانے کیلئیو احتجاج کیے جنہیں ہر کسی نے [redacted] حیرت کی آنکھ سے دیکھا [redacted] حکمران پر بے حسی کا ''الزام'' لگاتا ہے اور بے حسی کا یہ تالہ توڑنے کیلئے کبھی سر میں خاک ڈالتا ہے، کبھی خون کے چراغ جلاتا ہے، کبھی پنجرے میں بند ہوتا ہے، کبھی بھوک ہڑتال اور کبھی انسانی حقوق کے صلے میں ملے اپنے ایوارڈز باہر پھینک کر گھر کے سامان کو آگ لگا دیتا ہے۔ انیس سو اُناسی میں وہ پہلی بار لاہور بلدیہ کا کونسلر منتخب ہوا، 83ء کے بلدیاتی انتخابات میں بھی جیتا...... پھر کونسلری سے ترقی کرتے کرتے 1988ء کے جداگانہ انتخابات میں قومی اسمبلی کی نشست پر 15439 ووٹ حاصل کر کے کامیاب قرار پایا، دوسری مرتبہ 53487 ووٹ حاصل کر کے پھر قومی اسمبلی تک پہنچا آیا، 93ء میں تیسری بار 83202 ووٹ لے کر ایم این اے منتخب ہو جاتا ہے اور 26 جنوری 1996ء کو جے سالک وفاقی وزیر بہبود آبادی کا قلمدان سنبھال لیتا ہے۔ شاید یہ دنیا کی پارلیمانی تاریخ میں پہلا شخص ہو جس نے خون سے اپنا استعفیٰ لکھ کر پیش کیا، اسمبلی میں زار و قطار رُویا، آسائشوں اور سہولتوں کو متعدد بار لات ماری۔ میں سالک کی سیاسی، ذاتی اور عوامی زندگی کے تناظر میں خصوصی انٹرویو کیلئے انکے گھر گیا جہاں ہر طرف آویزاں تصاویر اور در دیوار پر انسانیت کی خدمت کے اسباق سے بھرپور تحریریں نظر آتی ہیں۔

گرج دار لہجے میں مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ میں امن کے نوبل انعام کیلئے نامزد پاکستانی امیدوار ہوں، پانچ مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوا، وزیر رہا، 29 سالوں سے سیاست کی پرخار وادی میں اپنی منزل تلاش کر رہا ہوں۔ میں نے پاکستان کی اقلیتوں پر ظلم کیخلاف بارہ سال بوری کا لباس پہننا، عراق پر امریکی حملے کے خلاف امن کے نمائندے کے طور پر دنیا کے چکر لگائے، پیس پرفیوم کا آغاز کیا، افغانستان پر

Marfat.com

امریکی حملوں کے خلاف اپنے آپ کو پنجرے میں بند رکھا، توہین قرآن پاک پر احتجاج کرتے ہوئے کئی دن تک سر میں راکھ ڈال کر بیٹھا رہا اور میری خاکوبوں کو پیراشوٹ کی زرد اور گرم وردی سے نجات دلانے کیلئے جدوجہد کرنا ہر کسی کو یاد ہے۔

''آپ نے قومی سیاست میں کب اور کیوں قدم رکھا''؟ میں جب 1977ء کے مارشل لاء کے دور میں سیاست میں آیا تو بستی بستی قریہ قریہ گھومنے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ یہاں کیا مسلم کیا مسیحی کیا شہری کیا دیہاتی، کیا گورا کیا کالا سب مظلوم ہیں۔ یہیں سے میری قومی سیاست کا آغاز ہوا، اسکے بعد میں نے ہمیشہ کمزوروں، محکموں اور مظلوموں کے حقوق کی آواز اٹھائی اسکے لئے میں نے طریقے تو بہت سے اختیار کیے مگر مقصد ایک ہی تھا، خلق خدا کے دکھ سکھ میں شرکت اور انکے مصائب و مشکلات کم کرنے کی جدوجہد میری سیاست کا مشن ہے۔

''آپکی کوششوں سے پاکستانی عوام کو کیا ملا''؟ میں نے کرسچن مسلم اتحاد کا پلیٹ فارم قائم کر کے ان دو اقوام کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوششیں کیں جسکی وجہ سے پاکستان میں بھی کوئی عیسائی مسلم جھگڑا پیدا نہیں ہوا چھوٹے موٹے اختلافات ہوتے رہتے ہیں مگر کبھی بد امنی نہیں پیدا ہوئی۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی جانب سے ضبط شدہ شراب کی آمدنی اقلیتوں کی فلاح و بہبود کیلئے لگانے کی سفارش پر اظہار خیال کرتے ہوئے جے سالک کہتے ہیں کہ جب شراب کسی بھی مذہب میں جائز نہیں تو اسکی آمدنی کیوں اقلیتوں پر خرچ کی جائے، شراب کی آمدن اقلیتوں پر خرچ کرنے کی بات اقلیتوں کے ساتھ مذاق ہے ہم کبھی اسکی حمایت نہیں کریں گے۔ اپنے احتجاجی عمل پر بات کرتے ہوئے جے کہتا ہے کہ میں کسی کے کہنے پر احتجاج نہیں کرتا بلکہ بڑے مسائل کو مزید بڑا کرنے کیلئے احتجاج کرتا ہوں۔ میری پوری احتجاجی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیں ہر مظاہرہ غریبوں کی حمایت میں ملے گا۔ احتجاج کام تو پرانا ہے لیکن میں نے دنیا کی تاریخ میں اپنے وجود پر درد برداشت کر کے احتجاج کو ایک نیا رُخ دیا۔ درویشی اور بغاوت میرے لہو میں شامل ہے۔ میں نے زندگی میں صرف احتجاج ہی نہیں کیے بلکہ

Marfat.com

راکھ پر بیٹھے جے سالک سے ایک انٹرویو

وزیر بن کر خاکی لباس پہنا تاکہ خاکساری اور عاجزی کا عملی نمونہ پیش کر سکوں۔ میرے خیال میں بیوروکریسی کو عوامی خدمت کے جذبے سے سرشار کرنے کیلئے وردی فراہم کی جائے کیونکہ بیوروکریسی غریب عوام کے ٹیکسوں سے تنخواہ لیتی ہے۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ قومی سیاست کیلئے بی اے کی شرط کروڑوں انسانوں اور نظریہ جمہوریت کی توہین ہے۔ اکثریت جسے اپنا نمائندہ چننا چاہے اُسے چُننے کا اختیار ہونا چاہیے۔ میرا اور میری کلاس کا آدمی سمجھے گا، جاگیردار کیا سمجھے کہ سردی گرمی کس چڑیا کا نام ہے اس لیئے یہ لوگ ہمارے حکمران نہیں ہو سکتے۔ فوج کے کردار پر ان کا موقف ہے کہ فوج کو بیرکوں میں جانا چاہیے اور عوامی نمائندوں کو حکومت کرنی چاہیے۔

گفتگو کا رُخ موڑتے ہوئے انہوں نے انکشاف کیا کہ میں نے قومی ترانے کی دھن پر اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کی۔ اسمبلی کا رکن بنا تو سرکاری پلاٹ نہیں لیا چونکہ میں سمجھتا تھا کہ جب تک ہر غریب کو گھر نہیں مل جاتا مجھے پلاٹ لینے کا کوئی حق نہیں۔

بھٹو کی گرفتاری پر احتجاج کرتے ہوئے داڑھی بڑھائی اور قسم کھائی کہ بھٹو کی رہائی پر شیو کروں گا، مگر وہ رہا نہ ہوئے اور یہ داڑھی میری پہچان بن گئی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے نعرے روٹی کپڑا اور مکان کے پیچھے جو فلسفہ تھا وہ انسانی ضرورت اور نفسیات کو سامنے رکھ کر تراشا گیا تھا لیکن انکے حواریوں نے بھی اس پر عمل نہیں کیا۔ لیڈر بھٹو کی طرح ہونا چاہیے جو زمانے کو ساتھ لے کر چلے۔ آج ہمارا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے اور ہمارے حکمران بے حسی کی چادر اوڑھے ہیں۔ میرا احتجاج اسوقت تک جاری رہے گا جب تک انصاف اور مساوات کا بول بالا نہیں ہوتا، ظلم و ناانصافی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا اور جب تک مظلوم کی فریاد نہیں سنی جاتی تب تک میرا احتجاج میری موت تک جاری رہے گا۔

آپ نے اپنی کتاب کا نام ''پاکستان کی پہچان'' رکھ دیا، کیا یہ سچ ہے؟ دیکھیں! میرے حلقہ انتخاب پورا پاکستان ہے اسکے 33 ہزار پولنگ سٹیشن بنتے ہیں۔ میں عام آدمی ہوں اور آخری سانس تک عوام کی حقیقی حکمرانی تک جدوجہد کرتا رہوں گا۔ میں نے زندگی میں وفاداریاں نیلام نہیں کیں بلکہ خاک وطن کی اکثریت کی نمائندگی کی ہے۔ مجھے مذہبی ہم آہنگی کے باوجود امریکہ سے پیار نہیں چونکہ میرا عشق

Marfat.com

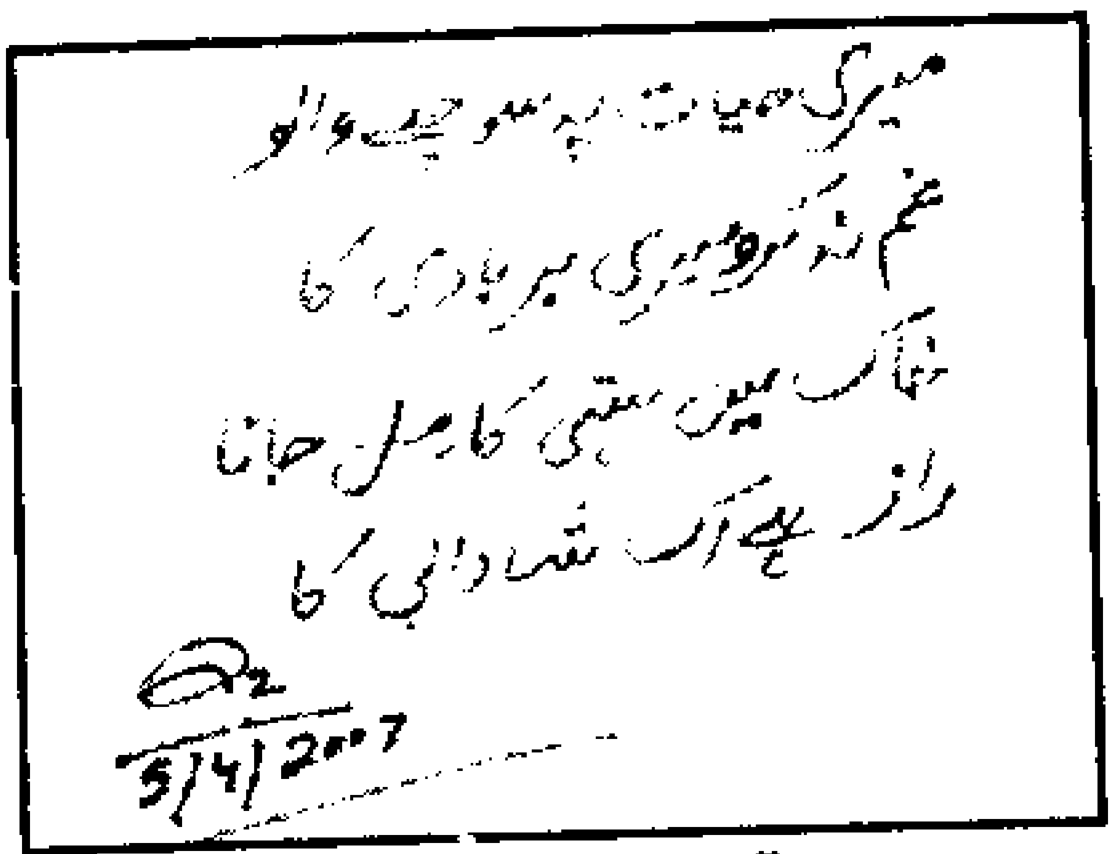

میری اولیت یہ وطن ہے۔ میرے بھائی اور والد کہتے تھے تم امریکہ میں آجاؤ! پاکستان میں بھوکے مروگے لیکن میں کہتا ہوں جینا مرنا پاکستان کے ساتھ ہے آج بھی اسی پہ قائم ہوں۔

آپ نے اپنے میڈلز، تعریفی اسناد اور تصاویر کو ایک موقع پر گھر سے باہر پھینک دیا تھا ایسا کیوں کیا؟ یہ سب مجھے مظلوموں کی حمایت کے باعث ملے تھے مگر ان مظلوموں کیلئے آج تک کچھ نہیں کیا گیا لہذا میں نے اِسکے خلاف احتجاج کے طور پر تمام میڈلز اور امن کیلئے خدمات کے عوض ملنے والی تعریفی اسناد گھر سے باہر پھینک دی ہیں تا کہ وہ جنہوں نے مجھے تو سب کچھ دیا مگر میرے کاز اور مقصد کو کچھ نہ دیا وہ یہ چیزیں اُٹھا کر لے جائیں، میرے اس اقدام کو بھی لوگوں نے ڈرامہ بازی سمجھا، ان میڈلز تعریفی اسناد اور نادر تصاویر کو برباد ہوتے دیکھ کر میرا دل جل تھا، چنانچہ میں نے انہیں اُٹھا کر ایک مرتبہ پھر گھر کے اندر رکھ دیا۔ مجھے نظر انداز ہونا پسند نہیں مگر اکثر نظر انداز ہوتا ہوں۔ اسلام آباد میں اقلیتوں کے مسائل پر بات کرتے ہوئے جے سالک نے کہا کہ حکومت کچی آبادیوں کے حقوق پر توجہ نہیں دے رہی جسکے باعث کچی آبادیاں بنیادی سہولیات زندگی کو ترس رہی ہیں۔ پوری کی پوری آبادی ایک میٹر سے بجلی استعمال کر رہی ہے۔ انہیں چھت کی فراہمی حکومتی ذمہ داری ہے۔

Marfat.com

حقیقت کی تلاش کا سفر "میر سویٹ ہاؤس" سے شروع ہوا

حامد میر کو "کیپٹل ٹاک" میں بے خوفی طنز کے نوکیلے تیر چلاتے اور بڑے سے بڑے ذہن سے ٹکر لے کر محفل میں چھا جانے کا ہنر اسے خوب آتا ہے۔ اسے کئی بار ایک زیرک وکیل اور بہادر جرنیل کی طرح سامنے بیٹھے لوگوں کو پسپا کرتا دیکھا۔ میر صاحب کو منظر کشی میں کمال حاصل ہے، بسا اوقات وہ کسی واقعے کو بیان کرتے ہیں تو آغاز ہی سے اسکا وہ پس منظر اور فضا تیار کر لیتے ہیں کہ ٹی وی کے سامنے بیٹھا ناظر پیش ہونے والے واقعے کی کیفیت کا بخوبی اندازہ لگا لیتا ہے۔ میر نے اپنی جوانی میں ہی ایسی بہت سی صحافتی کامیابیاں حاصل کر لی تھیں جنہیں پانے کیلئے بہت سے بزرگ ایڑیاں رگڑتے ہیں۔ اُسامہ کا ایک عدد انٹرویو ایک سادہ سا پروگرام انہیں شہرت کی بلندیوں پر لے گیا۔

کئی سالوں تک مجھے ان کے قریب جانے کی جرأت نہیں ہوئی...... قلم اور زبان کے اس مزدور کو میں نے مختلف لوگوں میں اُٹھتے بیٹھتے تو دیکھا مگر میں خود ان سے کم ہی بات کر پایا ہوں۔ باخبر حامد اپنے کیریئر کے صرف نو سال بعد ایک قومی اخبار کا کم عمر ترین ایڈیٹر بنا۔ اس شخص میں مشکلات پا کر جینے کی اُمنگ پہلے سے بڑھ کر پائی۔ جب حامد میر کے والد وارث میر مرحوم کی موت نے انکے ہاتھ سے قلم چھینا تو حامد وہ قلم پھر سے اُٹھانے کی جستجو میں روزنامہ جنگ جا پہنچا۔ پھر اسکا "قلم کمان" بہت ساروں کیلئے تلوار کی دھار بنتا گیا۔ اس نے جلتی آگ سے گزر کر عالمی طاقتوں کو مطلوب اسامہ بن لادن کے انٹرویو کی صورت میں وہ "صحافتی دھماکہ" کیا جس نے آج تک انہیں عالمی سطح تک میڈیا میں زندہ رکھا ہوا ہے۔ اس کے سوالات اور خیالات دوسروں کے لکھے نہیں ہوتے۔ حکومتی اور اپوزیشنی راہنماء سب اسکے سامنے بیٹھنا چاہتے ہیں۔

اپنے بارے میں بتاتے ہوئے حامد میر کہتا ہے کہ خاندانی لحاظ ہم تُرک النسل کشمیری ہیں۔ میرے والد ممتاز صحافی پروفیسر وارث میر کا تعلق سیالکوٹ سے تھا جبکہ دادا میر عبدالعزیز کشمیر کے علاقے بڈگام سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے تھے، ہمارے خاندان نے قیام پاکستان کی بنیادوں کو اپنا لہو دیا ہے، چونکہ میرے دادا اُردو، پنجابی اور فارسی کے اچھے شاعر تھے اسلیئے میرے والد مرحوم وارث میر کا علمی وادبی ذوق ہونا فطری امر تھا۔ میں 23 جولائی 1960ء کو مسلم ٹاؤن لاہور میں پیدا ہوا، پہلی سے آٹھویں

Marfat.com

جماعت تک تعلیم پنجاب یونیورسٹی کے بہاولنگر کیمپس سے حاصل کی۔ میری والدہ جذباتی گفتگو کیا کرتی تھیں اور میں سمجھتا ہوں کہ میری صحافتی زندگی میں انکی گہری چھاپ موجود ہے۔ میرے دادا زندگی کے آخری ایام تک سخت محنت کر کے روزگار کماتے رہے۔ سیالکوٹ کی رنگپورہ روڈ پر انہوں نے ایک طویل عرصہ "میر

ہنستا بچپن

سویٹ ہاؤس" کے نام سے مٹھائی کی دکان چلائی۔ اس دکان کی کمائی سے میرے والد نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ ابلاغیات کے صدر بنے اور زندگی کے آخری ایام میں روزنامہ "جنگ" میں "نوید فکر" کے عنوان کے تحت کالم لکھتے رہے۔ بچپن میں میرے والد نے مجھے ٹیپو سلطان کی سوانح عمری لا دی جو میں سکول میں پڑھتا تھا۔ میرے والد ایک بہادر صحافی تھے، جب نواز شریف پنجاب کے وزیر خزانہ تھے تو والد صاحب وقت پر لکھنے کیلئے کہا کرتے تھے ایک دن انہوں نے گاڑی کی چابی پیش کی اس روز جناح ہال میں تقریب تھی، جس میں نواز شریف مہمان خصوصی تھے جس میں میرے والد نے نواز شریف کو مخاطب کر کے کہا کہ "ہر دانشور اور قلم کار بکاؤ مال نہیں ہوتا، آپ گاڑی کی چابی دے کر قلم نہیں خرید سکتے" نواز شریف صاحب نے سٹیج پر آ کر معذرت کی اور خبر اخبارات میں بھی چھپی تھی۔

سکول زمانے سے ہی میں "نوائے وقت" اور "مشرق" کے بچوں کے صفحوں پر اپنی کہانیاں اور مضامین شائع ہوتے انکا موضوع اکثر قائداعظم، علامہ اقبال اور ٹیپو سلطان ہوتا۔ مجھے بچپن سے سر سید احمد خان بہت پسند تھے اس لیے کہ انہوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی جانب راغب کیا تھا۔ یہ شاید میری سر سید احمد خان سے بے حد محبت کا ثبوت ہی ہے کہ میں نے کم عمری میں ہی ان پر کتاب لکھنا شروع کر دی تھی، اس موضوع پر سو صفحے میں نے لکھ دیئے ایک دن میرے والد نے میری یہ کاپی دیکھ لی تو انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ سر سید احمد پر کتاب لکھ رہا ہوں اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے سر سید احمد پر مجھے کچھ کتابیں بھی لا دیں۔ 80ء میں نویں جماعت کا طالبعلم تھا جب پولیس سے پہلی بار مار پڑی۔ واقعہ یوں تھا کہ ایک بس ہمارے سکول کے ایک طالب علم کو کچل گئی تھی، ہم نے اس پر احتجاج کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ "سپیڈ بریکر بناؤ" یہ مظاہرہ میری زیر قیادت تھا، اسوقت پولیس والوں نے ہم ننھے مظاہرین کو دیکھ کر گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ہم اس پر غصے ہوئے اور "پولیس ہائے ہائے" کے نعرے لگانا

Marfat.com

حامد اور ان کے بھائی اپنے والد پروفیسر وارث میر کی گود میں

شروع ہو گئے۔ پولیس نے لاٹھی چارج شروع کر دیا، چھوٹی بڑی کلاسز کے بچے لاٹھی چارج کی شدت کے باعث بھاگ چکے تھے۔ ایک پولیس والے نے میرے سر پر ڈنڈا مارا، میں خون میں لت پت ہو گیا۔ لڑکے مجھے دیکھ کر غصے میں آ گئے، اس موقع پر میں نے پولیس کے بجائے جنرل ضیاء الحق کے خلاف نعرے لگوانے شروع کر دیے۔ میرے چہرے پر پٹی ہوئی تھی۔ اگلے روز ہیڈ ماسٹر رحمتی صاحب نے پوچھا کہ تم لوگوں نے مظاہرہ کیوں کیا؟ میں نے کہا کہ ہم سپیڈ بریکر بنانے کا مطالبہ کر رہے تھے اور پولیس نے ہمیں مارا۔ انہوں نے پوچھا کہ سیاسی نعرے کس نے لگوائے تھے؟ میں نے جواب دیا میں نے۔ انہوں نے وجہ پوچھی تو میں نے کہا کہ آپ جب ہمیں سکول میں زبردستی نماز پڑھاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جنرل ضیاء الحق کا حکم ہے لیکن اب ہم سکول میں نماز نہیں پڑھیں گے کیونکہ وہ نماز کا حکم تو دیتا ہے لیکن اس نے پولیس کو یہ نہیں سکھایا کہ بچوں سے کیسے بات کرنی ہے۔ پولیس والوں نے ہمیں گندی گالیاں دیں اس لیے ہم نے ضیاء کے خلاف نعرے لگوائے۔ ماسٹر صاحب کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ تمہارے والد صاحب سے شکایت کروں گا۔ میں باہر نکلا تو لڑکے پھر میرے پاس آ گئے اور کہا کہ یار! سپیڈ بریکر ابھی تک نہیں بنے، ہم نے ابھی ہار نہیں مانی ہم دوبارہ مظاہرہ کریں گے۔ ہم نے سڑک پر پھر مظاہرہ کیا اور اس دن امریکہ کے خلاف نعرہ بازی کی۔ میری چونکہ سیاست سے دلچسپی نہیں تھی اس لیے میری ''سیاسی جدوجہد'' اس سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ ادھر سکول میں کرکٹ کا سیزن شروع ہو گیا اور میری توجہ کرکٹ پر لگ گئی۔ میری شہرت کرکٹ کی وجہ سے تھی اور لڑکے مجھے ''ایلن بارڈر'' کہتے تھے۔ میں وکٹ کیپر بیٹسمین تھا۔ میرے یادگار کرکٹ میچ 87ء میں رمیض راجہ کی زیر قیادت لاہور کرکٹ ایسوسی ایشن کی طرف سے پیٹرز ٹرافی کے تھے، جس دن میرا پشاور میں قائداعظم ٹرافی کا پہلا میچ تھا اس دن میرے والد انتقال کر گئے اور میں پشاور نہ جا سکا۔ میرے والد 9 جولائی 87ء کو فوت ہوئے اسکے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اب مجھے کرکٹ نہیں کھیلنی، اب میں نوکری کروں گا۔ میرے بی اے کے رزلٹ کے بعد ایک دن ''جنگ'' میں ضرورت سب ایڈیٹر کا اشتہار چھپا، میں نے اس پر اپلائی کیا اور میرے والد کی وفات کے

Marfat.com

حامد میر ممتاز پاکستانی ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر قدیر خان کا انٹرویو لیتے ہوئے

چند ماہ بعد ہی مجھے روزنامہ جنگ میں بطور سب ایڈیٹر نوکری مل گئی، میں نے ''جنگ'' میں چھ برس خوب کام کیا۔ جنگ میں ملازمت کے دوران ہی میں نے ایم اے ماس کمیونیکیشن بھی مکمل کرلیا۔ روزنامہ جنگ چونکہ میرے لیے تربیت گاہ کی طرح تھی اس لیے مجھے اس اخبار سے جذباتی وابستگی تھی۔ لیکن ایڈمرل منصور کے ایٹمی ابدوزوں کے سیکنڈل کو جب میں نے بے نقاب کیا تو مجھے آصف زرداری کے کہنے پر جنگ سے نکال دیا گیا تھا۔ جب یہ بات قومی اسمبلی میں ایشو بنی تو تب کی وزیراعظم بےنظیر بھٹو نے مجھے ملاقات کیلئے بلایا، محترمہ کہنے لگی! حامد تم میرے بھائی ہو، انہوں نے زرداری سے کہا کہ اسے بحال کراؤ۔ چنانچہ زرداری نے میرے سامنے میر شکیل کو فون کیا اور یوں میں دو تین دنوں میں بحال ہوگیا۔ یہ ساری واقعہ میرے دل شکنی کا سبب بنا۔ میں جنگ چھوڑ کر ''پاکستان'' میں آگیا جہاں روزنانہ دوسرے صفحے پر میرا کالم ''قلم کمان'' چھپتا تھا۔ اس وقت میں کالم نگاری کے ساتھ ساتھ رپورٹر بھی تھا اسلیئے میرے کالم میں زیادہ خبریں ہوتی تھیں۔ مجھے 97ء میں آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی کی طرف سے بہترین کالم نگار کا ایوارڈ ملا۔ جیو ٹی وی میں شمولیت کے حوالے سے انہوں نے بتایا کہ مئی 2002ء میں ''جیو'' جوائن کیا۔ میں پاکستان اور اوصاف میں تھا تو میر شکیل الرحمن مجھے واپس آنے کا کہتے رہے لیکن میں نے انکی نہیں مانی۔ لیکن جب جیو کیلئے انہوں نے فون کیا تو اسکے لیے انکار کی گنجائش نہیں رہی چونکہ اس بار وہ مجھے اخبار کے بجائے ایک نئے ٹی وی چینل کیلئے بلا رہے تھے۔ اور جب جیو شروع ہوا تو میں اسکی ابتدائی ٹیم میں شامل تھا۔ اسلام آباد جیو کا دفتر میں نے خود بنوایا۔ آغاز میں جب ہم اپنے کیمرہ مین اور رپورٹر کو باہر بھیجتے تو پی ٹی وی کی جانب سے ہمیں شدید حوصلہ شکنی کا سامنا کرنا پڑتا۔ جیو ٹیم پر ایک سازش کے تحت انڈین ایجنٹ کہا گیا۔ ہمیں بہت سی مشکلات اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن ہماری ٹیم اس طرح کے ہتھکنڈوں سے مرعوب نہیں ہوئی۔

ایک سوال پر ان کا کہنا تھا کہ آج بھی اپنے آپ کو رپورٹر سمجھتا ہوں۔ ٹی وی میں آکر مجھے محسوس ہوا کہ اصل صحافت پرنٹ جرنلزم ہے لہذا میں نے اخبار میں اپنا کالم لکھنا بند نہیں کیا۔ اس دور میں بھی لکھے ہوئے لفظ زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ٹی وی پر ادا کیے گئے الفاظ میزبان کے منہ سے نکلتے ہیں اور ہوا میں تحلیل

Marfat.com

ہو جاتے ہیں لیکن جو لفظ قلم سے نکلتا ہے وہ ریکارڈ پر آجاتا ہے۔آپ دیکھیں کہ ''نیو یارک ٹائم'' اور ''واشنگٹن پوسٹ'' کے اداریے کی اہمیت ''سی این این'' اور ''بی بی سی'' کی خبر سے زیادہ ہے۔موجودہ حالات میں مجموعی طور پر پاکستان کی کالم نگاری بحران سے گزر رہی ہے،اچھا کالم نہیں لکھا جارہا۔یہاں اکثر کالم نگاروں کے کالم میں یک روکھا پن نظر آتا ہے۔میں نے اپنی صحافتی زندگی میں ہمیشہ ایک دائرے کو کراس نہیں کیا،چھوٹے چھوٹے جھوٹ بولے ہیں وہ سبھی بولتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کوئی ایسا کام انسان کو نہیں کرنا چاہئے کہ وہ اپنے سامنے مجرم بن جائے۔میں نے یہ سیکھا تھا کہ صحافی کی پارٹی نہیں ہوتی بلکہ نظریہ ہوتا ہے۔میرے والد جنرل ضیاء کی پالیسیوں کی سخت مخالفت کر رہے تھے اور اپنی وفات سے تین چار دن پہلے ہی انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ مجھے کسی نے چائے یا پانی میں زہر ملا کر دیا ہے کیونکہ میری طبعیت ٹھیک نہیں رہتی۔جب انکی وفات ہوئی تو انکے چہرے کا رنگ نیلا ہو چکا تھا۔میں انہیں ہسپتال لے گیا تو انکے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی،معاملہ ڈاکٹروں کی سمجھ سے بالاتر تھا۔جب ہم ہسپتال سے گھر لوٹے تو سارے شہر میں یہ خبر جنگل کی اگ کی طرح پھیل چکی تھی کہ وارث میر کا انتقال ہو گیا ہے۔سماجی کارکن عاصمہ جہانگیر اور حناء جیلانی نے کہا کہ انکا پوسٹ مارٹم ہونا چاہیے،میرے دادا جان اور میں نے بھی حامی بھری لیکن پنجاب یونیورسٹی کی انتظامیہ انکی میت ہم سے لے گئی یہ کہہ کر کہ انہیں غسل ہم دیں گے۔صبح ساڑھے آٹھ بجے میرے والد کی وفات ہوئی اور شام پانچ بجے انہیں دفن کیا گیا ہمیں پوسٹ مارٹم کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔اس لیے میرا موقف ہے کہ میرے والد نے فکر کی آزادی کی جنگ لڑتے ہوئے اپنی جان کی بازی ہاری۔میرے والد تمام عمر کرایے کے مکانوں میں رہے لیکن انہوں نے اُصولوں پر سمجھوتا نہیں کیا۔انکی وفات کے بعد ہم نے انکے پنجاب یونیورسٹی کے بقایاجات اور سیالکوٹ کی اپنی کچھ زمین بیچ کر فیصل ٹاؤن میں ایک گھر خریدا،اور اس پر اپنے والد کے نام کی تختی لگا کر ہم نے موت کے بعد انہیں صاحب جائیداد بنا دیا۔سنٹرل ماڈل سکول سے میٹرک،گورنمنٹ سائنس کالج وحدت روڈ سے ایف ایس سی کے بعد میں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے مکمل کیا۔کرکٹ کے علاوہ مجھے جو وقت ملتا تھا میں اسے ادبی سرگرمیوں میں گزار دیتا۔اپنے ماضی کے ورق پلٹتے ایک موقع پر میر بتاتے ہیں کہ میں نے حبیب جالب جیسے لوگوں کے درمیان آنکھ کھولی،یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ہمارے سامنے لاکھ روپے ٹھکرائے اور بھوکے مر گئے۔ایک بار عید الفطر پر انہوں نے فون کیا اور کہا کہ بیٹا:پانچ سو روپے کی ضرورت ہے ایک ایک سو کے پانچ نوٹ لے آؤ۔میں پانچ نوٹ لے کر گیا تو انہوں نے یہ اپنی بیٹیوں کو بلا کر یہ رقم بطور عیدی تقسیم کر

Marfat.com

دیئے۔اس دوران چوہدری شجاعت کے سیکرٹری صوفی انور وہاں آئے اور جالب صاحب کو ایک موٹا سا لفافہ دینا چاہا،صوفی صاحب نے کہا کہ چوہدری صاحب نے بچوں کیلئے عیدی بھیجی ہے۔جالب صاحب نے بڑی عزت کے ساتھ چوہدری ظہور الٰہی کی اولاد کیلئے دعا کر کے انہیں وہ لفافہ جسمیں وہ ایک لاکھ روپیہ لائے تھے واپس کر دیا۔میں بڑا حیران ہوا،چند دنوں بعد جالب صاحب نے مجھے پانچ سو روپے واپس کر دیئے۔''آپ اسامہ بن لادن تک کیسے پہنچے''؟ کے جواب میں حامد میر کہتے ہیں کہ میں مارچ 97ء میں مُلا عمر کے ذریعے پہلی بار اُسامہ بن لادن سے ملا۔ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے بعد جب میں اُسامہ بن لادن کے انٹرویو کیلئے ان سے دوبارہ ملاقات کی اور انکے ساتھ کھانا کھایا۔یہ کام اس قدر مشکل تھا کہ میں نے اسامہ کا سامنا کرنے سے پہلے موت کا سامنا کیا تھا،انٹرویو کے منظر عام پر آ جانے کے بعد بھی مجھے شدید مشکلات سے گزرنا پڑا۔اسامہ کا انٹرویو لے کر دفتر آیا اور اپنے چیف ایڈیٹر کو اس کا بتایا تو وہ پریشان ہو گئے،کہنے لگے کہ میر صاحب! آپ مروا دیں گے پھر انکی موجودگی میں دنیا بھر کے نشریاتی اداروں سے فون پہ فون شروع ہو گئے،ہر کوئی یہ آفر لگا رہا تھا کہ بولو کتنے پیسے لو گے۔اس انٹرویو میں اُسامہ نے نیویارک امریکی تجارتی مرکز پر حملے کے بارے میں خوشی کا اظہار کیا تھا اور دعویٰ کیا تھا کہ انکے پاس ایٹمی ہتھیار موجود ہیں۔اس گفتگو کی ایک خاص بات یہ تھی کہ 9/11 کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے بعد یہ اسامہ بن لادن کا کسی صحافی کو دیا گیا پہلا انٹرویو تھا۔اسامہ سے ہونیوالی اس بات چیت کی''ڈان نیوز''نے چالیس ہزار امریکی ڈالر قیمت لگائی،شرط یہ تھی کہ ہم ضمانت نہیں دیتے کہ سارا انٹرویو نشر کیا جائیگا یعنی اسکے کچھ حصوں کو حذف بھی کیا جا سکتا ہے۔یہ انٹرویو''ڈان''میں بھی شائع ہوا لیکن اسکی اشاعت سے پہلے رات ساڑھے دس بجے میں اپنے اخبار''اوصاف''میں پورا انٹرویو چھپوانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس انٹرویو کا ایک حصہ غائب تھا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی حکومتی شخصیت یا ادارے نے دباؤ ڈال کر یہ حصہ نکلوا دیا ہے۔اس انٹرویو کے بعد پاکستانی صحافیوں کی طرف سے مجھے عجیب و غریب رویے کا سامنا کرنا پڑا،افغان امور کے ماہر صحافی رحیم اللہ یوسفزئی کا دعویٰ ہے کہ پاکستان کے کسی اخبار نویس کو اسامہ بن لادن سے براہ راست انٹرویو کا موقع نہیں ملا اسکے جواب میں حامد میر کیا کہتے ہیں یہ پڑھتے ہیں۔کچھ صحافی اس کو من گھڑت انٹرویو اور تصاویر کو جعلی قرار دے رہے تھے لیکن جب بین الاقوامی میڈیا اور مختلف اداروں نے جب ان تصاویر اور ٹیپ کو چیک کیا تو انہوں نے اسکے اصل ہونے کی تصدیق کی اور اسے مختلف چینلوں نے نشر اور مستند اخبارات نے شائع کیا۔

Marfat.com

نوشہرہ کے قصبے زیارت کاکا صاحب سے اسلام آباد تک

مقتدر قوتوں کیلئے مسائل پیدا کرنے والے جتنے سیاستدان پاکستان میں سیاست کر رہے ہیں ان میں قاضی حسین احمد اپنے منفرد ایکشن کی بدولت کافی شہرت رکھتے ہیں۔ وہ سیاسی امور میں ''قاضی'' کا کام خوبصورتی سے کر جاتے ہیں۔ قاضی 1938ء میں نوشہرہ کے قصبے زیارت کاکا صاحب میں میں پیدا ہوئے، آپکے والد مولانا عبدالرب بھی مذہبی شخصیت تھے۔

جماعت اسلامی 1942ء میں قائم ہوئی اور قاضی صاحب اسمیں 28 سال بعد یعنی 1970ء میں شامل ہوئے۔ آپ نے جغرافیہ میں ایم ایس ای کر رکھا ہے۔ قاضی کو پشتو اور اردو کے علاوہ فارسی، عربی اور انگریزی پر بھی قدرت حاصل ہے۔ وہ ''اپنی مٹی پہ چلنے کا سلیقہ'' سیکھنے کا درس دیتے ہوئے مغربیت پر وار کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ جماعت اسلامی کے عام کارکن سمجھتا ہے کہ انکے جماعت میں آنے سے ''کارکنیت'' کو مزید عروج ملا ہے۔ قاضی حسین احمد کے والد قاضی محمد عبدالرب جمعیت علماء ہند کے صدر تھے، بڑے بھائی فیڈرل شریعت کورٹ کے جج بھی مقرر رہے۔

قاضی حسین اپنے ماضی کے گوشوں کو عیاں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے عربی دینی اور فارسی کی تعلیم پہلے حاصل کی اور بعد میں یونیورسٹی میں گیا، جغرافیہ میں ایم ایس سی کیا۔ تین سال تک پڑھاتا رہا بعد میں لیکچر شپ ترک کر کے عملی سیاست میں حصہ لیا۔ 18 سال سے جماعت اسلامی کا امیر ہوں اور برسوں سینٹ اور قومی اسمبلی میں موجود رہا۔ قاضی صاحبکا کہنا ہے کہ جب مجھے جماعت اسلامی کا امیر بنایا گیا تو میں ذمہ داری کے احساس سے کانپ اٹھا، ذہن پر بوجھ پڑا اور نیند غائب ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی کہ وہ مجھ میں اہلیت پیدا فرمائے۔ ہماری جماعتی تربیت یہ ہے کہ کسی منصب کی تمنا نہ کی جائے لیکن جب ذمہ داری سونپ دی جائے تو پھر اسکے تقاضے

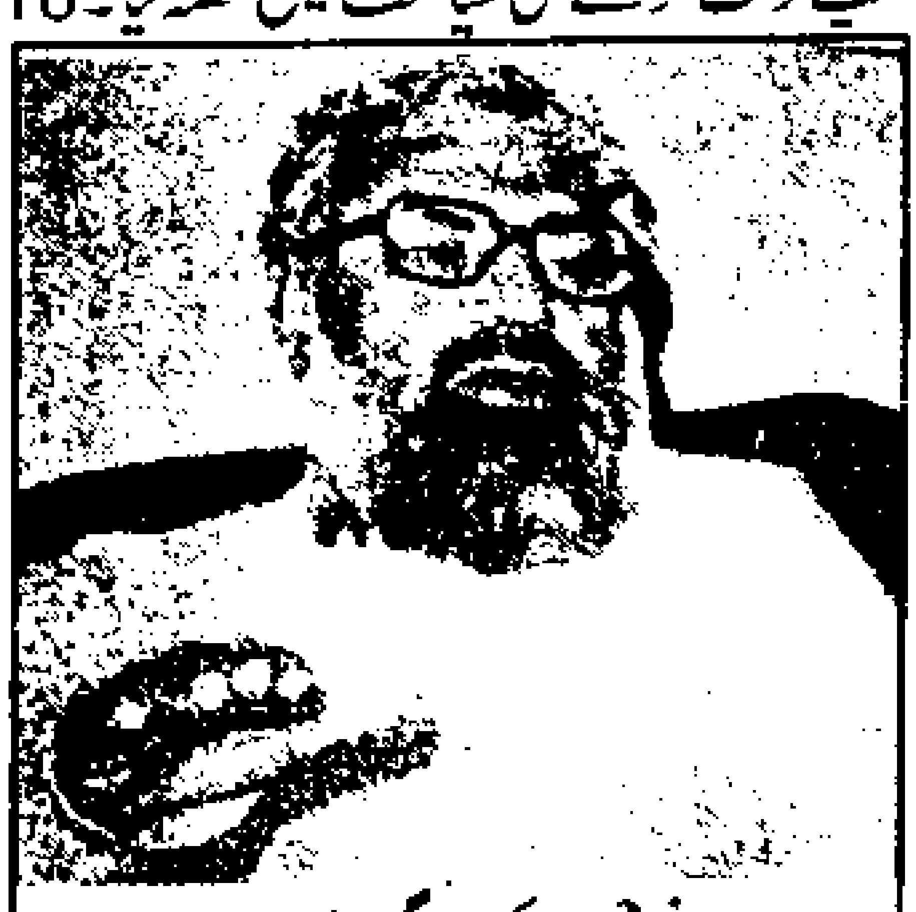

قاضی حسین کی زندگی کا ایک دور

Marfat.com

قاضی حسین اور مرحوم شاہ احمد نورانی کا ساتھ

پورے کیے جائیں۔ایک سوال کا جواب قاضی یوں دیتے ہیں کہ ''جماعت اسلامی'' ون مین شو'' نہیں،اسکا ایک نیٹ ورک اور دستور ہے، جماعت کا پالیسی ساز ادارہ ''شوریٰ'' قائم ہے''۔اسی طرح متحدہ مجلس عمل اس تحریک کا نام ہے جس نے قوم کے ہر طبقے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔اِس اتحاد سے انقلابی نتائج سامنے آئے ہیں۔مجلس کے وجود سے قبل مختلف مساجد میں خطبے، تقریر،اور وعظ ونصیحت کے دوران مختلف مناسک کے علماء کے درمیان چپقلش ہوتی تھی۔ایم ایم اے کی وجہ سے یہ چیز کافی حد تک ختم ہوگئی ہے۔اس تحریک سے سب کو ایک مشترکہ ہدف ملا ہے۔اُمت کے اتحاد کا یہ سلسلہ اگر چلتا رہا تو مسلمانوں کے اندر جو مصنوعی دیواریں کھڑی ہیں وہ گر پڑیں گی۔

قاضی حسین احمد کا یہ بھی مواقف ہے کہ جاگیردارنہ قیادت کی بنیادوں کے خاتمہ کے لیے قوم کو بیدار ہو جانا چاہیے۔ملک میں مہنگائی اور کرپشن ایک محدود طبقے کی وجہ سے ہے،ہمارے ملک میں مسائل سے زیادہ وسائل موجود ہیں مگر ہمیں آج تک ایک ایسا شخص نہیں ملا جو یہ ثابت کو سکے،مخلص قیادت ہی پاک مٹی کو سونا بنا سکتی ہے۔ہمیں اسلامی نظام کو کامیابی کیلئے جدو جہد کرنی چاہیے،اسمیں کامیابی ہماری عارضی اور ہمیشہ رہنے والی زندگی کیلئے بہتری کا سبب بنے گی۔

Marfat.com

گلگت میں امن کی بانسری بجانے کیلئے میرے بھائی نے جان کی قربانی دیدی: حفیظ الرحمٰن

28ہزار مربع میل پر مشتمل پاکستان کے شمالی علاقہ جات جغرافیائی لحاظ سے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں، کئی اضلاع پر مشتمل اس علاقے میں گلگت اسلام آباد کا درجہ رکھتا ہے۔ اسے پاکستان اور چین کے درمیان جاری تجارت کا سب سے بڑا راستہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں سے منتخب رکن قانون ساز اسمبلی نوجوان حافظ حفیظ الرحمٰن ہیں جنہیں پاکستانی قوم تو کم کم ہی جانتی ہوگی لیکن وفاق کے زیر انتظام چلنے والے شمالی علاقہ جات کا شاید ہی کوئی بچہ ہو جو حفیظ سے واقف نہ ہو۔

ایم ایل اے حفیظ الرحمٰن اپنی جدوجہد سے آگاہ کچھ اسطرح کرتا ہے۔ میں 12 ستمبر 1972ء کو گلگت میں پیدا ہوا۔ بچپن کا عہد لاشعوری سارہا، ٹاٹ سکولوں میں پڑھا جہاں بارش گرمی اور سردی میں چھٹی ہو جاتی۔ یہاں سے ساتھیوں جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں لاہور ''اشرافیہ'' میں منتقل ہو گیا۔ یہاں سے حفظ مکمل کیا، درس نظامی اور شہادۃ العالمیہ کی ڈگریاں لیں۔ مدارس کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے بھی مکمل کیا۔ ہمارے اجداد سری نگر سے تعلق رکھتے تھے جو 1750ء میں گلگت آئے۔ والد حاجی عبدالعزیز تجارت کے پیشے سے وابستہ رہے۔ میرا چھوٹا بھائی مجیب الرحمٰن کار حادثے میں فوت ہو گیا جبکہ بڑے بھائی شہید سیف الرحمٰن 19 مارچ 2003ء کو اس فرقہ واریت کی نذر ہوئے جسکے خلاف انہوں نے عمر بھر جنگ لڑی۔ وہ صرف ایم ایل اے تھے مگر انکی شمالی علاقہ جات کے ہر ضلع میں مقبولیت تھی، انہیں ''شہید امن'' کا خطاب ملا اور وہ ''سفیر امن'' اور محسن گلگت بھی کہلائے۔ میں کاروبار میں تھا اور ناردرن ایریا چیمبرز آف کامرس کے نائب صدر کے طور پر بھی کام کرتا رہا مگر بھائی کی شہادت کے بعد مجھے لوگوں نے کہا کہ آپ الیکشن لڑیں۔ میرا سیاست میں اُترنا خاندان، دوستوں، پارٹی اور ہر ایک کا فیصلہ تھا۔ اسطرح میں نے اپنے بھائی کی جلائی ہوئی شمع کو روشن رکھنے کیلئے 10 جون 2003ء کے ضمنی انتخابات میں حصہ لیا اور مجھے بھاری اکثریت سے کامیابی ملی۔ میری سیٹ گلگت ہیڈ کوارٹر کی اہم نشست تھی اس لیے یہاں الیکشن میں میرے خلاف سرکاری وسائل بھی استعمال ہوئے مگر مخلص دوستوں، کارکنوں اور سپورٹروں نے اپنی ووٹ کی طاقت سے مجھے ہی اپنا ایم ایل اے منتخب کیا۔

میں سٹوڈنٹ لائف میں جمعیت طلباء اسلام پاکستان کا مرکزی نائب صدر تھا اور میں شاید

Marfat.com

حفیظ الرحمٰن ناردرن ایریا ہاؤس میں جناب علی عباسی سے گفتگو کر رہے ہیں

واحد سیاستدان ہوں جس نے 12 اکتوبر 1999ء کے فوری بعد میاں محمد نواز شریف کی جماعت میں شمولیت اختیار کی، چونکہ میری نظر میں نواز شریف نے پہلی بار اداروں کی بالادستی کی کوشش کی تھی، نواز کاروباری ضرور تھے مگر پاکستانی عوام کے حوالے سے انکی سوچ کاروباری نہیں تھی۔ اپنی اس بات کی دلیل حفیظ الرحمٰن یہ دیتے ہیں کہ اگر میاں نواز بزنس مائینڈ ہوتے تو 12 اکتوبر کو وہ جرنیلی حکومت کو تسلیم کر کے اپنی صنعتیں وغیرہ سب کچھ بچا لیتے مگر انہوں نے اصولوں کو ترجیح دی۔ ایک سوال پر اُن کا کہنا تھا کہ وفاداریاں بدلنے والوں کا کیا ہے وہ تو اگر پاکستان میں انگریزوں کی حکومت بنے تو اس کے ساتھ بھی چلے جائیں گے۔

ہمارے شہر گلگت ناردرن ایریا کا مرکز ہے مگر اسکی تاریخ شیعہ سنی فسادات سے بھری پڑی ہے 94ء میں جب سیاسی پارٹی ایکٹ کے تحت الیکشن ہوئے تو میرے بھائی نے پاکستان مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے انتخابات میں حصہ لیا اسوقت انکا نعرہ تھا کہ ''سینے پر گولی کھائیں گے، امن کو بچائیں گے'' اور وقت

نے اس نعرے کو حقیقت میں تبدیل کر دیا۔ گلگت میں قیام امن کیلئے میرے بھائی نے جان کی قربانی دی اور ہماری برادری کے سات افراد کو شہید کیا گیا۔

''ماضی میں آپ کے علاقے میں انسانی جانیں کیوں ضائع ہوئیں''؟ ماضی میں ہونیوالے فسادات کی بنیادی وجہ غیر جماعتی الیکشنز اور غیر نمائندہ حکومتیں تھیں، کیونکہ غیر جماعتی الیکشن میں لوگ مسلک، برادری اور ذات کی بنیاد پر ووٹ دیتے، ایک شیعہ اور

ایک سنی کھڑا ہوتا تو پھر الیکشن نفرتوں کی آگ میں بدل جاتے۔ ہمارے بھائی نے پارٹی کے منشور پر الیکشن لڑا اور وہ کافی حد تک امن وامان برقرار رکھنے میں کامیاب بھی ہوئے تھے۔ میری زندگی کا مشن شمالی علاقہ جات میں مکمل قیام امن اور اس علاقے کے لوگوں کو قومی دھارے میں شامل کروانا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں

Marfat.com

حفیظ الرحمٰن کا کہنا تھا کہ میں نے اپوزیشن میں رہتے ہوئے بھی اپنے حلقے میں اتنے ترقیاتی کام کروائے جو قیام پاکستان سے آج تک نہیں ہوئے۔

جب گفتگو کا تسلسل رُک گیا اور ہمارے پاس کرنے کو کوئی بات نہیں رہی تو حفیظ الرحمٰن گویا ہوئے کہ بھائی! ازمین کا ایک الگ حصہ ''پاکستان'' ہم نے اسلام کے نام پر حاصل کیا مگر جن لوگوں نے بھی آج تک اس پر حکومت کی اُن میں سے اکثر انگریزوں کے پیروکار ہیں، جاگیردار اور سرمایہ دار ہیں جو سماجی انصاف کے نظام کا کسی بھی صورت نفاذ نہیں چاہتے۔

Marfat.com

حکمرانوں کے خلاف بے خوف لڑنے والا "کمزور" آدمی

ڈاکٹر عبدالحیٔ جیسی شخصیتیں کسی بھی عہد میں کم ملتی ہیں جو ایک ہی وقت میں مالی لحاظ سے کمزور بھی ہوں لیکن حکمرانوں کے خلاف بے خوف کئی محاذوں پر لڑیں۔ طویل پُر مشقت اور گونا گوں زندگی گزارنے والے بلوچستان کے قوم پرست راہنماء عبدالحیٔ بلوچ ضلع بولان کے گاؤں "دچھل گری" میں یکم فروری انیس سو پینتالیس کو ایک کسان پیر بخش کے گھر پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر میں والد کی سرپرستی کے سایے سے محروم ہو گئے۔ مقامی سطح پر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ جب اپنے تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھنے کیلئے کراچی کے ایک میڈیکل کالج میں داخل ہوئے تو وہاں طلباء سیاست عروج پر تھی، ڈاکٹر الحیٔ نے بلوچ سٹوڈنٹ آرگنائزیشن کی رکنیت حاصل کی۔ ایک متحرک کارکن ہونے کے ساتھ ساتھ وہ فن تقریر کے بھی ماہر تھے۔ جماعتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور انہیں فعال دیکھ کر بلوچ سٹوڈنٹ آرگنائزیشن "بی ایس او" پاکستان کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ انہوں نے بی ایس او کا نہ صرف ملک بھر میں تعارف کروایا بلکہ انہوں نے اسوقت ایوب خان کے خلاف بھی بھرپور آواز اُٹھائی۔ 71ء میں ڈاؤ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس مکمل کرنے کے بعد انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست پر انہوں نے خان آف قلات کے صاحبزادے پرنس یحیٰ بلوچ کو شکست دی۔ اسوقت حیٔ کی عمر پچیس سال تھی اور وہ سب سے کم عمر ایم این اے تھے۔ اب وہ طلباء سیاست کا حصار توڑ کر ملکی مرکزی سیاسی دھارے میں شامل ہو گئے۔ انہیں ذوالفقار علی بھٹو دور اقتدار میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی رہنا پڑا۔ گاڑیوں کی لفٹ لے کر سیاست کرنے والے اس فقیر نے یہ بات غلط ثابت کر دی کہ سیاست کرنے کیلئے کروڑوں روپے مطلوب ہوتے ہیں۔

فقیری میں امیری کا لطف اٹھانے والے ڈاکٹر حیٔ بتاتے ہیں کہ میں نے جس گھر میں آنکھ کھولی اس گھر کے حالات بہت تلخ تھے، اسوقت گڑ کی چائے عیاشی تصور کی جاتی۔ ان مشکل ایام سے سبق سیکھ لیا تھا جو ابھی کام دے رہا ہے۔ میرے کردار میں میری والدہ کی جھلک نمایاں ہے انہوں نے حرص و ہوس کا درس نہیں دیا بلکہ مظلوموں کا ساتھ دینا سکھایا۔

طب کے میدان میں کام کرنے کے میں نے سیاست میں بلوچ عوام کی خدمت کا فیصلہ کیا، کیونکہ بلوچی عوام کو جسمانی بیماریوں سے شفاء پانے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی بڑے صوبے کے لگائے گئے

Marfat.com

زخموں کی مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔ پنجابی حکمرانوں اور سیاستدانوں نے بلوچستان کے عوام کے دکھوں اور محرومیوں میں اضافہ کیا۔ پنجاب کی آبادی کے پھیلاؤ اور قومی اسمبلی میں اسکی زیادہ نشستوں نے دیگر صوبوں کو محرومی دی ہے۔ ہم اگر شکوہ کرتے ہیں تو پنجاب کے بالا دست طبقے کے بارے میں کرتے ہیں جن سے وہاں کی مظلوم بھی خائف ہیں۔

''یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ میں نے کہہ دیا ڈاکٹر صاحب! وفاق کی کچھ شخصیات کے موقف پر کیا آپ کو بھی یہ احساس ہوا کہ قوم پرست پاکستان کی وحدت کو نقصان پہنچا رہے ہیں''؟ بلوچ غصے میں آ گئے اور انہوں نے کہا وفاق کی وحدت کو قوم پرستوں سے زیادہ اپنا حلف توڑنے والے غیر آئینی حکمرانوں نے پہنچایا ہے۔ گولی کی زبان سے مسائل کا حل نہیں نکلتا۔

''آپکی ''نیشنل پارٹی'' صرف بلوچستان تک ہی محدود کیوں ہے''؟ اب ہم بلوچستان سے نکل کر پنجاب کی جانب بھی آ رہے ہیں اور اسی طرح ملک بھر میں تنظیم سازی کریں گے۔ ہمیں اُمید ہے کے ملک کے دردمند شہری ہماری آواز میں اپنی آواز شامل کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ بلوچستان کا کوئی سیاستدان نہ بھارت سے پیسے لیتا ہے اور نہ ہی اسکے اشاروں پر ناچتا ہے۔

جنرل مشرف کے سات نکاتی ایجنڈے میں یہ بات شامل تھی کہ قومی وحدتوں کے درمیان دوریوں کو کم کیا جائے گا لیکن عمل اسکے برعکس ہے۔

یہ بات غلط ہے کہ اکبر بگٹی گیس کی رائلٹی وصل کرتے تھے، انہیں تو انکی زمین سے جو پائپ لائن گزرتی تھی اسکا کرایہ ملتا تھا۔ باقی رائلٹی ہمیشہ صوبائی حکومت وصول کرتی ہے، لیکن وہ بھی اب نہیں مل رہی۔ نواب اکبر بگٹی سے آپ لاکھ اختلافات کر سکتے ہیں لیکن اس اسی سالہ بزرگ کو اسکے گھر سے بے گھر کیا گیا، ان پر گولے پھینکے گئے اور انہیں شہید کیا گیا۔ اسطرح کے اقدامات سے عوام میں حکمرانوں کیلئے مزید نفرت پیدا ہوئی ہے۔ انکی موت ہماری تاریخ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اکبر بگٹی

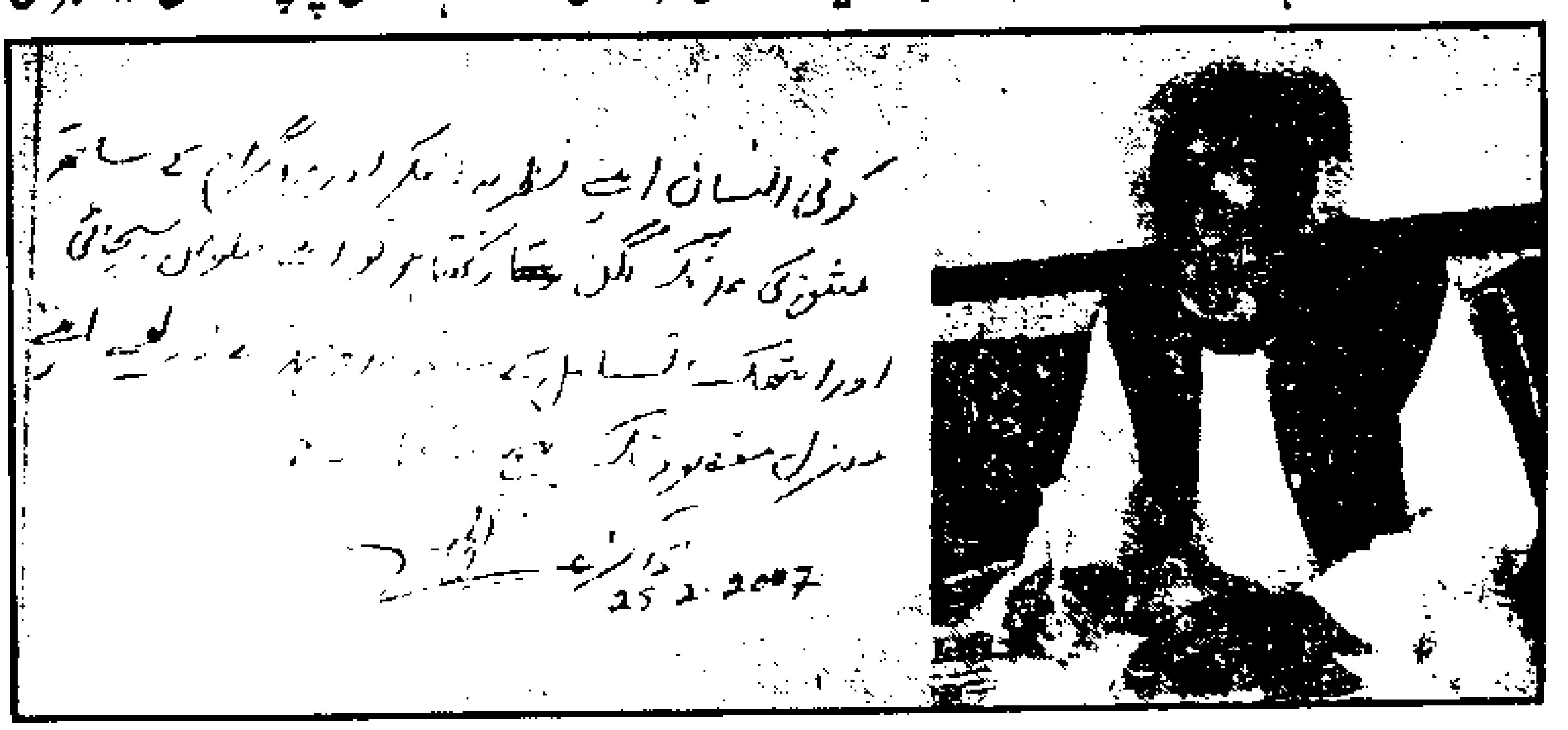

Marfat.com

[illegible] ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ سے حسان علی انٹرویو لیتے ہوئے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سے 73ء [illegible] تمام قوموں کو حق خود ارادیت دیا جائے۔ اس آئین کو بے شک [illegible] جماعتوں [illegible] بہت لوگوں کے اس پر اعتراضات موجود تھے۔

میں [illegible] مخالفت کی۔ ہم نے بلوچستان میں تعلیمی اداروں کی کمی کے حوالے سے [illegible] پہلی بار 63ء میں ایف ایس سی کے دنوں میں حوالات دیکھی تھی۔ اس وقت [illegible] شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ڈاکٹر حئی کا موقف ہے کہ جو لنگڑی لولی جمہوریت پاکستانی عوام کے حصہ میں آئی ہے یہ جمہوری کارکنوں اور قوم پرستوں کی مسلسل محنت کا نتیجہ ہے۔

68ء میں ایوب خان کے خلاف تحریک میں میری پاس بلوچ سٹوڈنٹ فیڈریشن کے صدر کی ذمہ داری تھی جس کا پورے ملک میں نیٹ ورک موجود تھا۔ اس وقت ہم نے باہمی اتحاد سے ایوب کے خلاف پولو گروانڈ کراچی میں ''آل پارٹیز سٹوڈنٹ ایکشن کمیٹی'' تشکیل دی، اور پھر طلباء کے ردعمل کا جائزہ لے کر ایوب خان گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوئے۔

Marfat.com

میرے گھر کے صحن سے شروع ہونیوالا سکول آج ایک تعلیمی تحریک بن چکا ہے

ممتاز ماہر تعلیم اور متحرک سوشل ورکر زبیدہ جلال

انتہائی کم عرصہ میں ایک ایسے سیاسی کردار کی حیثیت سے ابھری جس نے ملکی مرکزی سیاست میں مساوات اور خواتین کی آواز اٹھانے پر عزت پائی۔ بلوچستان کے دورافتادہ اور انتہائی پسماندہ علاقے "مند" کے زندقیہ سے تعلق رکھنے والی زوبی نے نہ صرف وہاں کے بسنے والے بے سہارا اور بے وسیلہ لوگوں کی نمائندگی کی بلکہ معاشرے کے پسے ہوئے طبقات کی بھی پرزور آواز بن گئیں۔ قطع نظر اس بات کے بلوچستان کے سیاستدان انہیں صوبے کی عوام کی نمائندہ نہیں سمجھتے زبیدہ تاریخ بلوچستان کی وہ واحد خاتون ہیں جو جنرل سیٹ پر آزاد حیثیت میں الیکشن جیت کر قومی اسمبلی تک پہنچیں اور پھر وزیر بنیں۔ شعبہ تعلیم میں اعلیٰ خدمات کے عوض انہیں ایسٹ لندن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری اور حکومت پاکستان کی جانب سے پرائڈ آف پرفارمنس سے نوازا گیا۔ امریکن کانگریس کے سلسلے who is who میں پانچ ہزار عالمی راہنماؤں میں زبیدہ جلال کا نام بھی درج ہے۔ قوم پرست قوتوں کے بارے میں زبیدہ جلال کا کہنا ہے میں نے بلوچی عوام کیلئے کام کیا اسلیئے نام نہاد بلوچ لیڈروں سے زیادہ "قوم پرست کارکن" ہوں۔ میں رویے میں بالکل عوامی اور میری فکر ونظر کے سب راستے غریبوں کی فلاح کی طرف جاتے ہیں۔ سیاسی ماحول کا اثر ہر ایک پر یکساں نہیں ہوتا بعض لوگ سیاسی میدان میں اتر کر مفادات کی سیاست کرتے ہیں جبکہ میری سیاست اسلام، وہ عوام سے عوام کی زبان میں بات کرتی ہیں۔ وہ ہر ایک کو عزت دینا چاہتی ہے، سیاسی مخالفین کو صدف تنقید بھی بناتی ہیں مگر شرافت اور اخلاق کا دامن اپنی گفتگو میں مضبوطی سے تھامے رکھتی ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ بلوچ لیڈر آپ کو وفاق کا ایجنٹ سمجھتے ہیں تو ان کا کہنا تھا کہ میں اپنے علاقے کے سیاستدانوں کا منافقانہ رویہ دیکھتی ہوں تو مجھے بے حد دکھ ہوتا ہے۔

تقسیم پاکستان سے قبل ہم کویت منتقل ہو گئے جہاں میرے والد پبلک سیکورٹی کے ایک محکمہ میں ملازم تھے۔ میری پیدائش اور ابتدائی تعلیم کویت میں ہی ہوئی، یہاں میں میری سکولنگ انگریزی میں ہوئی اور کویت میں رہنے کی وجہ سے عربی بھی آ گئی، یہاں بھی ہم بہنیں سکول میں بلوچی لباس پہن کر جاتیں۔ ہم چھ بہنیں اور تین بھائی ہیں، میرا بچپن بہت شاندار گزرا اسوقت میں کبھی کبھی شرارتیں کرتیں مگر

Marfat.com

میری توجہ کا محور صرف تعلیم ہی تھی۔

1978ء میں جب میرے دادا کا انتقال ہوا تو پھر پاکستان آئے اور کوئٹہ سے ہزار میل فاصلے پر واقع اپنے گاؤں 'مند' منتقل ہو گئے، 80ء تک ہمارے گاؤں میں بیت الخلا کا کوئی تصور نہیں تھا، عورتیں رات کے اندھیرے کا انتظار کرتی تھیں۔ گیارہ بارہ سال کی عمر میں لڑکیوں کی شادیاں کر دی جاتی اور غیر شادی شدہ لڑکیوں کو گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلنے دیا جاتا۔ ہمارے پورے علاقے میں کوئی سکول موجود نہ تھا۔ ایسی صورتحال میں 1982ء میں اپنے والد کے مشورے پر میں نے اپنے گھر کے وسیع وعریض صحن میں بچیوں کی تعلیم کیلئے مڈل تک کلاسز کیلئے سکول قائم کیا جو آہستہ آہستہ ایک چین کی شکل اختیار کر گیا، اپنے سکول میں درس وتدریس کے فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی اور یونیورسٹی آف کراچی سے انگلش لٹریچر میں ایم اے مکمل کیا۔ ہمارے سکول کی فارغ التحصیل طالبات نے مختلف علاقوں میں تعلیمی اور سماجی بہبود کی خدمات سرانجام دیں۔ کچھ قومی اور عالمی ادارے یہ جانچنے کیلئے ہمارے علاقے میں آئے کہ آخر کسطرح ''اپنی مدد آپ'' کے تحت ایک کمیونٹی سکول کامیابی سے مقامی لوگوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہا ہے۔ 1997ء میں جب ورلڈ بنک نے پاکستان کے دُور افتادہ علاقوں میں کام شروع کیا تو انکے سامنے بھی ہماری مثال تھی اور اس حوالے سے ہماری خدمات کو بین الاقوامی اشاعتی ادارے بھی شائع کرتے۔ جب جنرل مشرف نے حکومت سنبھالی تو انہوں نے اسی کارکردگی کی بنا پر تعلیم کے شعبے کا وزیر مقرر کیا۔ گھر کے احاطے میں میں نے جس سکول کا آغاز کیا آج وہ کالج کا درجہ پا چکا ہے۔ 2002ء کے عام انتخابات میں مجھے خواتین کی مخصوص نشستوں سے ایوان میں آنے کی رائے دی گئی لیکن میں نے باآسانی منتخب ہونے کے بجائے عوام سے رجوع کیا اور این اے 27 ضلع تُربت سے بلوچستان نیشنل موومنٹ کے مضبوط امیدوار کو شکست دے کر قومی اسمبلی میں پہنچی۔ علاقے کے لوگوں نے مجھے تعلیمی اور فلاحی خدمات کے عوض ووٹ دیئے انہیں کسی سیاسی جماعت یا نعرے کا ووٹ نہیں تھا۔ میرے والد سیاست میں باقاعدہ طور پر نہیں تھے تاہم ضلعی سطح تک وہ نیشنل پارٹی میں شمولیت اختیار کر کے اپنا کردار ادا کرتے رہے، جنرل ضیاء کے دور میں انہیں چیئرمین بھی رہے۔ زبیدہ جلال کے مطابق دوبارا انکا نام وزارت عظمٰی کیلئے نام زیرغور ہوا۔ پہلی مرتبہ جب وزیراعظم کیلئے بلوچستان سے نمائندگی کا معاملہ پیش آیا تو تب میرا اور میر ظفر جمالی صاحب کے نام پر غور ہو رہا تھا۔ جمالی صاحب پارلیمانی سیاست کا طویل تجربہ رکھتے تھے اور میں نے اسکے حصول کیلئے سیاسی انداز میں کوشش بھی نہیں کی اسلئے جمالی صاحب مجھ پر فوقیت

Marfat.com

لے گئے۔ پھر دوسری بار میرے مقابلے میں شوکت عزیز صاحب کے نام قرعہ فال نکلا۔ اجتماعی مفاد اور تعمیر وترقی کیلئے جو منصوبے جنرل مشرف نے شروع کیلئے ماضی میں انکی مثال نہیں ملتی۔ ایک سوال پر انہوں نے کہا کہ اجتماعی کاموں کیلئے میری پہلی کابینہ کا تجربہ بہت اچھا رہا، اسوقت سیاست کا الجھاؤ بالکل نہیں تھا، اس ٹیم کے لوگ اپنے اپنے شعبوں میں تجربہ اور اہلیت رکھتے تھے۔ انہوں نے یہ اعتراف کیا کہ نظام میں تبدیلی چند دنوں میں نہیں آتی کہا کہ میں اس بات کو بڑی کامیابی سمجھتی ہوں کہ میں نے پسماندہ لوگوں کی زندگیوں میں نمایاں تبدیلیاں لائی ہیں۔ میرا بنیادی مقصد عورتوں کو ہنرمند بنانا ہے تاکہ وہ معاشی طور پر مضبوط ہوسکیں۔ گریجویشن کی شرط پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں اس بات کو تسلیم کرتی ہوں کہ تجربے اور بردباری کا نعم البدل ڈگریاں نہیں ہوتیں مگر میں یہ یقین رکھتی ہوں کہ نئی نسل کے نمائندے اپنے بزرگوں سے زیادہ اچھے انداز میں اپنے اپنے حلقوں میں عوامی خدمت کر رہے ہیں۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ گریجویٹ اراکین اسمبلی تمام عوامی توقعات پوری نہیں کر سکے لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ انہیں کام کرنے کا ماحول بھی تو نہیں ملا۔ اپوزیشن نے اسمبلی کی مدت تو ڈیسک بجانے میں گزار دی۔ اپنی نجی زندگی کے حوالے سے بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ 1999ء میں میری شادی ہوئی میرے شوہر کا تعلق کرد قبیلہ سے ہے اور وہ کوئٹہ میں کاروبار کرتے ہیں۔

Marfat.com

قائد اہلحدیث کی مختصر کہانی

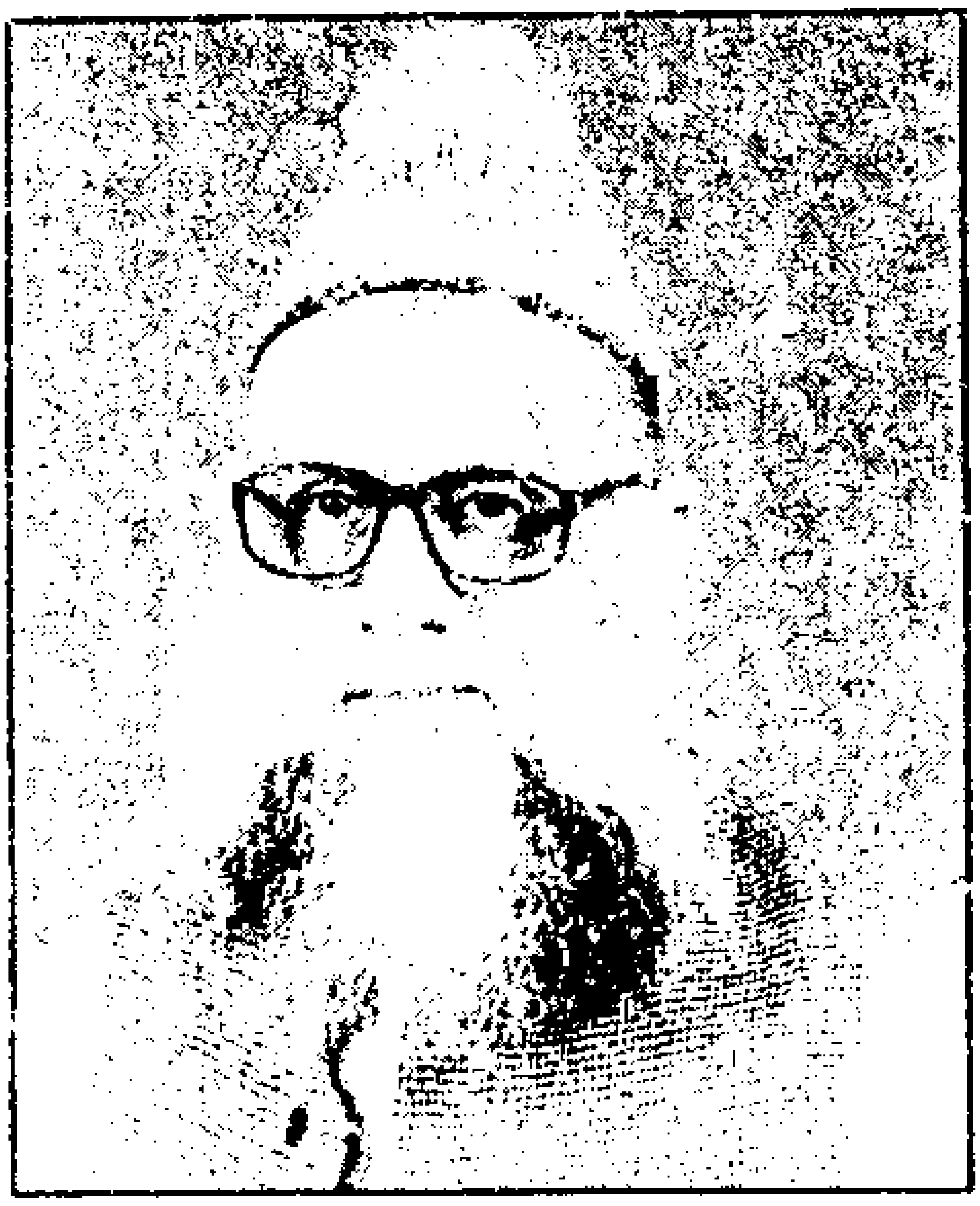

علامہ ساجد میر کا شمار ان چند مذہبی سیاستدانوں میں ہوتا ہے جنہیں ملکی مرکزی سیاسی حلقوں میں کافی پذیرائی ملی ہے۔ جمعیت الحدیث پاکستان کے مرکزی امیر علامہ ساجد میر 2 اکتوبر 1938ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ میرے والد کا نام عبدالقیوم میر تھا۔ پرائمری تک میں تعلیم پسرور ضلع سیالکوٹ سے مکمل کرنے کے بعد 1954ء میں گورنمنٹ ہائی سکول سیالکوٹ سے میٹرک فرسٹ ڈویژن کے ساتھ مکمل کی اور سکالرشپ حاصل کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی مضامین میں سیکنڈ ڈویژن تیں اور پنجاب یونیورسٹی سے اسلامیات میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ ایم اے مکمل کیا۔ میں نے اپنے تعلیمی کریئر کے دوران ہمیشہ امتیازی حاصل برقرار رکھی۔ مجھے ڈگری کلاس کے عربی مضمون میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے پر ''میر حسن میڈل'' جبکہ ڈگری کلاس ہی کی انگریزی میں غیر معمولی کارکردگی دکھانے پر ''محمد علی میڈل'' عطاء کیے گئے۔ اسی طرح سٹوڈنٹ لائف میں تاریخ، معاشیات، فارسی، معلومات عامہ اور تقریری مقابلوں میں کئی انعامات حاصل کرتا رہا۔ میری ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔

اپنی ملازمت کے حوالے سے بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ 60ء سے 63ء تک میں جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ میں انگلش لیکچرار کی حیثیت سے کام کیا۔ متحدہ مجلس عمل سے میں وہ انتہائی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان دنوں وہ ایوان بالا میں ایک متحرک سینٹر کی حیثیت سے عوامی حقوق کی آواز اجاگر کر رہے ہیں۔

Marfat.com

پڑھا لکھا طبقہ بھی سرمایہ داروں کا دلال بن گیا ہے، عبدالستار ایدھی

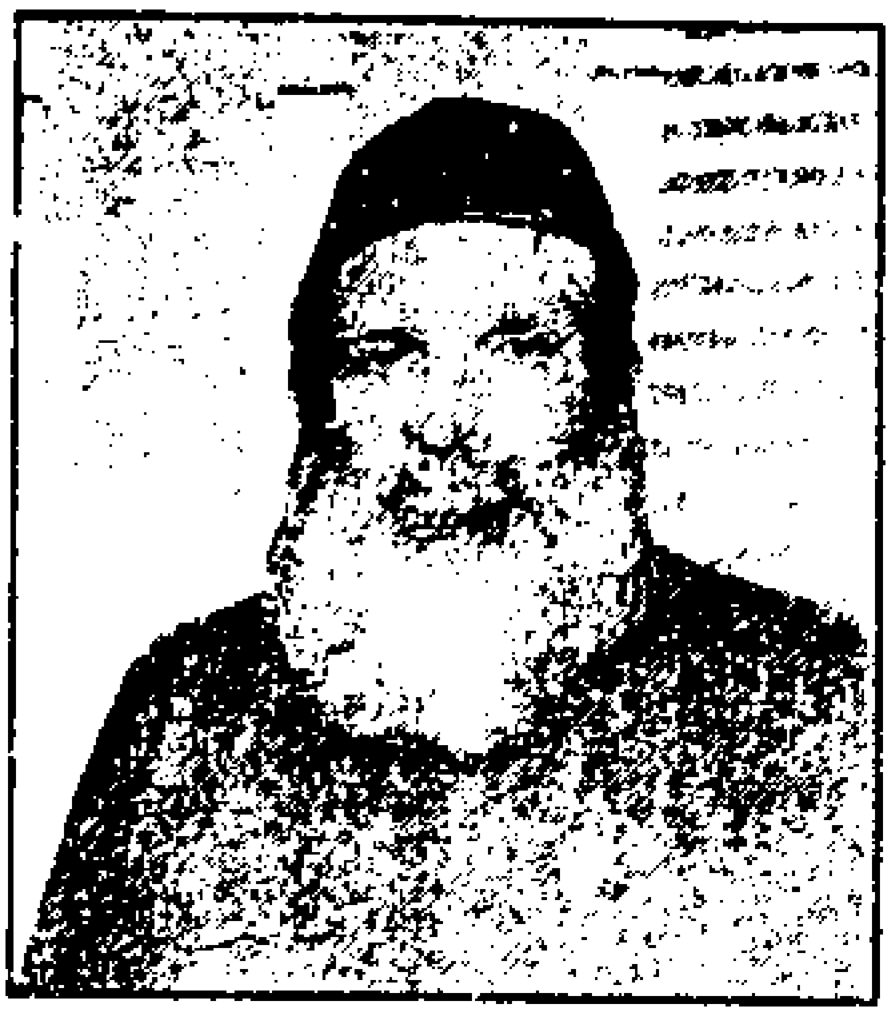

عبدالستار ایدھی سیدھی راہوں کا وہ مسافر جو گذشتہ ساٹھ سال سے دُھی انسانیت میں اُمید کی کرن بیدار ہونے کی تمنا لیے اپنی منزل تلاش کر رہا ہے۔ بلاشبہ پاکستان میں سماجی خدمت کے حوالے سے ستار ایدھی کا کوئی ثانی نہیں۔ انسانیت سے پیار نے اسے لاکھوں دلوں کی دھڑکن بنا دیا ہے اور ایدھی کا پیغامِ محبت آندھی کی طرح پھیل گیا۔ انسانی حقوق کیلئے جاری ان کے غیر معمولی مشن نے چھ دہائیوں کا سفر طے کر لیا ہے، تین نسلیں اس عہد میں جوان ہوئیں اور ایدھی ہی انکے آئیڈیل ٹھہرے۔ عیش و عشرت کی زندگی چھوڑو! خاک نشینوں کے ساتھی بن جاؤ اس فقیر کے یہ دل کی آواز ہے۔ عزت و شہرت کی بلندیوں تک پہنچنے کے باوجود ایدھی کا طرزِ زندگی غریبانہ اور انکی شخصیت میں سادگی کی مکمل نفسیاتی مصوری ہوتی ہے، دل سے نکلنے والی کوئی بات ان کے منہ پہ آ کر رکتی نہیں، ایدھی مذہب، سیاست اور سماجی امور میں وہ جداگانہ موقف رکھتے ہیں۔ انہوں نے جہاں باغیانہ خیالات کے باعث خاصی شہرت حاصل کی وہاں ہی کچھ مذہبی حلقے اسلامی معاملات میں انکے آزاد خیالات کو تنقیدی نگاہ سے بھی دیکھتے ہیں، ان حلقوں کا موقف یہ ہے کہ کسی بھی شخص کو اپنے کام سے ہٹ کر کسی ایسے شعبے پر تنقید و تبصرے اور عامیانہ رائے سے گریز کرنا چاہیے جس سے اس کا اس کا گہرا تعلق نہ ہو۔ عبدالستار ایدھی کی چند باتیں قابل اختلاف ہی سہی مگر انکے عمل کی مخالفت نہیں کی جا سکتی۔ ملیشیا کا جوڑا وہ ہمیشہ اپنے وجود پہ تانے رکھتا ہے جس میں جگہ جگہ سوئی دھاگے سے پیوند اور جس کے بٹن تک ٹوٹے ہوتے ہیں۔ محروم طبقات کو حقوق دلانے کیلئے ایدھی کی طویل جدوجہد کسی سے پوشیدہ نہیں، لوگوں کے دکھ درد ختم ہونے تک وہ اپنی کوششیں جاری رکھنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔ بابا ایدھی کی خواہش ہے کہ دنیا سے غربت اور محرومیوں کے اندھیرے دور ہوں اور وہ اپنی زندگی میں جلا دیتے ہیں۔ انسانیت کی بھلائی کیلئے "مولانا ابو" نے آج بھی سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں اپنا کام جاری رکھا ہوا ہے۔ اپنی زندگی غم زدہ بڑھاپوں، مسکراتے نوجوانوں اور ننھے پھولوں کی خدمت کیلئے وقف کرنے والے ایدھی کا کردار ہمیں انسان کی حقیقی عظمت سے آشنا کرتا ہے۔ حکومت پاکستان نے 1989ء میں ایدھی صاحب کو اعلیٰ سماجی خدمات کے عوض "نشانِ امتیاز" پیش کیا۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار اعزازات ان کے حصے میں آئے۔ لاتعداد اعزازات کی فہرست میں کروڑوں انسانوں کے دکھ بانٹنا ان کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔

انکا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

ستار ایدھی اپنے اہل خانہ کے ساتھ

Marfat.com

عبدالستار ایدھی سے ہونے والی گفتگو کا منظر

عبدالستار ایدھی کا ماضی گواہ ہے کہ انہوں نے مصیبت کی ہر گھڑی میں بے سہارا لوگوں کی دستک پر دل کے دروازے کھول دیئے۔ ان سے مل کر ہر دردمند انسان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔ سچے جذبوں نے آج بے شمار لوگوں کو درد کیلئے میدان عمل میں اترنے پر مجبور کر دیا ہے۔ انسانیت کی خدمت کا جب بھی موقع آیا لوگوں نے آگے بڑھ کر اس تنظیم کی پذیرائی کی اور انہیں دل کھول کر عطیات فراہم کیے۔ ''گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ'' ہزار سالہ تاریخی شخصیات پر مبنی وہ سپلیمنٹ اٹھا کر دیکھ لیں جسمیں دنیا کے ایسے تاریخ ساز افراد کے کوائف درج ہیں جنہوں نے گذشتہ ایک ہزار سالوں میں تاریخ کے سینے پر اپنے عزم وعمل سے انمٹ نقوش چھوڑے اس تاریخی دستاویز میں عبدالستار ایدھی کا ''اپنی نوعیت کا واحد عالمی مسیحا'' تسلیم کیا گیا ہے اور مدر ٹریسا کے بعد انہیں پریشان حال لوگوں کا سب سے بڑا خیر خواہ قرار دیا گیا ہے۔ اب انکی بیوی بلقیس ایدھی اور بیٹے بیٹیاں بھی اس کام میں انکے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔

میں 1929ء میں بھارت کے شہر جوناگڑھ میں ایک غریب کسان کے گھر پیدا ہوا۔ میں نے گجراتی میں چار اور انگریزی میں دو جماعتیں تعلیم حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں آ گیا اور کراچی میں چھوٹے سے کاروبار کے ساتھ ساتھ ایک تنظیم ''میمن خدمت کمیٹی'' قائم کی۔ اس تنظیم نے ایک خیراتی شفاخانہ بھی بنایا۔ پھر بیس سال بعد میں نے اس تنظیم کو چھوڑ کر 72ء میں ''ایدھی فاونڈیشن'' کے نام سے اس تحریک کا آغاز کیا جو آج پاکستان سمیت دنیا بھر کے بے سہارا اور محروم انسانوں کے لبوں پر مسکراہٹ لانے اور دکھی لوگوں کے آنسو پونچھنے کیلئے کام کر رہی ہے۔ شروع میں ایدھی فاونڈیشن کا کام بہت معمولی نوعیت کا تھا مگر آج اس تنظیم کی نہ صرف پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں برانچز موجود ہیں ایدھی فاونڈیشن ملک سے باہر بھی اپنا نیٹ ورک رکھتی ہے۔ جو کام ایک بوسیدہ شامیانے، ٹوٹ پوٹ کا شکار پک اپ سے شروع ہوا وہ آج بے شمار ''ایدھی ہومز'' اور ہزاروں نئی گاڑیوں کے ساتھ جاری ہے۔ سماجی خدمت کے آغاز پر بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میری والدہ نے میرے اندر امیر اور غریب کے فرق کو واضح کیا۔ جب میں کپڑے کی مارکیٹ میں کام کرتے ہوئے اور ایک دواخانے پر مزدوری کے دوران بھی میں نے یہ فرق دیکھا۔ پھر دن رات محنت سے ایک ڈسپنسری کا آغاز کیا۔ سرمایہ داروں کے خلاف آواز اٹھانے پر مجھے مارا پیٹا گیا، برادری نے نکال دیا اور اخلاقی بائیکاٹ کیا گیا لیکن میں نے جدوجہد جاری رکھی۔ سرمایہ دار دنیا بھر میں غریبوں کا استحصال کر رہے ہیں اور تشویشناک بات یہ ہے کہ جن سرمایہ داروں کی وجہ سے غربت میں اضافہ ہو رہا ہے انہی نے غربت کے خاتمے کے لیے نام نہاد دعوے شروع کر دیے ہیں۔ آج دنیا کے صرف دو فیصد سرمایہ دار سو فیصد مجبور لوگوں کا استحصال کر رہے ہیں اور بدقسمتی یہ ہے کہ پڑھا لکھا طبقہ بھی سرمایہ داروں کا دلال بن گیا ہے۔ آج کا مولوی بھی سرمایہ دار ہو چکا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ غربت کے خاتمے کے دعوے وہی لوگ کرتے ہیں جنکی وجہ سے ملک میں غربت کے پنجے مضبوط ہوئے ہیں۔ ساٹھ سالوں سے اسلام کے ناتے انسانیت کی خدمت کر رہا ہوں اور اس عرصہ میں بہت سے لوگوں نے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کی مگر میں مایوس نہیں ہوا۔ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ سیاستدانوں نے ملک کو ملیامیٹ کر کے

Marfat.com

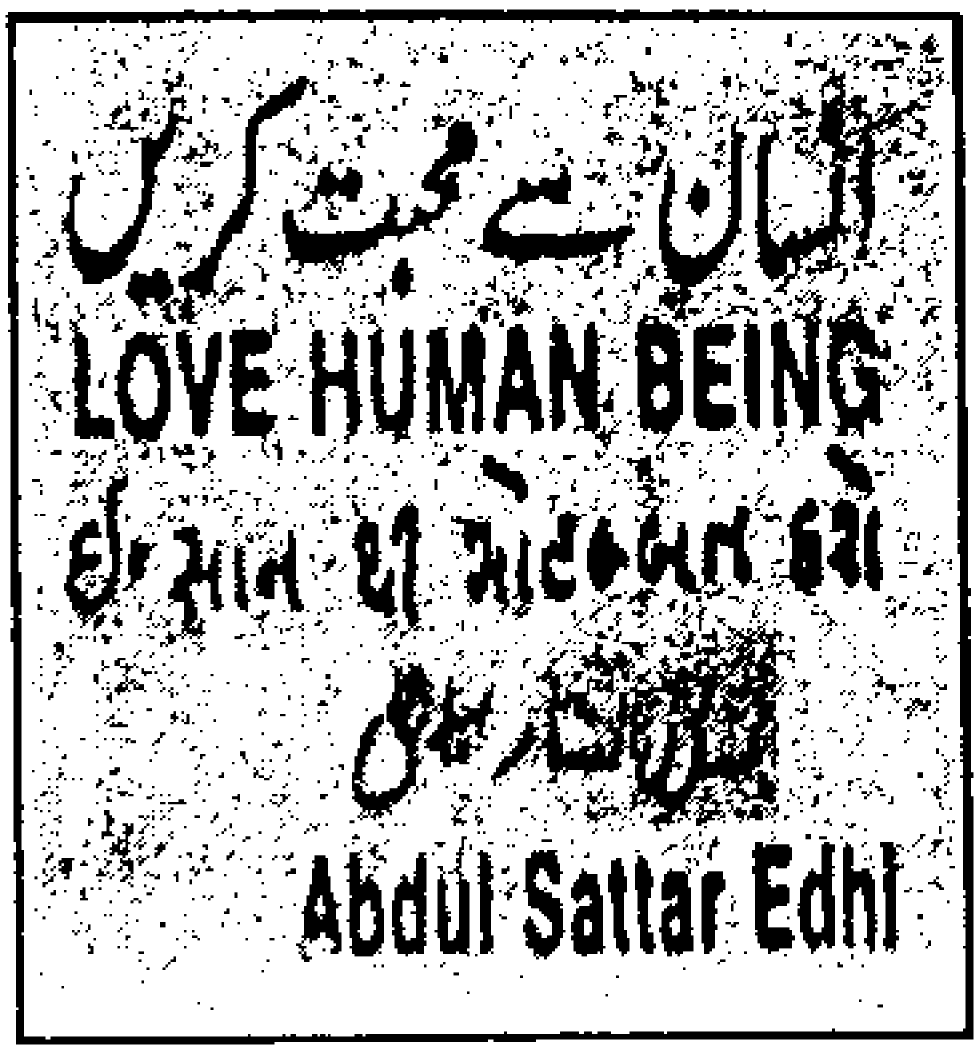

رکھ دیا ہے۔ میں رکاوٹوں کو اپنی کامیابی کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ میرے بارے میں افوائیں پھیلائی گئیں کہ میں انڈیا اور اسرائیل کا ایجنٹ ہوں۔ ایک صاحب نے تقریب میں کہا کہ ایدھی نے پیداگیری کی صنعت لگائی ہے۔ اسطرح کی کئی بے بنیاد باتیں کی گئی لیکن میں نے پروانہیں کی۔ مجھے اپنے مقصد کی سچائی پر یقین تھا کہ کوئی میرے نصب العین کے چراغ کو نہیں بجھا سکتا۔ ایدھی کا کہنا ہے کہ لوگ میری ناچیز کاوشوں کو کچھ بھی کہیں کم از کم میرا تعلق ناداروں، اپاہجوں اور دنیا بھر کے دکھی انسانوں سے تو ہے۔ میری نظر میں خدا کے بندوں سے پیار خدا سے پیار ہے۔

اپنے نیٹ ورک کے حوالے سے انہوں نے بتایا کہ ہماری تنظیم دنیا کے 34 ممالک میں کام کر رہی ہے۔ ہم نے پاکستان میں تیس ہزار بچوں کو مختلف ہنر سکھائے اور ہزاروں گم شدہ بچوں کو انکے گھروں تک پہنچایا، بیس ہزار سے زائد بچے ایدھی جھولوں کے ذریعے موت کے منہ سے نکالے جا چکے ہیں۔ میں نے اللہ جی سے ہمیشہ ''ہول سیل'' میں مانگا ہے۔ ہمیں جو بے حساب پیسہ دنیا بھر سے ملتا ہے ہم اسکی پائی پائی کا حساب رکھتے ہیں۔ پاکستان میں موجود ایدھی سنٹرز سے ساٹھ ہزار لوگوں کا روزگار وابستہ ہے۔ انسان بنو، انسان بناؤ اور انسانیت کی خدمت کرو۔

اگر دنیا میں بُرے لوگوں کی بہتات ہے تو اچھے لوگوں کی بھی کمی نہیں، جہاں تک پاکستانی قوم کا تعلق ہے یہ دنیا کی عظیم قوم ہے مگر اس کو سیاسی، مذہبی اور سماجی رہنماؤں نے بہت مایوس کیا ہے۔ انیس سو باون میں مسجد خضری میں گیا تو وہاں دعا کی کہ اے خدا: مجھے ایسی بیوی ملے جو نیکی کے مشن میں میرا ساتھ دے، اور اولاد بھی ایسی دینا جسکے دل میں انسانیت کی خدمت کا جذبہ ہو، میری تمام دعائیں پوری ہوئیں۔ میں نے دوسری شادی اس لڑکی سے کی جو میری ڈسپنسری میں کام کرتی تھی وہ اسوقت بھی فلاحی کاموں میں میری معاونت کرتی۔

Marfat.com

سابق سینئر منسٹر سرحد سراج الحق اپنی داستانِ حیات سناتے ہیں......

دیے کی روشنی میں تعلیم حاصل کی... محرومیوں کا منہ قریب سے دیکھا... پاؤں کو جوتا میسر نہیں آیا تب بھی سر اٹھا کے سکول گیا۔ سکول دور کے دوران دل میں جب بہتر کی خواہش پیدا ہوئی تو اسے تھپکی دے کر سلاتا رہا۔ اتھے پر کم ہمتی کی شکن نہیں آنے دی اور نہ ہی جذبہ ترقی اور ولولہ تگ ودو کو سرد ہونے دیا۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے اور احساس محرومی کی آندھیوں سے گزر کر ''سراج'' نے ایک بے مثال جدوجہد کی دستاویز مرتب کر ڈالی۔ اس ''دستاویز'' کو اسکا خالق کس نظر سے دیکھتا ہے، اسکے ابتدائی اوراق کس طرح قلمبند ہوئے اور کیسے یہ کہانی وجود میں آئی۔ آیئے ان سوالات کے جوابات پر مشتمل سابق سینئر منسٹر سرحد سراج الحق کی یہ کہانی انکی اپنی زبانی سنتے ہیں۔

بچپن میں نئے کپڑوں اور کھلونوں کا تصور میرے ذہن میں نہیں تھا، کپڑے پھٹ جاتے تو ''بے بے'' بڑی محنت سے انکے پیوند لگا دیتیں۔ امتحان پاس کر کے نئی کلاس میں قدم رکھا تو سب بچے اپنے ساتھ نئے بستے لائے تھے لیکن تب بھی میرے ہاتھوں میں ہی کتابیں تھی، میں نے سکول کے استاد کی دکان سے ادھار بستہ لیا اور پھر جب پیسوں کا بندوبست نہ ہو سکا تو پندرہ دن سکول سے غیر حاضر رہا۔ گھر آ کر اس مجبوری کا اظہار کیا گھر والوں نے یہ ادھار چکایا۔ ہمارا کچا گھر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ گھر کے معاشی حالات تنگدستی کی طرف مائل تھے۔ کچی مٹی کے کمروں میں بسنے والوں کی زندگی ایسے ہی ہوا کرتی ہے۔ صوبہ سرحد کے ضلع دیر کے پسماندہ گاؤں کاس تحصیل ثمر باغ میں ۵ نومبر 1962 کو مشوانی قبیلہ میں پیدا ہوا۔

تعارف سے شناسائی کا سفر طے کرنے کیلئے سراج الحق نے مجھے اپنے ماموں کے گھر دعوت دی وہاں پہنچا تو سراج نے انکشاف کیا کہ وہ ہیلو کے بجائے السلام علیکم کو ترجیح دیتے ہیں۔ گفتگو کے آغاز میں انہوں نے بتایا کہ میرا تعلق اس ''مشوانی'' قبیلہ سے ہے جو پاکستان کے ساتھ ساتھ افغانستان میں بھی آباد ہے۔ میرے والد مولانا احسان الحق دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ اگرچہ میرے والد عالم دین تھے لیکن گھر کا ماحول مذہبی نہیں تھا بلکہ مکمل دینی اور اسلامی تھا۔ ہمارے گھر کی فضا خود بخود دین کی طرف مائل کرتی تھی۔ میں اپنے والدین کی دعاؤں اور توجہ سے کسی قابل ہوا۔ آج بھی بابا اگر کسی محفل میں بیٹھے ہوں تو انکے سامنے بولنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

Marfat.com

ابتدائی تعلیم گاؤں سے چار پانچ کلو میٹر دور علاقہ سے ہوئی، جہاں ہم کچے پتھریلے راستوں پر روزانہ پیدل چل کر جایا کرتے، ماں فجر کے وقت ایک روٹی سکول کیلئے پکا کر دیا کرتی تھی یہ روٹی ہی ہمارا ''لنچ'' ہوتی۔ والدہ نے ایک نصیحت کی کہ بیٹا! ''لالچ نہیں کرنا، اللہ بادشاہ سب کو دیتا ہے کبھی کبھی دیر سے کبھی سویرے''۔ سکول سے واپسی پر عصر تک گھر پہنچ کر اپنی ''روم ایٹ'' گائے کیلئے گھاس کاٹنے جاتے۔ ہمارے گھریلو حالات ٹھیک نہیں تھے کہ ایک دن چوتھی جماعت میں برف باری میں ننگے پیروں سکول چلا گیا جہاں میرے سب ہم جماعت بچوں کے پاؤں میں جوتے تھے، یہاں میں نے اپنے ساتھیوں کو اپنی محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا بلکہ اپنے آپ کو پتھر بنا کر پیش کیا۔ آج تک وہ دن اور پاؤں کا درد فراموش نہیں کر پایا۔

بچپن ہی سے یہ آرزو تھی دل میں کہ کچھ کرنا ہے، مجھے یقین نہیں تھا کہ مجھ غریب دیہاتی کو ایک دن صوبہ سرحد کے خزانے کی نگہبانی کا اعزاز حاصل ہوگا۔ میں نے کوشش سے صوبہ سرحد میں مفت تعلیم کے خواب کو تعبیر کی شکل دلائی۔ اب کوئی سراج مالی مجبوری کی بنا پر تعلیم نہیں چھوڑے گا۔ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے مجھے دونوں چھوٹی بہنیں اور تینوں بھائی ''خان لالہ'' کا پروٹوکول فراہم کرتے ہیں۔ گھر کا پہلا فرد تھا جس نے اسلامی جمعیت طلبہ میں شمولیت اختیار کی تو تب نئے آنے والوں کو حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ کڑی تربیت سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس تنظیم میں ایک ایسا ماحول میسر آیا کہ اس کے بعد باہر کی دنیا کی کوئی خاص کشش نہیں رہی۔ یہاں سیکھا کہ کس طرح اپنی خواہشات کو دفن کر کے ساتھیوں کی ضروریات کو اولیت دی جاتی ہے۔ طالب علمی کا زمانہ ختم ہوا تو تو عملی زندگی کے میدان میں جدوجہد کا دور شروع ہوا۔ میٹرک کے بعد تعلیمی اخراجات بڑھے تو چھٹیاں گھر گزارنے کے بجائے محنت مزدوری کر کے اتنے پیسے کما لیتا جو تعلیمی اخراجات کو پورا کر لیتے۔ جو مزدوری ملتی کر لیتا، شروع میں گروپ کی صورت میں شہر میں کھدائی وغیرہ کے کام لیتے، چالیس روپے یومیہ اجرت مل جاتی اور اس سے اخراجات با آسانی پورے ہو جاتے۔ بعد میں محسوس ہونے لگا کہ کالج کے لڑکے مذاق اڑائیں گے۔ کالج یونین کا صدر بنا تو شہر سے

Marfat.com

مزدوری ترک کر کے علاقوں میں کام ڈھونڈتا جو مشکل سے ملتا۔

جوانی کی ایک جھلک

میں نے بی ایڈ بھی مکمل کیا۔

گریجویشن کر کے فارغ ہوا تو مجھے ناظم جمعیت صوبہ سرحد کی ذمہ داری دے دی گئی۔ میری صوبائی نظامت کا دور اس لیے اہمیت کا حامل تھا کہ ان دِنوں جہاد افغانستان عروج پر تھا۔ میرا آبائی گاؤں افغان سرحد پر واقع ہے۔ جنگ کے دوران انفرادی حثیت میں پچیس ایام کیلئے وہاں گیا اور جب افغان مہاجرین ومجاہدین کی امداد کرنے کا فیصلہ ہوا تو اِس مہم میں بھی شریک رہا۔

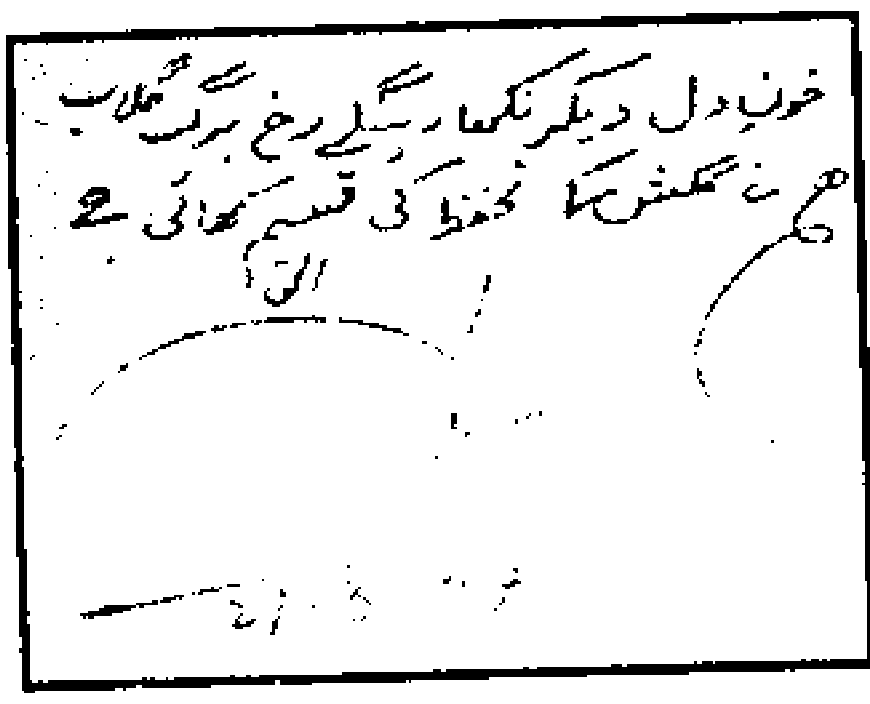

کئی سال قبل زندگی کے صحیح راستے کی تلاش میں دین سے محبت کرنے والے جن جوانوں کے قافلہ میں شامل ہوا تھا کاتب تقدیر نے مجھے ان کا امیر کارواں بنادیا ''ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان''۔ میں اپنے اندر اس عہدے کی اہلیت نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس ذمہ داری کے ملنے کے بعد مجھے لاہور میں اپنے ساتھی تحسین بھائی کے ساتھ قیام کرنا پڑا، اس عرصہ میں میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایڈ بھی مکمل کرلیا۔

''آپ جماعت اسلامی میں کیسے آئے''؟ کالج کا طالب علم بالآخر یونیورسٹی میں ہی جاتا ہے۔ جماعت میں میری شمولیت طے شدہ پروگرام کے تحت ہوئی۔ جمعیت میں وقت لگانے کا مقصد اسلامی اصولوں کے مطابق اپنے کردار کو تشکیل دینا تھا تاکہ اسلامی معاشرے کے قیام کی جدوجہد کی جا سکے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے میں جماعت اسلامی میں شامل ہوا۔ جماعت میں شمولیت کے ساتھ ہی قومی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ستانوے میں قومی اسمبلی کی نشست سے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا مگر چونکہ اس الیکشن کا جماعت اسلامی نے بائیکاٹ کیا اس لیے میرا مقابلہ نہیں ہو پایا۔ دو ہزار دو کے انتخابات میں چودہ ہزار ووٹ سے کامیابی نصیب ہوئی۔ ہفتہ 30 نومبر 2002ء کو میں نے صوبائی سینئر وزیر کی حثیت سے حلف اُٹھایا، بحثیت سینئر وزیر مجھے خزانہ، منصوبہ بندی اور ماحولیات کے شعبے سپرد کیئے گئے۔ دو دن بعد میں اپنے سیکریٹریٹ گیا تو یہاں صورتحال یہ تھی کہ 74 بلین حاصل شدہ قرضوں کی مد میں قابل ادئیگی تھے۔ اور تین سو بلین روپے سے زائد وفاقی حکومت کے ساتھ صوبے میں پیدا ہونے والی بجلی کے خالص منافع کی مد میں تصفیہ طلب تھے۔ بین الاقوامی اداروں کو خوفزدہ کیا گیا تھا۔ ہم نے اس تمام صورتحال سے نمٹنے کیلئے مرحلہ وار پالیسی اختیار کی۔ سب سے پہلے ضلعی ناظمین سے رابطے کر کے انکے خدشات دور کیے گئے، اس ضمن سے

Marfat.com

جماعت سے جماعت کے حمایت یافتہ ناظمین کے تعلق کو استعمال کیا گیا، غیر ضروری اخراجات کم کر دیئے گئے، وی آئی پی کلچر اور نئی سرکاری گاڑیوں سب کو روز اول سے محدود کرنا شروع کر دیا گیا، طے شدہ منصوبوں کی بر وقت تکمیل پر توجہ دی گئی، محکمہ جات کی رہنمائی کیلئے میں نے اپنی راہشگاہ پر ''مرکز مشاورت برائے ترقی'' قائم کیا، اور ساتھ ہی ساتھ مجلس عمل کے منشور کے مطابق نفاذ اسلام کے عملی اقدامات کیلئے منصوبہ بندی کی جاتی رہی، وزیر اعلیٰ اور وزراء کی تنخواؤں کو کم کر کے

سرکاری ملازمین کی تنخواؤں میں اضافہ کیا گیا، اسلامی بینکاری کے عمل کا آغاز کیا گیا اور تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم بیس ہزار سے زائد طلباء وطالبات کیلئے وظائف کا اجراء ہوا۔ اسطرح کے کئی دیگر اقدامات کئے گئے یہ ہماری اعلیٰ کارکردگی کا ثمر ہی تھا کہ عالمی بنک، آئی ایم ایف اور دیگر مالیاتی اداروں نے ہمارے مالیاتی نظام کو کرپشن سے مکمل قرار دیتے ہوئے خود ہماری صوبائی حکومت سے معاہدے کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ازدواجی زندگی سے متعلق پوچھے گئے سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ 92ء میں میری شادی ہوئی اب ایک بیٹی اور تین بیٹوں کا باپ ہوں۔ الحمد للہ گھریلو زندگی خوشگوار گزر رہی ہے۔ گھر میں کم وقت دینے کا سوال کبھی کبھی اُٹھتا ہے۔ سراج الحق ماضی میں جہادی تحریکوں سے بھی وابستہ رہے..... میں نے انہیں جہاد کے بارے میں جب پوچھا تو اُن کا کہنا تھا کہ بدقسمتی سے بعض لوگ جہاد کو بڑے محدود معنوں میں لیتے ہیں..... اسکے نام سے لوگ سمجھتے ہیں کہ اسکا مطلب ہے کہ تلوار اُٹھا کر میدان میں نکل آنا ہے جبکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جہاد کا مطلب جدوجہد ہے جو غربت، جہالت، غنڈہ گردی اور ہر قسم کی سماجی برائیوں کے خلاف ہوسکتی ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ صوبے کی پبلک ٹرانسپورٹ میں میوزک پر پابندی کوئی سنگدلانہ فیصلہ نہیں تھا برطانیہ اور بعض مغربی ممالک میں بھی بسوں، ہسپتالوں، ٹرینوں اور ہوٹلوں میں گانوں پر پابندی موجود ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ مذہب اور سیاست دو علیحدہ چیزیں نہیں، سیاست انبیاء کرام نے بھی کی ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں مسلمان تو کروڑوں ہیں لیکن یہاں نظام ابھی تک انگریزوں کا ہی چل رہا ہے۔ ہمارے پاس ساٹھ سالوں سے انگریز کا دیا ہوا نظام رائج ہے، یہاں تک کہ ہم اپنے دفاتر میں اپنی قومی زبان اُردو کا بھی نفاذ نہیں کر سکے۔

Marfat.com

""اسلام آباد میں چلنے والی لاکھوں گاڑیوں کا ہم نے قبلہ درست کیا" سلطان اعظم تیموری

''پڑھو گے نہیں تو عمر بھر بہن بھائیوں کے محتاج رہو گے'' یہ جملہ سلطان کے سفر زندگی کے رخ اور سمت کا تعین کرتا ہے، اپنے والد ضیاء الدین احمد تیموری کے لبوں سے نکلے یہ الفاظ جب ننھے سلطان اعظم کے کانوں سے ٹکراتے ہیں تو اسکے اندر کچھ کرنے کی آرزوئیں کروٹ لینے لگتی ہے۔ پھر یہ بچہ معاشرے میں نمایاں مقام حاصل کرنے کی تدبیریں سوچتا ہے، اپنی دنیا اپنے زور بازو سے تعمیر کرنے کی آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں علم کی روشنیوں کے حصول کا ایک حدف مقرر کرتا ہے اور پھر اسکی تکمیل میں دن رات ایک کر دیتا ہے۔ سلطان کا بچپن مادیت اور جذباتی پن سے محفوظ رہا، اس نے وقت سے پہلے شرارتوں کی دنیا سے اپنے آپ کو آزاد کروا کر کچھ کرنے کی جدوجہد شروع کی۔ ممکن ہے کہ محکمہ پولیس میں کئی پولیس افسران نے سلطان سے بہتر کارگردگی کا مظاہرہ کیا ہو لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے اس سلف میڈ پولیس افسر کی کہانی بہت انوکھی لگی اسی لئے اس کردار کو آپ کے سامنے پیش کیا۔

ایف ایٹ میں اپنے گھر کے صحن میں کھڑے سلطان اعظم تیموری اپنے کل اور آج کے متعلق بتاتے ہیں کہ کراچی میں 9 جنوری 1962ء کو پیدا ہوا۔ والد ضیاء الدین تیموری سول سروس آف پاکستان میں ملازم تھے۔ انکی ملازمت کے دوران ہم تبادلوں کی شکل میں نگر نگر پھرتے رہے۔ میری زندگی کی کاپی میں ہجرت کے کئی واقعات ہے۔ میں تعلق مڈل کلاس سے ہے۔ میں آٹھویں جماعت تک پڑھائی میں بہت خراب رہا۔ آٹھویں میں ایک دن والد صاحب نے ویسے ہی مجھے کہہ دیا کہ اگر پڑھو گے نہیں تو عمر بھر بہن بھائیوں کے محتاج رہو گے۔ یہ وہ نقطہ تھا جو مجھے مسلسل محنت کی راہ پہ لے آیا۔ پھر دس سال سے زائد عرصہ میں ادھر اُدھر سے لاپردا ہو کر ایک کمرے تک محدود ہو گیا اور تعلیم کو نصب العین بنائے رکھا۔ آپ یقین کریں میں یہاں تک بھول گیا کہ کھیل بھی زندگی کا حصہ ہے۔ راولپنڈی میڈیکل کالج سے ایم

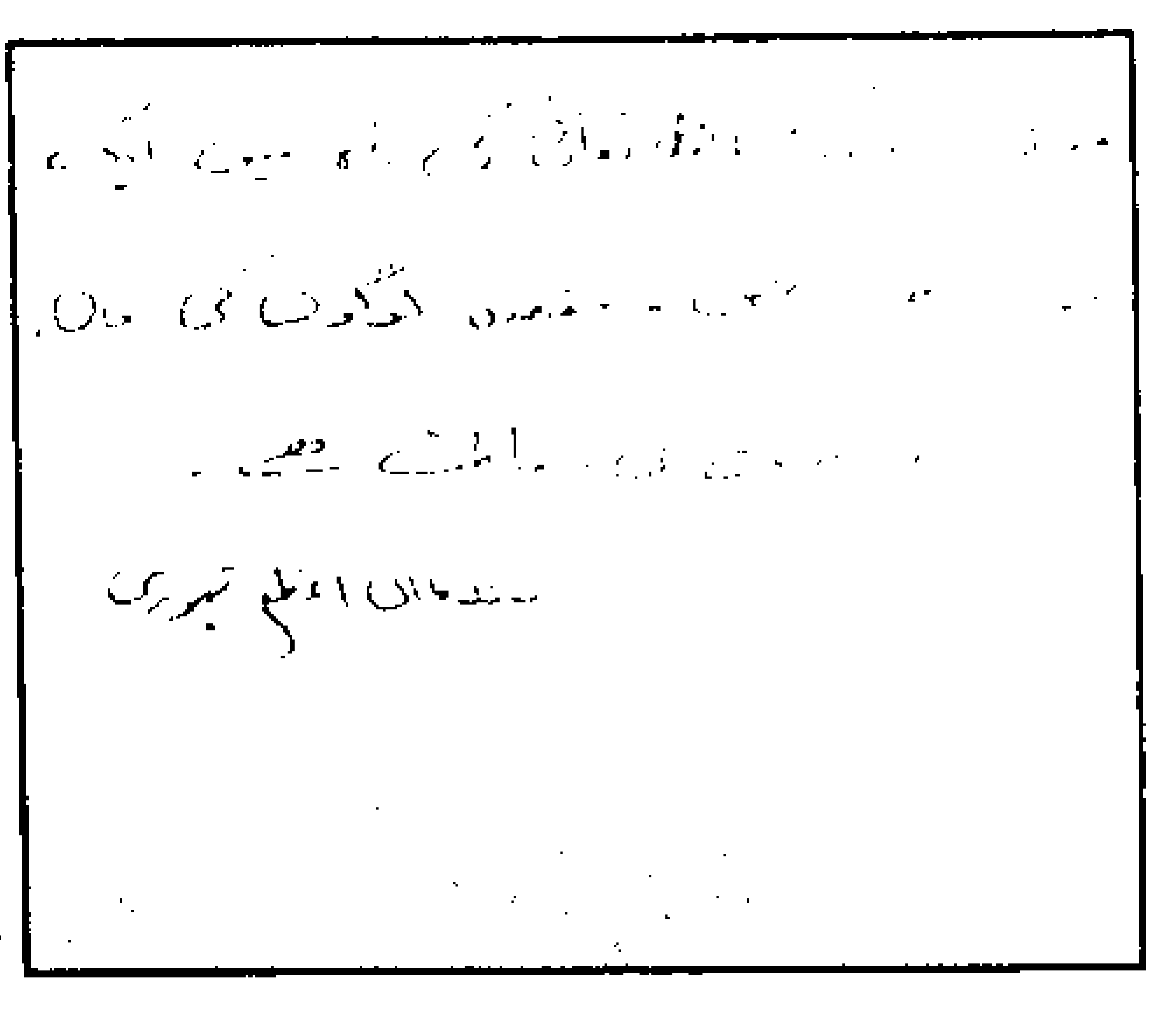

Marfat.com

بی بی ایس کرنے کا خواب جب پورا ہوا تو کیپٹل ڈیویلپمنٹ اتھارٹی ''سی ڈی اے'' میں میڈیکل آفیسر کے طور پر کچھ عرصہ کام کیا۔ پولیس میں آنا میری منزل نہیں تھی بلکہ 1989ء میں جب سی ایس ایس مکمل کیا تو مجھے مجبوراً پولیس میں آنا پڑا۔ اس محکمے میں میری پہلی پوسٹنگ اے ایس پی گجر خان کے طور پر ہوئی۔ یہاں پولیس سروس کا سارا فلسفہ میرے سامنے عیاں ہوا۔ اسوقت کے آئی جی ڈاکٹر شعیب سہڈل ''جو میرے استاد بھی ہیں'' نے مجھے ہدایت کی کہ گجر خان سے منشیات سرے سے ختم کر دو۔ یہ میرے لیے آسان نہیں تھا اسلیے کہ یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ منشیات فروشوں کے پیچھے بڑے لوگ تھے۔ ایک دن ہم نے پہلی بار اس علاقے میں ''بڑی مچھلیوں'' کے ٹھکانوں پر بھاری نفری کے ہمراہ چھاپہ مار دیا تو وہاں ہم پہ جوابی فائرنگ شروع ہو گئی۔ میرے کئی ساتھیوں گولیاں لگیں، انکے خون کے چھینٹے میرے اوپر آ رہے تھے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ یہاں سے بچ جاؤں گا۔ میں نے وہاں فیصلہ کیا کہ نوکری ہمیشہ جہاد سمجھ کر کروں گا۔ اپنی نوکری کے دوران سیاستدانوں سے کئی جنگیں اصولوں کے اوپر لڑائی ہوئی۔ میں نے کبھی کسی پریشر کو قبول نہیں کیا۔ میں صوفی ہونے کی دعویداری تو نہیں کرتا البتہ اولیاء اللہ سے عقیدت کا رشتہ رکھتا ہوں۔ میرے والد نے اہم پوسٹ پر ہونے کے باوجود ایمانداری کا دامن نہیں چھوڑا۔ میری بیوی رابعہ تیموری اور بیٹا معیز الدین تیموری مجھ پر فخر کرتے ہیں۔ پیار اور بات یہ ہے کہ انہیں گھر کم وقت دینے پر شکایت سی رہتی ہے۔ پھر بات چیت ایک موضوع سے دوسرے کی جانب سفر کرتی ہے لیکن سلطان کھڑے کھڑے رُخ بدلنے کے باوجود تسلسل ٹوٹنے نہیں دیتے، بتاتے ہیں کہ ٹریفک ایک رویہ کا نام ہے ہم نے وفاقی دارالحکومت کے شہریوں کے رویوں میں تبدیلی لائی ہے۔ دنیا کی کوئی قوم ٹریفک کے نظام کی خرابی میں ترقی کی منازل نہیں طے کر سکتی۔ ٹریفک سسٹم سے متعلق موٹر وے پولیس کے کامیاب تجربے کے بعد

وزیراعظم پاکستان شوکت عزیز نے کی دلچسپی کے باعث ماڈل ٹریفک پولیس کا آغاز ہوئے اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس ٹیم کی قیادت میرے حصے میں آئی۔ وفاقی دارالحکومت میں ایک نئے نظام کو متعارف کروانے کے حوالے سے بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ٹریفک قوانین کے اُصولوں اور قواعد سے ناواقفیت اور پڑھے لکھے امیر طبقے کی جانب سے ٹریفک قوانین کی پروانہ کرنے کا رجحان وفاقی دارالحکومت کی عوام کا مزاج بن چکا تھا۔ اس چیلنج سے نمٹنے کیلئے ابتداء میں ہم نے ایجوکشن مہم کا آغاز کیا، جسکے تحت ہم نے مختلف عوامی مقامات کے علاوہ، سکولز کے طلباء وطالبات کے علاوہ ہم نے دیگر اداروں میں ٹریفک قوانین سے اگاہی کی کمپین چلائی۔ پھر جب ہم نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف عملی کاروائی شروع کی تو صرف میرے دور میں مجموعی طور پر بلا امتیاز 35 ہزار چلان ہوئے۔ ٹریفک پولیس نے وی آئی پی کلچر کا خاتمہ کرتے ہوئے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی پر کئی وفاقی وزراء، سفارتکاروں، فوجی افسران، اراکین اسمبلی اور اعلی سرکاری افسران کے چالان کیے جنکی مد میں لاکھوں روپے قومی خزانے میں جمع ہوئے۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پاکستان میں ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی ایک اہم وجہ سڑکوں کی ناقص ڈیزائننگ اور انجنیرنگ ہے۔ ٹریفک مسائل کے مکمل خاتمے کیلئے سڑکوں کی حالت کو بہتر کرنا ضروری ہے۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ سلطان لوگوں کی کرسی بدلتے سیاسی موسموں میں بدلتی رہتی ہے، اِن دِنوں ایس اے تیموری اے آئی جی موٹروے کے طور پر ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔

اپنی ذاتی زندگی کے حوالے سے بتاتے ہوئے سلطان احمد نے بتایا کہ فیملی کو وقت کم ملتا ہے، میری بیوی رابعہ تیموری اور بیٹا معیز الدین میرے گھر دیر سے آنے کا سوال اُٹھاتے ہیں لیکن انہیں معاملے

Marfat.com

کی نزاکت کا احساس بھی ہے۔ میں نے دوران ملازمت بوسنیا میں بھی اپنے فرائض سرانجام دیئے۔ وہاں قبروں کے درمیان واقع ایک گھر میں ایک سال تک رہا جہاں ایک 80 سالہ غریب عورت رہتی تھی جسکا سارا خاندان جنگ کی نظر ہو چکا تھا۔ وہ بڑھیا انتہائی کٹھن حالات کے باوجود خوش رہتی اور مثبت سوچتی۔ میں نے اس عورت کے کردار سے بہت کچھ سیکھا۔ ہماری یہ ملاقات اڑھائی گھنٹے تک جاری رہی اور اس سارے عرصہ میں سلطان اعظم تیموری کھڑے رہے، مجھے حیرت بھی تھی اور شرمندگی بھی کہ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں اور ایس ایس پی صاحب کھڑے کھڑے باتیں بتائی جا رہے ہیں بعد میں حقیقت سے پردہ ہٹا کہ وہ تو ''ڈیوٹی'' کر رہے تھے، دِن بھر اپنے دفتر میں ہر طرف گھومتی کرسی کی موجودگی کے باوجود یہ نوجوان کھڑا ہی رہتا ہے، یہ تو اِس کا سٹائل ہے اور پیغام بھی کہ ایک پولیس افسر کو ڈیوٹی پر ہمہ وقت چوکس ہی رہنا چاہیے۔ اسے پولیس میں کام کرتے عرصہ ہو چکا ہے مگر وہ اپنے اندر موجود تخلیقی انسان کو ختم نہیں کر پایا۔

Marfat.com

چھوٹے قد کا بڑا آدمی

پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں میں ذاتی قد کے لحاظ سے سب سے چھوٹے اور سیاسی قد کے اعتبار سے کئی بڑوں سے بڑے سلطان محمود قاضی 9 ستمبر 1949ء کو پنڈ ملکاں میں پیدا ہوئے۔ انکے والد قاضی خالق مقامی مسجد کے امام تھے۔ بچپن کے گلی کوچوں میں تو سلطان کی پست قدی طنز کا باعث اس لیے نہیں بنی کہ وہ ایک معزز مذہبی گھرانے کا فرد تھا لیکن جب غریب گھر کا یہ نوجوان 1972ء میں معاش کی تلاش میں گھر سے نکلا تو اسے سماج کے بچوں، جوانوں اور بڑوں کی ''چھوٹو'' وغیرہ کی آوازوں کے ہتھوڑے بھی سہنا پڑے۔ اس نے ظلمت شب سے شکوہ کرنے کے بجائے ''سر'' بننے کی جدوجہد شروع کر دی۔ میٹرک مسلم گورنمنٹ ہائی سکول راولپنڈی اور ایف اے اور بی اے کا امتحان پرائیویٹ پاس کیا۔ ہوٹل شہرزاد اور پی ٹی ڈی سی ہوٹل میں کلرک اور پھر مختلف حیثیتوں میں کام کیا۔ پی ٹی ڈی سی سے اسے سیاسی بنیادوں پہ نکال دیا گیا۔ لیاقت باغ راولپنڈی میں واقع سلطان کے سیاسی ڈیرے (نیشنل سٹی ہوٹل) میں میری ان سے کئی طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ سلطان محمود نے اپنی سیاسی جدوجہد سے متعلق بتایا کہ 30 نومبر 67ء کو پاکستان پیپلز پارٹی معرض وجود میں آئی تو اسوقت اس جماعت نے رنگ نسل اور ذات پات کی تمیز کیے بغیر عزت نفس دینے کا جب نعرہ لگایا تو میں اس سے بے حد متاثر ہوا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اسطرح کی کوئی آواز چاہیے تھی۔ چنانچہ میں نے پیپلز پارٹی کے قیام کے ایک سال بعد قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت پہ ایک نظم لکھی اسکا عنوان تھا ''قوم کا لیڈر''۔ ایک دن اُس ہوٹل میں جس میں میری نوکری تھی وہاں بھٹو صاحب کے امریکہ سے آئے ہوئے کچھ مہمان پارٹی کے سٹی صدر خورشید حسن میر کے ساتھ ہمارے ہوٹل پہ آئے۔ میری نظم ''قوم کا لیڈر'' خورشید صاحب نے اُن گوروں کو انگریزی میں ترجمہ کر کے سنائی۔ یہی امریکن جب کراچی بھٹو صاحب کو ملنے گئے تو انہوں نے اُن کے سامنے میری تعریف کی اور کہا کہ یار! تمہاری پارٹی کی جڑیں تو عوام میں ہیں۔ اس کے بعد بھٹو صاحب نے مجھے نصر اللہ خٹک کے

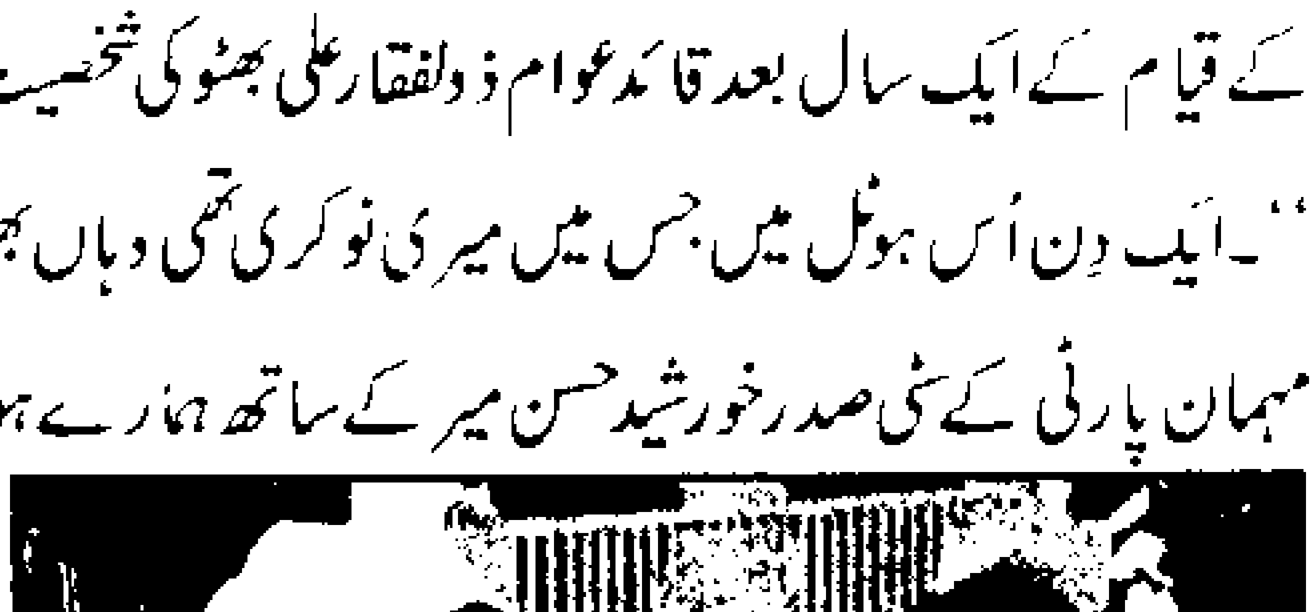

Marfat.com

شکن کے سابق وزیر اعظم طلائی اور قائد عوام کے ساتھ

ذریعے ملاقات کے لیے بلایا اور مجھے بے حد عزت دی۔ مجھے اس بات پہ فخر ہے کہ میں نے بھٹو صاحب کو جائن کیا۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ پارٹی کے اندر میرے کام نے کسی کو موقع ہی نہیں دیا کہ وہ میرا مذاق اُڑا سکے۔ میں نے جماعتی عہدے کبھی اخباری خبروں میں زندہ رہنے کے لیے نہیں رکھے بلکہ جب نوکری کی تب بھی 20 گھنٹے کام کرتا تھا اور آج تک سیاست میں بغیر کسی تھکاوٹ سے کام کرتا ہوں۔ میں نے نوکری کر کے سیاست کی، مال بنانے کی سیاست سے نفرت ہے اگر ایسا کرتا تو آج بہت کچھ بنا لیتا مگر مجھے ریٹائرمنٹ پہ جو 3 لاکھ بائیس ہزار ، روپے ملے اس میں سے ایک لاکھ پینتالیس ہزار کی گاڑی خریدی جو آج بھی چل رہی ہے۔ میں نے ایک انتہائی غریب گھرانے کا فرد ہونے کے باوجود برادری کے زور پر نہیں بلکہ اپنی سوچ اور فکر کی بنیاد پہ عزت پائی۔ سب جماعتوں کے لیڈرز اور کارکن میری عزت کرتے ہیں چاہے وہ مولانا فضل الرحمن ہوں ، محمود خان اچکزئی ، جاوید ہاشمی یا لیاقت بلوچ ہوں سب میرا احترام کرتے ہیں۔

قاضی ایک سوال پر دوٹوک الفاظ میں کہنے لگے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے دونوں بیٹے انقلابی اور بہادر تھے۔ بھٹو کی موت کے ذمہ دار جنرل ضیاء ، اسوقت کے ججز اور پنجاب پولیس تھی جب کہ ان کے بیٹوں کو خفیہ ہاتھوں نے نشانہ عبرت بنایا۔ میں نے جنرل ضیاء کے آٹھ سالہ دور میں پانچ سال قید کاٹی۔ میں نے ایک قیدی کے طور پر شاہی قلعہ ، لال قلعہ ، اڈیالہ ، اٹک جیل ، میانوالی جیل ، گجرانوالہ جیل ، ملتان جیل اور کوٹ لکھپت جیل میں موت کی کوٹھری دیکھی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو جب پہلی مرتبہ وزیراعظم بنی تو میں بھی انکے ساتھ ان پچاس لوگوں کے حج وفد میں شامل تھا جو خصوصی طور پر سعودی عرب آیا تھا۔ وہاں میں بیعت اللہ شریف کے اندر بھی گیا۔ یہ جہاز پہ میرا پہلا سفر تھا ، اسوقت میں نے بے نظیر بھٹو کو کہا کہ محترمہ آپ کی وجہ سے ہم آج یہاں پہنچ آئے ہیں تو انہوں نے کہا کہ قاضی صاحب میں آپ کی وجہ سے یہاں پہنچی ہوں۔ ایک ذاتی سے سوال پر انہوں نے بتایا کہ میں نے اپنی مرضی سے شادی نہیں کی۔ میرے اندر بچپن سے شعور تھا اور ٹھوکروں نے مزید بہت کچھ سکھا دیا۔ جب

قائد عوام کو تختہ دار پہ لٹکایا گیا تو میں بہت رویا تو

Marfat.com

بچپن کی گلیوں میں گھروں کے شیشے میری گیند سے ٹوٹے تھے

کرکٹ کے گُلستان میں شاہد آفریدی کی شخصیت گزشتہ کئی سالوں سے ہمارے سامنے ایک کُھلی کتاب کی مانند ہے،اِس کتاب کے ہرورق اورکئی سطور اسکے چھکوں اور چوکوں کی بارش سے بھیگے ملتے ہیں۔وہ ایسا کھلاڑی ہے جو کسی بھی وقت میچ کا نقشہ بدل کہ شکست کے منہ سے فتح چھین کر پاکستانی ٹیم کی جھولی میں ڈال سکتا ہے۔گیند کو باونڈری سے باہر پہنچائے بغیر اسے قرار نہیں آتا۔تماشائیوں کو بھرپور تفریح فراہم کرنے میں کوئی آفریدی کا ثانی نہیں،شاید اسے گمان ہو چکا ہے کہ اسکے چاہنے والے اسکی بے قراری کو پسند کرتے ہیں۔آفریدی کے اندر کا ''شرارتی'' اسے اکساتا رہتا ہے کہ وہ بھرپور توانائی سے گیند کو باونڈری سے باہر پھینک کر مخالف کے گیم پلان کو خاک میں ملا دے۔یہ ٹیم کا ایسا کایا پلٹ آل راونڈر سمجھا جاتا ہے جو کرکٹ کے تینوں شعبوں ''بیٹنگ،باولنگ،اور فیلڈنگ'' میں اپنی مثال آپ ہے۔میری نظر میں شاہد کے آنے سے کرکٹ کے شائقین کو دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں،کرکٹ کے شیدائیوں کا ایک طبقہ انکے سٹائل کو بے حد پسند کرتا ہے اور انکی ٹیم میں موجودگی کو ضروری سمجھتا ہے جبکہ دوسرے کی رائے اِس سے قطعاً مختلف ہے۔کھیل کے میدان کے اندر و باہر اس کی اُنگلیاں ہمہ وقت اپنے بالوں کو سنوارنے میں مگن رہتی ہیں۔ 4 اکتوبر 1996ء کو ٹیم کے کم عمر ترین کھلاڑی کی حثیت سے اس نے دھواں دھار بیٹنگ کرتے ہوئے 37 گیندوں پر نا قابل یقین سنچری سکور کر کے اپنا نام بین الاقوامی کرکٹ میں سنہرے حروف میں درج والیا۔اس ریکارڈ کو توڑنا مستقبل قریب میں آسان نظر نہیں آتا۔کرکٹ کے اس عالمی ریکارڈ ہولڈر کو یوں تو دنیا جانتی ہے لیکن انکی زندگی کے بعض گوشے آج بھی انکے چاہنے والوں سے پوشیدہ ہیں۔شاہد خان یکم مارچ 1980ء کو صاحبزادہ فضل الرحمٰن کے گھر پیدا ہوئے۔ان کا آبائی علاقہ ''تیرا میدان خیبر ایجنسی'' ہے۔شاہد کے پردادا مولانا محمد الیاس اور دادا صاحبزادہ عبدالباقی مذہبی وروحانی اعتبار سے علاقے میں خاصا امتیاز رکھتے تھے۔صاحبزادہ شاہد آفریدی جدھر جاتا ہے تباہی مچا دیتا ہے،میری انکے کزن سینیٹر حمید اللہ جان کی رہائشگاہ پر اِن سے ملاقات طے پائی،جب وہاں پہنچا تو آٹوگراف کے حصول میں خوشی سے

Marfat.com

صدر مشرف سے مصافحے کا ایک انداز

کانپتے کی ہاتھوں کو دیکھا۔ بات چیت شروع ہوئی تو شاہد آفریدی نے بتایا کہ میرا تعلق دینی گھرانے سے ہے اور میں اسلامی معاملات میں گہری دلچسپی لیتا ہوں، قرآن مجید میں نے بارہ سال کی عمر میں پڑھ لیا تھا، میرے لبوں پر اکثر درود شریف کا ورد رہتا ہے، بچپن سے مجھے کرکٹ سے عشق ہے، میں نے کراچی کے گلی محلوں سے اس کھیل کا آغاز کیا۔ شروع سے گرمیوں کی دھوپ میں جب لوگ ٹھنڈے کمروں میں آرام کرتے تو ہم گراؤنڈ میں ہوتے۔ یعنی بچپن کی گلیوں میں گھروں کے شیشے میری گیند سے ٹوٹے تھے۔ میرے وہم وگمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ کراچی کے گلی کوچوں سے ربڑ کی گیند سے شروع ہونے والا سفر مجھے کرکٹ کے عالمی میدانوں تک لے جائے گا۔ شاہد کی متوازن گفتگو جاری تھی کہ میں نے اسمیں سوال کا پہلا کنکر پھینک دیا! جواب ملا کہ آٹھ نو سال کی عمر میں ٹی وی پر عمران خان کو کھیلتے دیکھا، میں ان سے بے حد متاثر تھا، میں نے اپنے کمرے میں انکے بڑے بڑے پوسٹر لگا رکھے تھے اور عمران بھائی کو دیکھ کر ہی میں کرکٹ کی جانب راغب ہوا۔ آفریدی نے اعتراف کیا کہ شروع سے تیزی اور جلد بازی کا عادی ہوں۔ ہر چھکا لگانے کے بعد سوچتا ہوں کہ اگلا اس سے لمبا لگانا ہے۔ اس عادت کی وجہ سے بچپن میں کھیل کے دوران جب کسی گھر میں گیند چلی جاتی تو اکثر لوگ واپس نہیں کرتے تھے پھر ہمیں آپس میں پیسے جمع کر کے نئی گیند خریدنی پڑتی، اس وقت بھی سب سے زیادہ گیند گمانے کا اعزاز مجھے ہی حاصل تھا۔ بھائی! یہ بھی بتاتا چلوں کہ میرے والد میری کرکٹ سے بہت تنگ تھے اُنکی خواہش تھی کہ میں انکے ساتھ کاروبار میں آ جاؤں مگر میں کرکٹ کی راہ کا مسافر تھا۔ شاہد آفریدی نے بتایا کہ مجھے قومی کرکٹ ٹیم میں شمولیت کی اطلاع اسوقت ملی جب میں وضو کرنے گیا ہوا تھا...... میں اس خبر پر بہت خوش تھا اور خوشی سے چھلانگیں لگا رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے جلدی موقع مل جائے گا۔ میرے لیے یہ بھی حیرت انگیز بات ہے کہ پہلے میچ میں میرا انتخاب بحیثیت بولر ہوا تھا لیکن میں نے بیٹنگ میں زیادہ ریکارڈ قائم کیے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میری اپنی آٹوگراف لینے کی عمر تھی مگر آٹوگراف دینا پڑ رہے ہیں، اپنے آٹوگراف میں ''والدین کا احترام کرو'' لکھتا ہوں۔ ''ہمیشہ شارٹ کھیلنے کی اُمنگ آپ کو جلد میدان سے باہر بھیج دیتی ہے، انداز کو تبدیل کرنے کا کوئی ارادہ ہے''؟ اس سوال پر آفریدی کہنے لگا کہ میری بیٹنگ کا جو انداز ہے آئندہ بھی کوشش ہوگی کہ اسی طرح

Marfat.com

شاہد آفریدی اور حسنان علی عباسی انٹرویو کے بعد

کھیلوں، لیکن اب میں ہر بال پر شارٹ نہیں ماروں گا۔ لیکن کیا کروں اپنے بیٹ سے گیند کو ہوا میں تیرتے ہوئے دیکھنے میں بے حد مزا آتا ہے۔ اس بارے میں میرا موقف ہے کہ کھلاڑیوں کو ریکارڈز سے زیادہ تماشائیوں کی دلچسپی کیلئے کھیلنا چاہیے۔ جب میں وکٹ پہ ہوں تو مخالف ٹیم خوفزدہ رہتی ہے کہ آفریدی حشر نشر کر دیگا ساتھ ہی ادھر ہماری ٹیم کو بھی یہ خوف رہتا ہے کہ میں جلد آوٹ نہ ہو جاؤں۔ یہی عمر ہے تیز کھیلنے کی ورنہ کچھ سالوں بعد تو دوسرے بہت سے میری طرح کے نوجوان آجائیں گے اور پھر شاید میں نصیحتیں کرتا پھروں کہ بھائی ''آہستہ کھیلو''۔ وکٹ پہ ہوں تو آوٹ ہونے سے اور کسی بھی باولر کو مارنے سے نہیں ڈرتا۔ اپنے پرستاروں کے بارے میں آفریدی کہتے ہیں کہ پرستار میرا اثاثہ ہیں۔ اپنے کیریئر کے آغاز سے 21 اکتوبر 2000ء شادی کے دن تک مجھے ایک نہیں کئی بے بنیاد سکینڈلز کا سامنا کرنا پڑا۔ شعیب اختر کے بارے میں انہوں نے کہا کہ شعیبی کی تیز رفتار باولنگ اور میری تیز رفتار بیٹنگ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے۔

4 اکتوبر 1999ء کو میں نے انڈین سٹار بلے باز سچن ٹنڈولکر کا بیٹ اُدھار لے کر جب ریکارڈ ساز اننگز کھیلنا شروع کی تو میں نہیں جانتا تھا کہ اسوقت مجھے کیا ہو گیا تھا، میرے سٹروکس کی بارش شروع ہوئی تو نیروبی کے سٹیڈیم پر سناٹا چھا گیا، یہاں پاکستانیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ تھا جو خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے سبز ہلالی پرچم بلند کر رہا تھا باقی سب کے منہ لٹک گئے تھے، میں اسوقت نیا تھا اور بہت سے شائقین میرے نام سے بھی واقف نہیں تھے مگر میرا بلا ہر طرف حیرانگی بکھیر رہا تھا۔ میں نے ہمیشہ کرکٹ کے خواب دیکھے تیز ترین سنچری بنانے کا ریکارڈ ایک رات پہلے ہی میں نے خواب میں دیکھ لیا تھا۔ میری تمنا ہے کہ میرا ہر خواب پاکستان کی ترقی اور استحکام سے متعلق ہو اور مورخ جب پاک سرزمین کی تاریخ مرتب کرے تو مجھے اس میں ضرور جگہ ملے۔

ایک موقع پر شاہد آفریدی نے اپنی روایتی خوش مزاجی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یار! اگر میں صحافی ہوتا تو اگر کسی کے بارے میں اچھا نہ لکھتا تو برا بھی نہ لکھتا۔ زندگی خوشی خوشی بسر کرنا اور کسی کو دکھ نہ دینا میری زندگی کا مشن ہے۔ مجھے غریبوں اور سڑکوں پر بھیک مانگنے والوں پر بہت ترس آتا ہے اور مستحقین کی خاموش خدمت

Marfat.com

کا قائل ہوں۔ دوستی آج بھی اُنہی لڑکوں سے ہے جن سے ٹیم میں کھیلنے سے پہلے گپ شپ تھی اِن سے دور رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا ۔ایک سوال پر وہ آواز تیز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سچی بات یہ ہے کہ میں انگلش نہیں بول سکتا لہذا غلط بولنے سے بہتر ہے نہ بولوں مگر یہ انگریز تو بلکل ہماری زبان نہیں بول سکتے اس لیے ہم ان سے بہتر ہیں۔ایک سیاسی سوال کے جواب میں آفریدی نے کہا کہ میرا سیاست میں آنے کا بلکل شوق نہیں مستقبل میں صرف کرکٹ انجوائے کرنا چاہتا ہوں، اسے چھوڑ نہیں سکتا۔

''خان صاحب! آپ نے کرکٹ میں بہت جلد شہرت حاصل کر لی ہے،اب کیسا محسوس کرتے ہیں؟''اللہ تعالی کا شکر ہے کہ اسوقت میرے پاس اُسکا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ ہر جگہ مجھے دیکھ کر لوگ جمع ہو جاتے ہیں، یہ اچھا بھی لگتا ہے لیکن اس سے مجھے اکیلے گھومنے کا موقع نہیں ملتا۔ میں ڈریئور ہوں ذرا وکھری ٹائپ کا مگر مجھے سیر و سیاحت کا بہت کم موقع ملتا ہے۔آپ یہ سمجھیں کہ میرے چاہنے والوں نے میری آزادی سلب کر کہ رکھ دی ہے۔

خان جی! تیز ترین سنچری سکور کرنے کے بعد لوگ ہر میچ میں آپ سے بڑے سکور کی توقع کرتے ہیں اور آپ 'بھائی! لوگ مجھے اور میرے کھیل دونوں کو پسند کرتے ہیں،شاہد آفریدی پُر جوش لہجے میں کہنے لگا برسوں سے لمبی اننگز کھیلنے کا منتظر ہوں،میری خواہش ہے کہ میں تیز ترین ڈبل سنچری سکور کر کے نئی تاریخ رقم کروں، خود کو بہتر بنا رہا ہوں تا کہ دیر تک کھیلتا رہوں۔میری خواہش ہے کہ میں پاکستان کیلئے زیادی سے زیادی کھیلوں اور رنزوں اور وکٹوں کے انبار لگادوں۔انہوں نے کہا کہ میں وکٹ پہ ہوں اور سوال نہ بنیں یہ کیسے ممکن ہے۔

''کبھی پریشان ہوئے ،رنج وغم کے لمحے کیسے لگتے ہیں''؟

میری والدہ کی وفات میرے لیے دنیا کا سب سے بڑا صدمہ تھا۔جب میں نے والدہ کے انتقال کی خبر سُنی تو یہ میرے لیے قیامت کے لمحات تھے۔میری ماں کہتی تھی کہ مجھے اپنے بیٹے کو چھکے مارتے دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔

Marfat.com

ملک کی معاشی مملکت کا "صدر"

ایک فقیر کے طور پر اپنا تعارف کروانے والے صدر الدین ہاشوانی پاکستان کے ارب پتی اشخاص میں شامل ہے 1974ء میں ہوٹلنگ کی صنعت سے وابستہ ہوا۔ صدر الدین پاکستان کے صف اوّل کے ہوٹلوں پرل کانٹی نینٹل، میرٹ گروپ اور اواری ہوٹلز کے علاوہ ملک سے باہر بھی بے شمار ہوٹلوں کا مالک ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ہاشو انی گروپ کی بنیاد حسین ہاشوانی نے رکھی تھی جنکا تعلق گجرات بھارت سے تھا۔ 1890ء میں یہ خاندان ہجرت کر کے کراچی آیا۔ یہاں حسین ہاشوانی نے ''ریلے برادرز'' کپاس درآمد کرنیوالی ایک فرم سے شراکت داری کی بنیاد پر کاروبار کا آغاز کیا۔ صدرالدین ہاشوانی نے 1960ء میں ایک چھوٹے کاروبار سے ابتداء کی اور اسکے صرف دس سالوں بعد تجارتی حلقوں میں خاصا نام پیدا کرلیا۔ تجارتی حلقے صدرالدین کی محنت سے عروج کی بلندیوں تک پہنچنے والے اس گروپ کو ''ہوٹل کنگ'' بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بھٹو دور میں ہونیوالی بینکوں کی نیشنلائزیشن ہاشوانی گروپ کیلئے کافی سودمند ثابت ہوئی تھی۔ صدرالدین ہاشوانی اپنے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں ابتدائی عمر میں کرکٹ کو بہت پسند کرتا تھا اور ہفتے کے ساتھ دن کرکٹ کھیلتا، کالج یونین کے معاملات میں بھی بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا۔ یہ ساری سرگرمیوں نے بدقسمتی سے مجھے ایک ناکام سٹوڈنٹ بننے کی جانب لے جانیوالی تھیں کہ میں نے محسوس کیا کہ مجھے انہیں ترک کر کے اپنی تعلیم پر توجہ دینی چاہیے۔ میں اپنے والدین پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا اسلیئے میں نے صرف اٹھارہ سال کی عمر میں سٹیل مصنوعات کے سیلز مین کے طور پر کام بھی شروع کردیا۔ آخرکار 1965ء میں جب میں 25 سال کا تھا تو مجھے کاٹن کی برآمد کرنے کا موقع ملا اور صرف پانچ سالوں میں ہم "The king of cotton" کہلائے۔ اس عرصہ میں میں سال کے 365 دن صبح 9 سے آدھی رات تک مسلسل کام کرتا رہتا۔ پھر جب پاکستان اور بنگلہ دیش الگ ہوئے تو ہم نے چاول کا کاروبار شروع کیا۔ اور ایک بار پھر صرف ایک سال میں ہی ہم پاکستان کے چاول کے سب سے بڑے ایکسپورٹر بن گئے۔ ہمارا خاندان بنیادی طور پر ایران سے آیا ہے۔ والدہ گوادر میں پیدا ہوئیں، میں نے اپنی والدہ کے نام پر ''زیو رپیئر ویلیم'' بھی قائم کی۔ ان کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ میری بیوی نور سلطانہ، بیٹی نادیہ، بیٹا حسن جو میری محنت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

Marfat.com

ڈاکٹر طاہر القادری کا کل اور آج

شریف خاندان کے ادارے اتفاق فاؤنڈری کی مسجد کے خطیب کے طور پر ابتدائی شہرت حاصل کرنے والے تحریک منہاج القران کے بانی ڈاکٹر طاہر القادری کا شمار اُن گنے چنے افراد میں ہوتا ہے جو جد وجُہد مسلسل اور خداداد فہم و فراست کے سہارے زندگی کے میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑھ رہے ہیں۔ڈاکٹر صاحب دلائل کے ہتھیار سے دِلوں کو فتح کرنے کا ہنر جانتے ہیں، انکی تحریک سے وابستہ افراد کا خیال ہے کہ انہوں نے نواجوان نسل میں انقلابی روح پھونک دی ہے دوسری طرف اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انکے انداز سیاست کو وہ قدر و منزلت نہیں مل پائی جو ملنی چاہیے تھی۔ یہ امر بھی اسکی دلیل ہے کہ انہیں تدریسی و تحقیقی خدمات کے عوض تو قومی و عالمی سطح پر بے پناہ پذیرائی ملی اور ان شعبوں میں نمایاں خدمات پر انہیں مستند ایوارڈز بھی دیئے گئے لیکن وادی سیاست میں انکی سیاسی جماعت کو پاکستانی قوم سے صرف ایک نشست کا انعام ملا۔ڈاکٹر قادری نے 1975ء میں ''محاذ حریت'' کے نام سے نوجوانوں کی ایک تنظیم بنائی اور پھر 1980ء میں ''منہاج القران'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جسکے آج دنیا بھر کے 80 ممالک کی طرح پاکستان میں بھی ایک ہزار کے قریب ادارے کام کر رہے ہیں۔انکی سماجی و تعلیمی خدمات کے اعتراف میں انہیں امریکن بائیوگرافیکل انسٹیوٹ کی جانب سے لائف اچیومینٹ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔

ڈاکٹر طاہر القادری بتاتے ہیں کہ میں 19 فروری 1951ء کو پنجاب کے مشہور شہر جھنگ کے محلے پرانی عیدگاہ صدر میں پیدا ہوا۔میرے دو بھائی اور پانچ بہنیں ہیں، چھوٹے بھائی کا نام محمد طارق اور بڑے بھائی محمد جاوید القادری تھے وہ 1986ء میں انتقال کر گئے تھے۔یہ اللہ پاک کا فضل تھا کہ ہمارے بزرگوں کو دینی علوم، روحانیت اور اسلامی تعلیمات سے گہری دلچسپی اور وابستگی تھی، میرے

Marfat.com

والد ڈاکٹر فرید الدین

والد ڈاکٹر فرید الدین قادری اپنے وقت کے جید عالم، محقق، شاعر اور فاضل شخصیت تھے، انکا دیوان بعد میں گم ہو گیا اسلئے چھپ نہیں سکا۔ میرے والد ایلو پیتھک کے ساتھ ساتھ طب یونانی اور نبض کے فن کے بھی ماہر تھے، جب میں بچہ تھا تو والد کی ایک ایک دن میں ہزار ہزار روپے تک پریکٹس ہو جایا کرتی تھی، والد کم از کم بیس گھرانوں کو ماہانہ اخراجات مہیا کرتے تھے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے اور شاعری بھی کیا کرتے۔ والد صاحب دیہاتوں میں رولرز ہیلتھ سنٹرز اور مختلف ڈسپنسریز میں سروس کرتے رہے۔ میرے والد محترم کی شخصیت کے تین پہلو تھے، وہ ڈاکٹر اور طبیب بھی تھے، علمی، تحقیقی اور ادبی ذوق کے بھی مالک تھے اور ان میں روحانیت سے لگاؤ کا ایک جذبی بھی موجود تھا، اس لیے جس ماحول میں میری تربیت ہوئی وہاں مختلف چیزیں یکجا تھیں۔ میں اٹھارہ روپے ماہانہ فیس پر جھنگ کے سب سے اچھے سکول میں داخل ہوا۔ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اس لیے والد صاحب نے میری تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ میں بچپن ہی سے نماز پنجگانہ کا قائل تھا اور پرائمری جماعت کے زمانے سے ہی تہجد پڑھنا میرا معمول بن گیا تھا۔ یہ ایک تربیت کا فیض تھا کہ میرے اندر انتہائی کم عمری سے ہی روحانیت کا پودہ پرورش پا رہا تھا۔ 1966ء میں میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہوا۔ 1974ء میں جب آپ کے والد کا انتقال ہوا تو گورنمنٹ عیسیٰ خیل کالج میں لیکچرار تھا۔ اسکے بعد وکالت شروع کی۔ میری شادی مارچ 1975ء والدین کے طے شدہ رشتے کے مطابق ہوئی۔ میری بیوی حقیقی چچا زاد بھی ہے اس لیے میں ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شادی سے قبل میرے والد نے میری شادی کا طے کرنے سے پہلے باقاعدہ مشورہ کیا میں نے حامی بھر لی۔ میری شادی کا کوئی پہلو خلاف سنت نہیں تھا۔

پانچ سو سے زائد کتابوں کا مصنف ہوں۔ میں نے پنجاب یونیورسٹی سے علوم اسلامیہ میں نہ صرف گولڈ میڈل لیا بلکہ تمام آرٹس مضامین میں سب سے زیادہ نمبر لینے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ ہمارا نیٹ ورک دنیا بھر میں موجود

Marfat.com

ہے ،صرف جرمنی ہم پندرہ مساجد قائم کی ہیں۔ میں نے اپنے پورے تعلیمی کیریئر کم از کم فسٹ ڈویژن اور کئی جماعتوں میں گولڈ میڈل بھی حاصل کرتا رہا۔

''کبھی سیمنا جا کر فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا''؟ جی ہاں! میں نے سکول لائف میں ہی مذہبی رجحان رکھتا تھا، ان دنوں میں مدینہ منورہ، مناسک حج، میدان عرفات اور مکہ معظمہ کا نقشہ پیش کرتی فلم ''اللہ اکبر'' کو دیکھنے سیمنا گیا۔ اپنے بچپن کے بارے میں بتاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں بچپن میں بالکل شرارتیں کرتا تھا لیکن مثبت اور صحت مندانہ قسم کی۔ اس دور میں مجھے کھیلوں سے بھی دلچسپی تھی میں فٹ بال کا اچھا کھلاڑی تھا۔ اسکے علاوہ ولی بال اور دیگر گیمز میں معمولات میں شامل تھی۔

''کیا آپ کو غربت کے دن بھی دیکھنا پڑے''؟ یہ اللہ پاک کا خاص احسان ہے کہ مجھے نبی کریم ﷺ کی سنت کے مطابق غربت بلکہ ایسی غربت کہ آپ یقین کیجئے جب گھر فاقے کی نوبت آگئی ، دیکھنا پڑے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں لاء کالج ہوسٹل کا وارڈن تھا۔

قیادت اور نظام کی تبدیلی ملک کو غربت جہالت اور مایوسی سے نکالنے کا واحد راستہ ہے۔ کرسی اقتدار پر سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور رشتہ داروں کا قبضہ ہے۔ یہاں نہ غریبوں کا کوئی حقیقی نمائندہ ہے اور نہ ہی تعلیم یافتہ طبقے کی بھرپور نمائندگی موجود ہے، نہ کسانوں کا کوئی نمائندہ ہے اور نہ ہی کوئی تاجروں کی آواز۔ ایسے میں کہتا ہوں کہ جب تک عوامی انقلاب نہیں آتا اسوقت تک کسی کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ آج کے نوجوان کو خودکشی کے بجائے اس نظام سے بغاوت کرنی چاہیے، چونکہ یہاں نوکریاں اور حقوق چھین کے لینے سے ہی ملتے ہیں۔

Marfat.com

تختی اور سلیٹ سے شروع ہونے والا سفر وزیر اعظم ہاؤس تک آ پہنچا

میر ظفر اللہ جمالی کا نام ہر لحاظ سے ایک مکمل تعارف ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح کے محافظ سے بلوچستان کی تاریخ کے پہلے وزیر اعظم بننے تک انہوں نے ایک طویل سیاسی اننگز کھیلی۔ یکم جنوری 1944ء کو روجھان جمالی کے ایک جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام شہنواز خان جمالی ہے جو تحریک پاکستان کے ہراول دستے کے کارکن اور بانی پاکستان قائداعظم کے قریبی ساتھی جعفر خان جمالی کے بھائی تھے

ظفر اللہ جمالی نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں روجھان جمالی تحصیل جعفر آباد سے حاصل کی، اے لیول ایچی سن کالج لاہور جبکہ اولیول کا امتحان لارنس کالج گھوڑا گلی مری سے پاس کیا۔ جمالی نے 1963ء میں امتیازی نمبروں سے گریجویشن کرنے کے بعد یونیورسٹی آف پنجاب سے تاریخ میں ایم اے مکمل کیا۔ جمالی اپنی جوانی میں ''جبل خان'' کہلاتے تھے۔

قومی سیاست کے وسیع شجر میں سوکھ کر جڑ جانے والے پتوں کی جگہ جب نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں تو درخت پھر سے ہرے بھرے دکھائی دینے لگتے ہیں یہ مثال سابق وزیر اعظم ظفر اللہ جمالی پر بخوبی جچتی ہے جب 67ء میں انکے چچا میر جعفر خان جمالی کا انتقال ہوا تو ظفر جمالی نے سیاسی میدان میں اُتر کر اپنے خاندانی سیاست کے دیے کو نہ بجھنے دیا۔ جمالی کی عملی سیاست کا آغاز 70ء میں صوبائی اسمبلی کے الیکشن میں حصہ لینے سے ہوا۔ 77ء میں وہ بلا مقابلہ رکن صوبائی اسمبلی منتخب ہوئے اور صوبائی وزیر خوراک واطلاعات بنے۔ 82ء میں وزیر مملکت برائے خوراک وزراعت اور 86ء میں جونیجو حکومت کے پانی وبجلی کے وزیر رہے۔ ظفر اللہ جمالی دوبارہ وزیر اعلیٰ بلوچستان کے منصب پر بھی فائز رہے۔ 97ء میں سینیٹر اور 2002ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کے منور علی کھوسہ کے مقابلے میں 61107 ووٹ حاصل کر کے قومی اسمبلی کی نشست پر کامیابی حاصل کی اور پھر قومی اسمبلی سے 172 ووٹ لے کر وزارت عظمیٰ کے اہم ترین منصب پر فائز ہوئے۔ ضلع نصیر آباد میں کئی سالوں سے ظفر اللہ جمالی خاندان کے اقتدار کا سکہ ہی چل رہا ہے انہیں پوری سیاسی حیات میں صرف ایک بار نبی بخش کھوسو سے شکست ہوئی۔

قائد ایوان منتخب ہونے کے بعد انہوں نے اپنے خطاب میں پہلے کی حکومتوں کی طرح دشمنی کی

Marfat.com

سیاست کی روایت کوختم کرنے کا عزم کیا،قومی اسمبلی میں اپنے خطاب میں انہوں نے کہا ہم مخالفین کوجھوٹے مقدمات وغیرہ سے ڈرانے دھمکانے سے باز رہیں گے۔قومی اسمبلی گیلری میں بیٹھے انکی یہ باتیں میرے کچے ذہن کو حیران کررہی تھیں کیونکہ وہ غیر روایتی بولی بول رہے تھے۔انہوں نے اس دن واضح کیا تھا کہ وہ افہام وتفہیم کی سیاست کوفروغ دیں گے۔جمالی کا عزم انکی مثبت اورتعمیری سوچ کا آئینہ دارتھا۔اگرچہ میر ظفر جمالی کوایک سال آٹھ ماہ بعد وزیراعظم ہاؤس سے جانا پڑا مگر وہ اپنے پیچھے چندزندہ روایات چھوڑ گئے ہیں۔

جمالی اپنے بارے میں بتاتے ہیں کہ جب میں پانچ سال کا تھا تو والدہ وفات پاگئیں تھیں،ابتدائی تعلیم عام سے ماحول میں تختی اورسلیٹ سے شروع ہوئی،میں سٹوڈنٹ لائف میں جبل خان کے نام سے بھی مشہور تھا،جمالی بتاتے ہیں کہ 64ء کے صدارتی انتخابات میں جب مادرملت فاطمہ جناح اورایوب خان آمنے سامنے تھے مجھے میرے چچا جعفر خان جمالی نے انکا باڈی گارڈ مقرر کیا،یہاں سے ہی مجھ میں سیاسی جراثیم منتقل ہونا شروع ہوگئے تھے۔جوانی میں مجھے فوج میں جانے کا کافی شوق رہا،اس شوق کو پورا کرنے کیلئے میں نے 60ء میں پی ایم اے لانگ کورس کرنے کیلئے درخواست بھی دی لیکن مجھے کمیشن نہ مل سکا۔اس حوالے سے میر کا کہنا ہے کہ ایوب خان سے خاندانی سیاسی دشمنی نے مجھے فوج میں نہیں جانے دیا لیکن اب میرے دو بیٹے فوجی افسر ہیں جبکہ میرا بڑا بیٹا فرید اللہ جمالی میرا سیاسی جانشین بنا ہے جو 1997ء میں رکن قومی اسمبلی بھی رہا۔مجھے کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے،میں باآسانی اُردو،انگریزی ،بلوچی،سندھی،پنجابی اورسرائیکی میں گفتگو کرسکتا ہوں۔اتنی زبانوں کا مجھے ''مختلف اللسان'' لوگوں سے

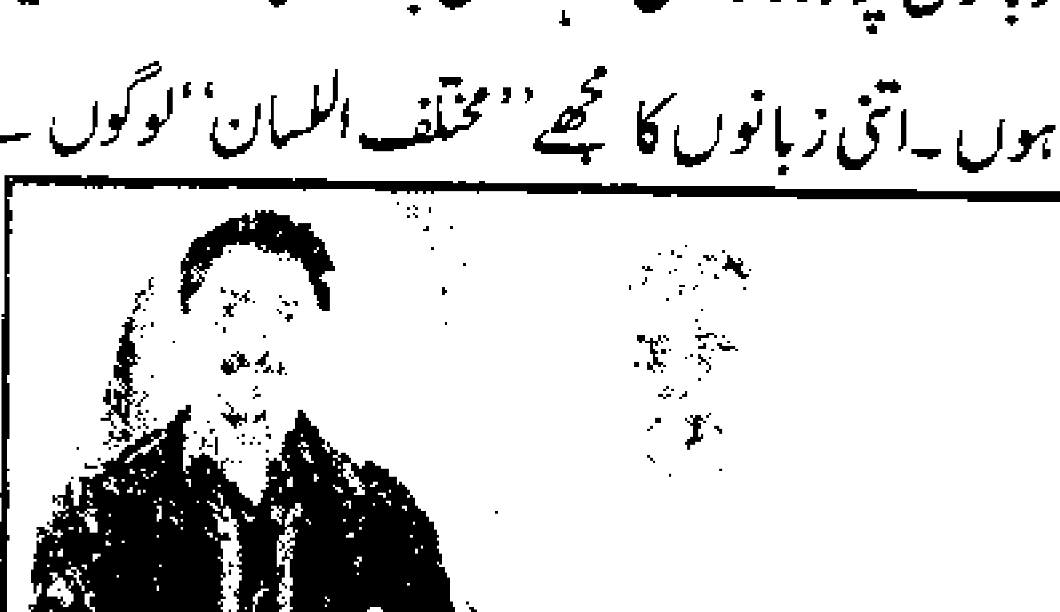

حنان علی عباسی سابق وزیراعظم پاکستان سے ملاقات کے دوران

بات کرنے کی سہولت فراہم کرتا ہے۔میری شناخت صرف سیاستدان کی نہیں بلکہ کھیلوں سے دلچسپی کے حوالے سے بھی کافی مشہور ہوا ہوں۔میں نے بین الاقوامی سطح پر ہاکی میں پاکستانی کی نمائندگی بھی کی ہے۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کھیلوں کے ساتھ گہرے لگاؤ کی بناپر مجھ میں سپورٹس مین شپ کی خصوصیات کی جھلک بھی نظر

Marfat.com

آتی ہے۔ میر ظفر اللہ جمالی ذاتی طور پر خوش وخرم زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر چہ جمالی قبیلے کے کئی بااثر افراد پیپلز پارٹی سے وابستہ رہے اور اب بھی ہیں لیکن ظفر اللہ جمالی کی وصف یہ ہے کہ انہوں نے کبھی مسلم لیگ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ ابھی تک تاحیات مسلم لیگ سے وابستہ رہے۔ قومی سیاست میں نواز شریف اور بے نظیر کے کردار پر بات کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ آئین کی حدود میں رہ کر حکومتیں چلاتے تو شاید انہیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتے۔ انہوں نے آئین سے تجاوز کیا جسکی وجہ سے مسائل پیدا ہوئے۔ میاں نواز شریف کو جنرل مشرف نے باہر بھیجا اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جمالی کا کہنا تھا کہ میں اس بات کا قائل ہوں کہ نواز اور بے نظیر دونوں کو پاکستان میں رہ کر سیاست کریں اسمیں جیل بھی ہے، ریل بھی۔ میر ظفر اللہ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے درمیان طے پانے والے معاہدے ''Charter of Democracy'' کو ''Barter of Democracy'' (جمہوریت کا لین دین) قرار دیتے ہیں۔

مسلم لیگ (ق) سے متعلق انہوں نے کہا کہ اس جماعت کو صدر مشرف سے جتنی سپورٹ ملی اسکی ماضی میں مثال نہیں ملتی مگر جمالی اعتراف کرتے ہیں کہ جس طرح (ق) کو کام کرنا چاہیے تھا وہ ایسے نہیں کر سکی ہے۔ بزرگ سیاستدان پیر پگاڑہ کے بارے میں بتاتے ہوئے جمالی کہتے ہیں کہ پیر صاحب پگاڑا کے ساتھ ہمارے خاندان کی پرانی نیازمندی ہے۔ اسمیں سیاست تو اب آئی ہے۔ 1930ء میں جب حُر انگریزوں کے مقابلے میں اُٹھ کھڑے ہوئے تھے تو ہمارے خاندان نے بھی انہی کا ساتھ دیا تھا۔ پیر صاحب کے والد کے زمانے سے ہمارا ایک تعلق چلا آ رہا ہے۔ ہم یہ رشتہ بڑے پیار، خلوص اور محبت سے نبھا رہے ہیں۔ پیر صاحب میری راہنمائی بھی کرتے ہیں اور دعا بھی۔ میر ظفر اللہ کے خیال میں بلوچستانی سیاست کے اہم کردار پیر صاحب پگاڑا، اور پنجابی سیاستدانوں چوہدری برادران میں نہیں بنتی۔ کئی سوالوں کا جواب جمالی کے اس جملے میں مل جاتا ہے کہ ارے بھائی! میں کچھ نہیں کہتا، چُپ رہنے والا آدمی ہوں۔

Marfat.com

سکول ٹیچر کا بیٹا ہوں،سید ظہیر الاسلام شاہ

سید ظہیر الاسلام شاہ لاکھوں ایسے پاکستانیوں کی طرح ہے جس نے دیئے کی روشنی میں جنم لیا، کچی مٹی کے گھر میں پرورش پائی لیکن قدرت نے اسکے حصہ میں علم سے لگاؤ کی دولت رکھی تھی جس نے اسے دوران ملازمت معمولی حثیت سے ترقی کرواتے کرواتے ایک اہم عہدے تک پہنچادیا۔ مطالعے کے جنون کی حد تک شوقین اس ضلعی انتظامی افسر کی ذات کے کئی پہلو ہیں،اسکی شخصیت کے ایوان میں داخل ہونیوالے جانتے ہیں کہ ظہیر کے اندر ایک عاجز انسان موجود ہے اور خلوص سے بھری ایک مسکراہٹ ہر وقت اسکی آنکھوں اور ہونٹوں پر کھیلتی نظر آتی ہے۔ بیوروکریٹ کہلانے والے اس باصلاحیت شخص کا تعلق کسی سرمایہ دار یا جاگیردار خاندان سے نہیں بلکہ ایک نچلے متوسط طبقے سے ہے۔ کچھ قارئین اس نام سے یقیناً واقف ہوں گے اور کئی کیلئے یہ نام بالکل نیا ہوگا......تو آیئے انہیں پوری طرح جاننے کیلئے ہم اس سفر کا جائزہ لیتے ہیں جو انہوں نے طے کیا۔

اپنی زندگی کے اوراق پلٹتے ہوئے ظہیر کہتے ہیں کہ میرے والد سید عبدلطیف شاہ مرحوم معلم تھے اور والدہ گھریلو خاتون ،جنہوں نے مجھے دینی ودنیاوی تعلیم سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ حق کا ساتھ دینے اور رزق حلال کمانے کی تلقین کی اور یہ بات سمجھائی کہ کردار انسان کی سب سے بڑی دولت ہے۔ ہمارا تعلق ہزارہ ڈویژن کے ضلع مانسہرہ کے سادات گھرانے سے ہے۔ ہمارا گھریلو اور خاندانی ماحول دینی تھا اور ہے لہذہ دین کی جانب رجحان فطری طور پر موجود تھا۔ انشاءاللہ تاحیات اسی راہ کا مسافر ہوں۔ میرے نزدیک دین انسان کے اندر رحم وکرم ،عفو درگزر، ایثار وقربانی، عدل وانصاف اور محبت وخلوص کے ایسے اوصاف پیدا کرتا ہے کہ انسان تمام

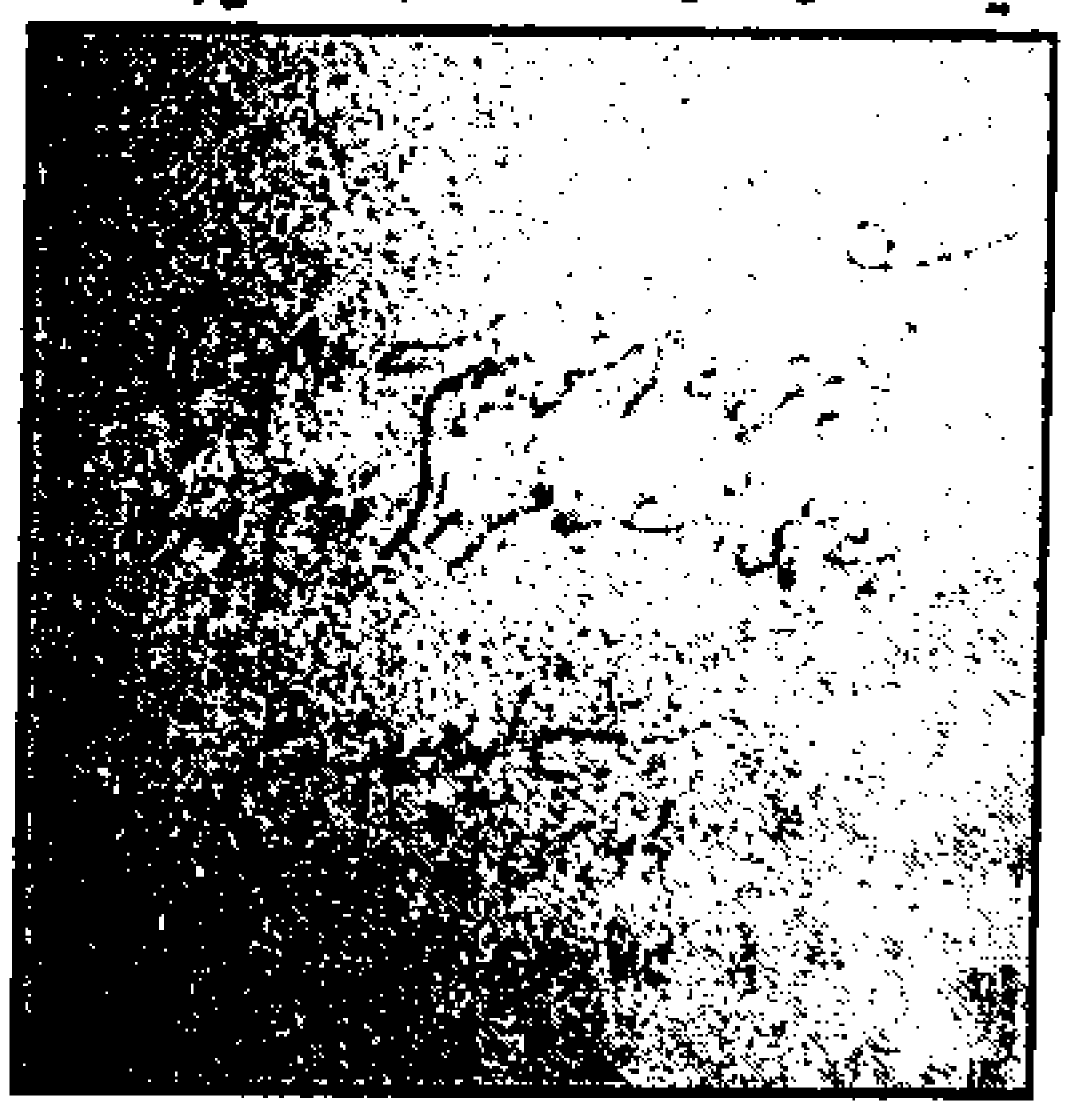

Marfat.com

ظہیر الاسلام انٹرویو دیتے ہوئے

اخلاقی اقدار کا امین بن جاتا ہے۔ بچپن گاؤں کے سادہ اور فطری ماحول میں اکثر ان سوچوں میں گزرا کہ معاشرے میں ایک مثبت تبدیلی کیونکر لائی جاسکتی ہے اور اپنے محدود وسائل کو بروئے کار لا کر اونچائی تک رسائی کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔ میرے بچپن کی سب سے حسین یاد والد محترم کا ہم دونوں بھائیوں کے بستے خود اُٹھا کر آگے آگے چلنا اور گھر سے دو کلومیٹر سکول تک کے راستے میں پہلے کلمہ شریف سے لے کر پوری نماز اور ایمان مجمل اور مفصل وغیرہ کی مشق کرانا تھی، والد صاحب پڑھاتے جاتے اور ہمارا سکول آجاتا اس طرح ہمارا سفر بھی کٹ جاتا اور وقت کا صحیح استعمال بھی ہوتا۔ بچپن ہی سے کچھ کر گزرنے کی آرزو نے تگ ودو کی راہ پر ڈال دیا تھا۔ جہاں تک میری تعلیم کی بات ہے میں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں وشہر میں حاصل کی اسکے بعد انجینیرنگ یونیورسٹی پشاور سے گریجویشن کے علاوہ مطالعہ پاکستان میں ایم اے اور ایم بی اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ شعروادب سے فطری اور پدری لگاؤ تھا مجھے ہر وقت اچھے شعر کی تلاش رہتی ہے۔ میدان تعلیم ہو یا عملی زندگی کا امتحان میں نے زندگی کے ہر دور میں بھرپور محنت کی، یوں سمجھئے اپنے چراغِ حیات کو تیل کے بجائے اپنے ہی خون کا ایندھن فراہم کیا ہے۔ جب علامہ اقبال کا یہ پیغام پڑھا کہ!

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کر دے

تو اس عشق جیسی شہ زور طاقت نے ہر مشکل آسان کر دی۔ میں نے اپنے سفر میں اُس ذات پاک کے کردار کو مشعل راہ بنانے کی کوشش کی جس نے جہالت کے تمام تر اندھیروں کو روشن اور درخشاں اُجالوں کا لباس پہنا دیا اور عدل وانصاف اور جدوجہد کا پیغام سنایا۔ اب بھی حضور ﷺ کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں اور اگر کچھ نہ ہوتا تب بھی ایسا ہی سپاہی ہوتا۔ یہ میری جہدِ مسلسل اور انتھک محنت کا ثمر ہے کہ آج میں انتظامی اُمور کی دنیا میں ایک مقام پہ ہوں۔ مجھے انتہائی کٹھن اور مشکل حالات میں اعلیٰ کارکردگی پر صدر پاکستان نے 23 مارچ 2002ء کو قومی اعزاز تمغہ شجاعت سے نوازا۔ پاکستان کی مجموعی صورتحال کے بارے میں میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا ملک اسوقت غیر تسلی بخش صورتحال سے گزر رہا ہے۔ افسوس ناک بات تو یہ

Marfat.com

گورنر سرحد علی اورکزئی سے تعریفی سند وصول کرتے ہوئے

ہے کہ ہر طرف بے یقینی کا عفریت بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ ہمیں چاہیے کہ ہم سنجیدگی سے مملکت خداداد کی کچھ فکر کریں چونکہ ''بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں پر''۔ رشوت ستانی، غلامی، بے انصافی، مہنگائی، بے روزگاری اور جہالت جیسے مسائل سے پاکستانی عوام دوچار ہے۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہماری قوم چھ دہائیوں میں اپنا کوئی تشخص پیش نہیں کر سکی۔ بلکہ بھیر بکریوں کے اس ریوڑ کی مانند بھٹک رہی ہے جسے چاروں اطراف سے بھیڑیوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ بحر حال!

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ سرکاری ملازمت کے باعث عملی سیاست میں حصہ نہیں لے سکا۔ عوامی خدمت کا اگر کوئی اس سے اچھا موقع بھی ملا تو میرٹ کا ہر شعبے میں عملی نفاذ کروں گا جب میرٹ ہوگا تو معاشرے سے خودبخود کرپشن کا خاتمہ ہو جائے گا۔ دوسرا دور حاضر میں تاحدِ نگاہ ایسی کوئی جماعت دیکھائی نہیں دیتی جسکی پیروی کی جا سکے۔ اپنے قلم سے مقامی لوگوں کے مسائل کو حل کی صورت دینے والے اس انتظامی افسر سے جب میں اسکی ''انتظامی کوتائیوں'' پر بات کرتا ہوں تو جواب ملتا ہے کہ میں بھی اپنی زندگی میں غلطیوں اور خامیوں کا شکار بھی ہوا ہوں، چونکہ انسان خطا کا پتلا ہے اور ہمیشہ خسارے میں ہے، بندہ ناچیز کو بھی ایسا ہی سمجھیں۔ البتہ گناہ کبیرہ سے اللہ تعالی نے بچائے رکھا۔ ایک سوال پر انہوں نے کہا کہ مایوسی کا مقابلہ میں نے ہمیشہ اپنی قوت ایمانی سے کیا، جسکا منبع قرآن ہے، قرآن مجید فرماتا ہے کہ ترجمہ ''اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو''۔ ظہیر اس بات پہ زور دیتے ہیں کہ ہمیں حصارِ ذات سے نکل کر اجتماعی سوچ اپنانے کی ضرورت ہے۔ پاکستانی جمہوریت پر بات کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اپنے وطن کی جمہوریت کے بارے میں کیا کہوں؟

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

یہ وہ سراب رنگ و بو ہے جسے ہم آشیاں سمجھ بیٹھے ہیں۔ پھر پاکستانی جمہوریت تو خودغرضی، نورا کشتی اور مداری کے بچے ''جمورے'' کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ جمہوریت ہے جسمیں! بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔

Marfat.com

سوچ بھی بغاوت ٹھہری

انسان میں ہمت کی دولت موجود ہو تو وہ کامیابیوں کے سفر پر نکلتے ہوئے گھبرا کر ہتھیار نہیں پھینکتا بلکہ سخت ترین حالات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے تنگ دستی اور وسائل سے محرومی کو مات دے کر آسودگی پالیتا ہے۔ کچھ اسی طرح کا احساس جنرل (ر) ظہیر الاسلام عباسی کے اوراقِ زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے ہوتا ہے۔ بے شک کچھ بننے کی انسانی خواہشیں بچپن ہی سے آجاتی ہیں لیکن اس عمر میں انکا دائرہ کار بہت محدود ہوتا ہے، اسی لیے کبھی کوئی پرنس کے بجائے ''پٹواری'' بننا چاہتا ہے مگر عمر میں پختگی اس کی خواہشات کا کینوس وسیع کر دیتی ہے.....یعنی انسان بھی مچھلی کی طرح جب تالاب سے نکل کر سمندر میں آتا ہے تو اسکی کیفیات بدل جاتی ہیں لیکن محور ہر صورتحال میں انسان کا بہتر مستقبل ہی ہوتا ہے۔ ہزارہ کے گاؤں ہلی کا بچہ ظہیر الاسلام بچپن میں پٹواری بننے کی خواہش کا اظہار کرتا تھا مگر بعد میں اسکی آنکھوں کے سامنے جب نئی دنیائیں آئیں تو اسکی جستجو کی پیاس بڑھتی چلی گئی۔ منزل تک پہنچنے کیلئے راستے میں آنے والے بھاری پتھروں کو تراش کر خود آگے بڑھنے کا راستے بنانے والوں میں ایک نام ظہیر الاسلام کا بھی نام ہے۔ ظہیر الاسلام نے لندن یونیورسٹی سے ''وار سٹیڈیز'' میں ایم اے اور انٹرنیشنل ریلیشنز اور سیاسیات میں بھی ماسٹر کیا اسی طرح سٹریٹجک سٹڈیز میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے سٹاف کالج کوئٹہ، انفنٹری سکول کوئٹہ، پی اے ایف سٹاف کالج، اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد اور نیوی سٹاف کالج میں لیکچر بھی دیئے اور انہوں نے ''The Islmic concept of leadership and pak army'' اور ''Indian mind and pak army'' کے موضوع پر دو مقالے بھی لکھے ہیں۔ دہلی میں پاکستانی سفارتخانے میں ڈیفنس اتاشی بھی رہے۔ بھارت میں قیام کے دوران انہیں گرفتار کیا گیا اور ''ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر پاکستان واپس بھیج دیا گیا۔ ظہیر کو ''ہلال امتیاز'' کا نشان بھی عطا کیا گیا۔ دین سے لگاؤ انہیں ورثے اور

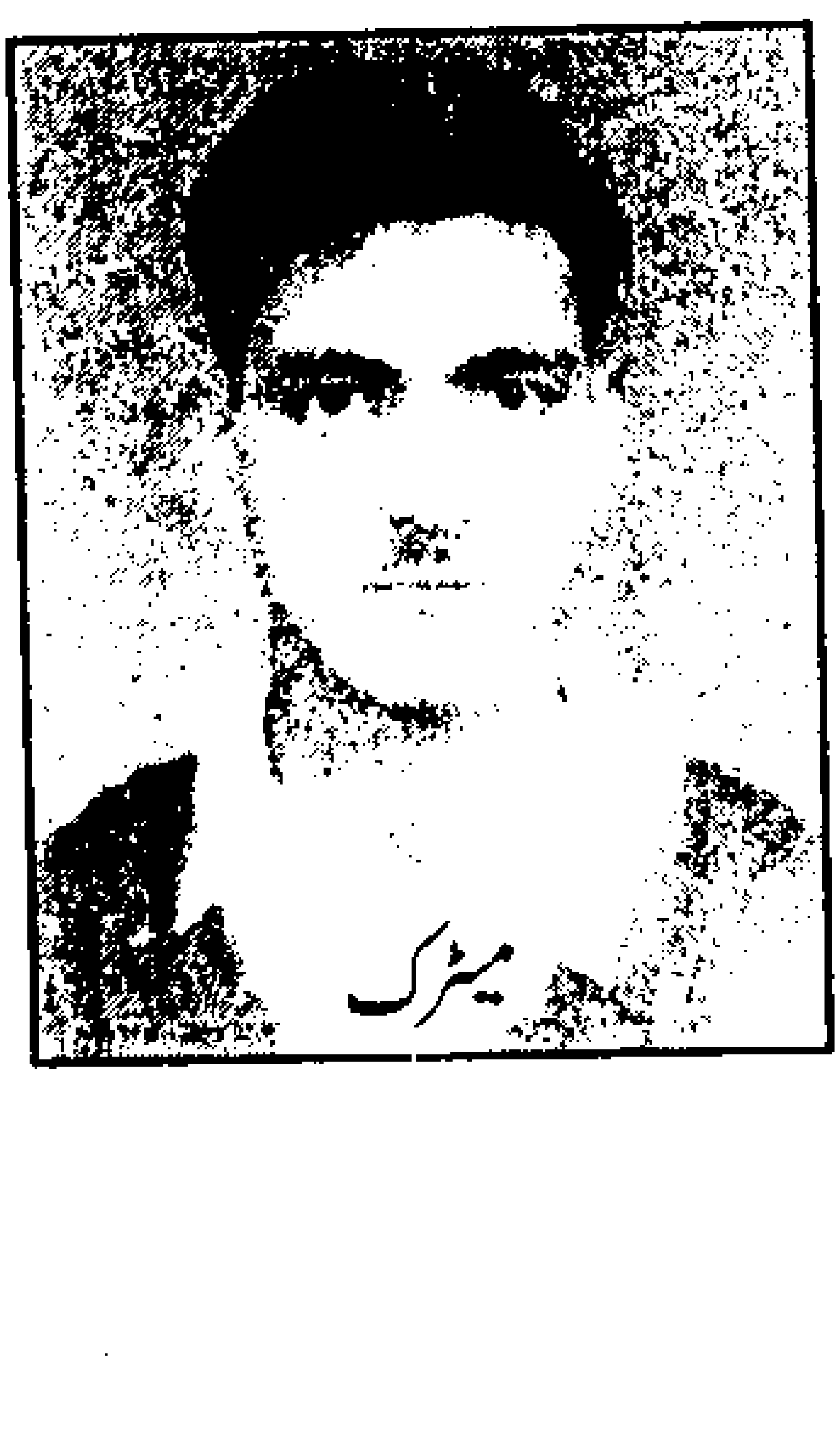

میٹرک

Marfat.com

آپریشن خلافت کے مرکزی کردار جنرل ظہیر سے حسان علی کی ایک ملاقات

ماحول سے ملا۔ یوں تو ظاہری طور پر ہر انسان بند لفافے کی مانند ہے، کوئی نہیں جانتا کہ اس کے اندر کیا پوشیدہ ہے اور جنرل عباسی بھی آخر انسان ہیں۔ میں نے جنرل عباسی سے ''زمینی ستارے'' کے حوالے سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے فوری طور پر میری اس خواہش کو تکمیل کا رنگ پہنایا اور بہت سے اُن پوشیدہ پہلوؤں کو عیاں کیا، انکی گفتگو پیشِ خدمت ہے۔

میری پیدائش خانپور ہزارہ کے ایک پسماندہ گاؤں ''ہلی'' میں ہوئی جہاں غلامی کے اثرات نمایاں تھے۔ میں قریباً چار یا پانچ برس تک قوت گویائی سے محروم رہا میرا خاندان مجھے ذہنی طور پر ایک گونگے بچے کے طور پر تسلیم کر چکا تھا کہ ایک دن اچانک اللہ تعالیٰ نے مجھے بولنے کی قوت سے نوازدیا، پھر میری زبان سے مجھے گویائی بخشنے والی ذات نے ایسے ایسے کام لیے جنکا تصور کر کے مجھے خود حیرت ہوتی ہے۔ ہمارے وقتوں میں تاریخ پیدائش لکھنے کا رواج نہیں تھا، سرکاری ریکارڈ کے مطابق میں بارہ جنوری انیس سو تینتالیس کو پیدا ہوا۔ میرے والد الٰہی بخش خان عباسی اور دادا رستم خان عباسی راسخ العقیدہ مسلمان تھے جنہوں نے مل کر میرا نام ''ظہیر الاسلام'' رکھا۔ قران پاک میں نے والد مرحوم سے پڑھا۔ پانچ سال کی عمر مجھے لوئر مڈل سکول برکوٹ میں داخل کروایا گیا جہاں میں روزانہ تقریباً سات کلومیٹر پیدل جاتا اور چھ برس تک کئی بار میں ننگے پاؤں سکول گیا، ان محرمیوں کے باوجود میں ہمیشہ سکول میں فرسٹ آتا۔ آج جب اپنی تعلیمی مشکلات پر نگاہ دوڑاتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ میں یہ مرحلے عبور کر چکا ہوں۔

ہمارا علاقہ فطرت کے خوبصورت مناظر سے مالا مال تھا، اگر کسی بھی محکمے کا کوئی افسر آجاتا تو اس کی اتنی خوشامد کر جاتی کے کہ میں متاثر ہو جاتا، بچپن میں علاقے کے پٹواری سے میں بہت متاثر تھا جسکی لوگ بہت عزت کرتے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا تو مجھ سے کسی نے سوال کیا کہ بڑے ہو کر کیا بنو گے تو میں نے کہا ''پٹواری'' چونکہ اسوقت مجھے دنیا کو دیکھنے کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا اس لیے پٹواری بچپن سے نمایاں طالب علم تھا اللہ نے ہر موقع پر بہت کچھ دیا۔ میرے والد اور بڑے بھائی میرے لیے رہنمائی کا تاج تھے۔ خدمات کا اعتراف صلاحیتوں میں اضافہ کرتا ہے میرے ساتھ یہ معاملہ خاص طور پر ہوا۔ میں باسکٹ

Marfat.com

بال ٹیم کا کپتان اور سکول کا ہیڈ بوائے بھی رہا۔ چھٹی جماعت پاس کر نے کے بعد جب میں گورنمنٹ ہائی سکول لورہ میں داخل ہوا تو احساس کمتری کا شکار تھا چونکہ میں یہاں بہتر ماحول میں آیا تھا اور یہ ہمارے گھر سے پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اسلیئے یہاں ہاسٹل میں رہائش پزیر ہوا، تاہم پوزیشنز نے میرا حوصلہ بڑھایا، مجھے وظائف بھی ملے اور میں نے اپنی امتیازی حثیت قائم رکھی۔ ان برسوں میں فن تقریر میں مہارت حاصل کر لی اور پھر تقریر میں ہزارہ ڈویژن کی نمائندگی کی۔

آٹھویں میں مجھے 7 روپے سکالرشپ ملا جو میٹرک میں 20 روپے ہوا۔ میٹرک کا امتحان چھ سو باون نمبر لیکر میں نے فسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا، یہ میری زندگی میں دوسری بار تھی جب میں احساس کمتری کا شکار ہوا کیونکہ میں دیہاتی سکول سے میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں ایف ایس ای پری میڈیکل میں داخلہ لیا۔ یہاں اللہ کے فضل سے نہ صرف اچھا طالبعلم رہا بلکہ کالج یونین کا صدر بھی چن لیا گیا۔ میرے والد حکیم تھے وہ چاہتے تھے کہ میں ڈاکٹر بن جاؤں اسی لیے میں نے انٹرمیڈیٹ میں میڈیکل کی تعلیم حاصل کی۔ ایوب خان کے ابتدائی دور میں فوج کی بڑی عزت تھی۔ ایف ایس سی کے بعد میرے بڑے بھائی کپٹن رتاج محمد نے رہنمائی کی میں فوج میں آجاؤں۔ میں نے والد صاحب سے کہا کہ مجھے اجازت دیں کہ فوج میں چلا جاؤں، افسر بن کر ملک وقوم کی خدمت کروں گا، والد نے رضامندی ظاہر کر دی اور میں نے میڈیکل کالج سے پی ایم اے کاکول کا رخ کیا۔ کاکول کے اڑھائی سال مشکل مگر جلدی گزر گئے۔ اسکے بعد جہاں مجھے کمیشن ملا وہیں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ بی اے کی ڈگری بھی مل گئی۔

60ء میں میری سلیکشن ہوگئی، پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں ہماری اڑھائی سال ٹریننگ ہوئی یہاں پاکستان کی مشہور درسگاہوں کے طالب علم تھے اور الحمد للہ ادھر بھی میری امتیازی حثیت قائم رہی۔ مجھے فوج میں شمولیت کے وقت اُمید نہیں تھی کہ میں کوئی بڑا افسر بن جاؤں گا۔ لیکن مختلف تربیتی مراحل سے گزر کر حوصلہ بڑھتا گیا اور ترقی کے مواقع ملتے رہے۔ ہمارے خاندان نے تحریک پاکستان میں پورے جوش وجذبے سے شرکت کی۔ ظہیر عباسی ایک لمحے یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ ”میں کہتا ہوں کہ ہر بڑا بندہ بُرے حالات سے گزر کر کامیابی وعروج کی منزل تک پہنچتا ہے۔

انسان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے کیا بننا ہے۔ میں بچپن سے مقابلے کی دوڑ میں اگے بڑھنا

Marfat.com

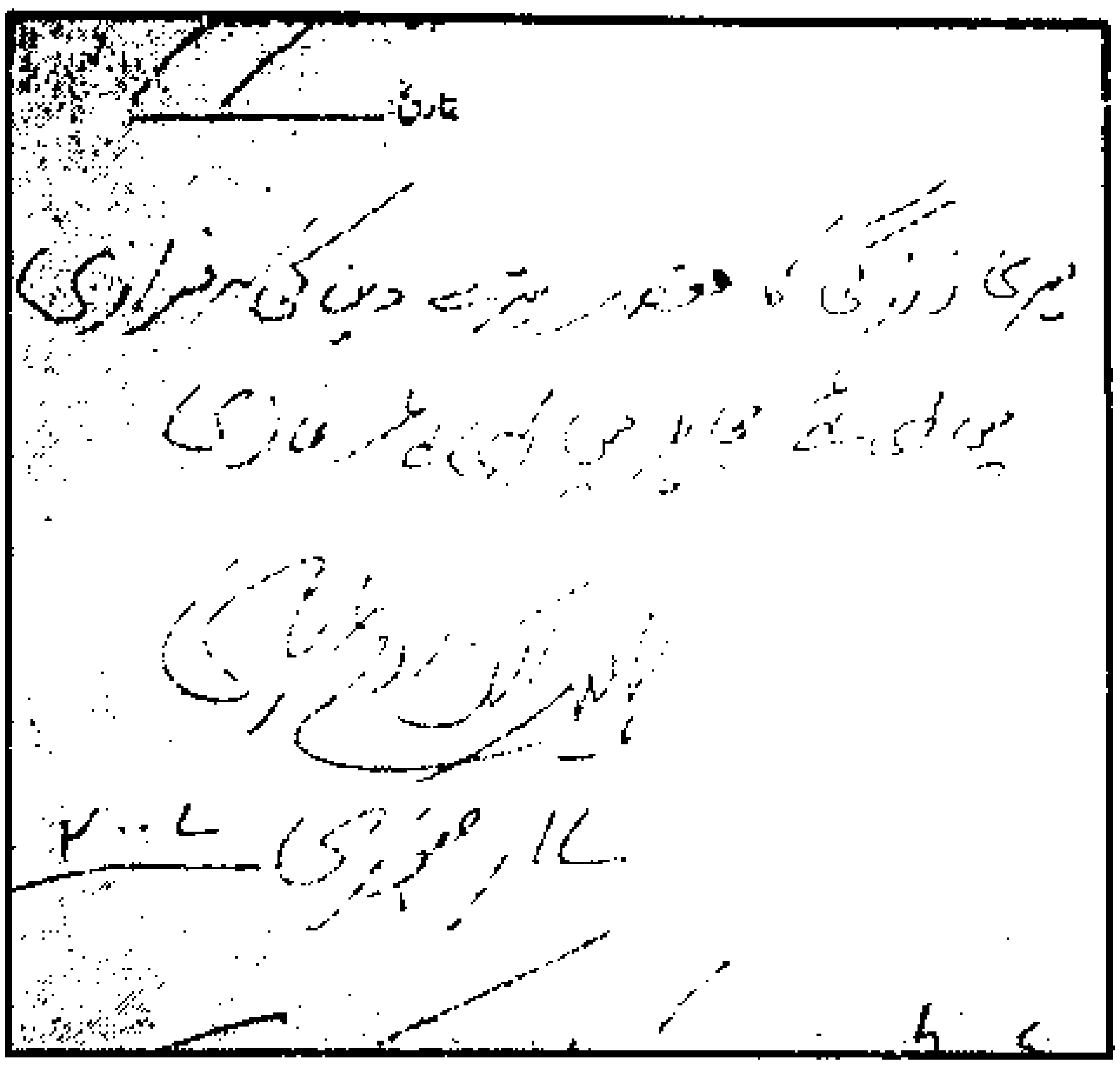
تاریخ

چاہتا تھا۔اپنی مشاہداتی زندگی میں مجھے احساس ہوا کہ باصلاحیت ہر انسان ہوتا ہے لیکن ہر کوئی اپنے اندر کی صلاحیت کی پہچان نہیں کرتا۔ جسے جسے میں مختلف مراحل سے گزرا مجھے شدت سے احساس ہوا کہ صرف ''پٹواری'' ہی میری منزل نہیں ہے میں نے اور بھی بہت کام کرنے ہیں۔ ہمارے بے شمار نوجوان زندگی بھر اپنے اندر موجود صلاحیت کی پہچان نہیں کر سکتے۔ میری ابتدائی سروس ہی میں فوج کو آزادی کشمیر کے مواقع ملے لیکن اسوقت کی قیادت اخلاص، دانش اور مجاہدانہ خوبیوں سے محروم تھی اسلیئے یہ مواقع فائدہ مند ثابت نہ ہو سکے۔

ہماری تحریک کی پہلی کوشش موجودہ دینی تحریکوں کو ایک کرنا ہے۔ اس حوالے سے میں کبھی نہیں کہتا کہ مجھے امیر المومنین بنایا جائے، اسلام میں ایسی خواہش رکھنا جائز نہیں۔ میرے خیال میں امیر بننے کی خواہش ہی دینی جماعتوں کے ایک امیر کی قیادت میں کام کرنے میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ یہ دینی قوتیں تسبیح کے دانے ہیں ہم نے ان کو ایک لڑی میں پرونا ہے، اسکے لیے میں خود کو قیادت کیلئے پیش نہیں کرتا۔ وحدت قائم کرنے کیلئے اگر تمام چھوٹی بڑی جماعتوں کے امام اگر یہ اعلان کردیں کے وہ دینی جماعتوں کے اتحاد کیلئے اپنے آپ کو کارکن کے طور پر پیش کرتے ہیں تو نفاق بھی ختم ہوسکتا ہے اور ایک امیر بھی سامنے آسکتا ہے۔ اس طرح کروڑوں مسلمان بکھرے ہیروں کو جو کسی جماعت کی رکنیت نہیں رکھتے کو اس پلیٹ فارم پر اکھٹا کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ برصغیر میں انگریز نے لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی اپناتے ہوتے مسلمانوں کے اتحاد کو تباہ کرنے کیلئے ان کے فرقے بنائے۔ انہوں نے یہ واضح کیا کہ ایجنسیاں علماء کرام کو آپس میں نہیں لڑاتیں ایسے کام بیرونی فنڈز سے ہوتے ہیں یا انکے پیچھے کوئی اور ہوتا ہے اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ پاکستانی ایجنسیاں فرقہ وارانہ فسادات نہیں کرواتیں کیونکہ کوئی بھی حکومت ملک میں امن وامان خراب نہیں کرنا چاہتی۔

چکالہ سکیم تھری میں اپنے گھر میں بیٹھ کر انہوں نے اس عزم کا اعادہ کیا کہ جس دن اللہ ہمیں

Marfat.com

طاقت دے گا پاکستان کو ویلفیئر سٹیٹ بنائیں گے۔ ہم معشیت کو آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے چنگل سے آزاد کرائیں گے اور خود انحصاری کے نظام پر مبنی ایسی پالیسز بنائیں گے جسمیں کم از کم ملازمین کی تنخواہ دس ہزار روپے مقرر ہوگی۔

میں جنرل عباسی سے پوچھتا ہوں کہ آپ بتائیے کہ آپ نے جو خلافت آپریشن کا منصوبہ تیار کیا اور اسکا پس منظر کیا تھا؟ مسکراتے ہوئے کہا کہ ہم پر بے نظیر بھٹو نے الزام لگایا کہ ہم اسکے بچوں کو مارنا چاہتے تھے، اس ظالمانہ الزام کے ساتھ فضول باتیں بھی پیش کیں گئیں، یہ کہا گیا کہ ہم نے بارہ سے ہتھیار منگوائے، میرا سوال یہ ہے کہ کیا اس سے کوئی بغاوت یا پاکستانی فوج کے خلاف جنگ ہوسکتی ہے؟ جنرل ظہیر کے مطابق عدالت میں جو ہتھیار لائے گئے ان میں میگزینز تک موجود نہیں تھیں، گرنیڈوں کے اندر نہ سیفٹی پن تھی اور نہ ہی بارود تھا، ایسے ہتھیاروں سے کیسی بغاوت ہوسکتی تھی بحرحال ہم اسلامی نظام کے نفاذ کی سوچ رکھتے تھے شاید اسی ''جرم'' کی پاداش میں ہمیں اتنی سزا دی گئی جتنا ہم نے قصور نہیں کیا تھا۔ انیس سو پچانوے میں اپنے اوپر بننے والے ''بغاوت کیس'' کے حوالے سے انکا کہنا ہے کہ ''بغاوت کی کوئی سازش تیار نہیں کی بلکہ یہ کیس خود انکے خلاف ایک سازش تھا جسمیں کچھ بین الاقوامی قوتیں شریک تھیں''۔

Marfat.com

عالم آن لائن

''جیو''ٹی وی کے منفرد مذہبی پروگرام''عالم آن لائن'' سے شہرت کی بلندیوں تک پہنچنے والے

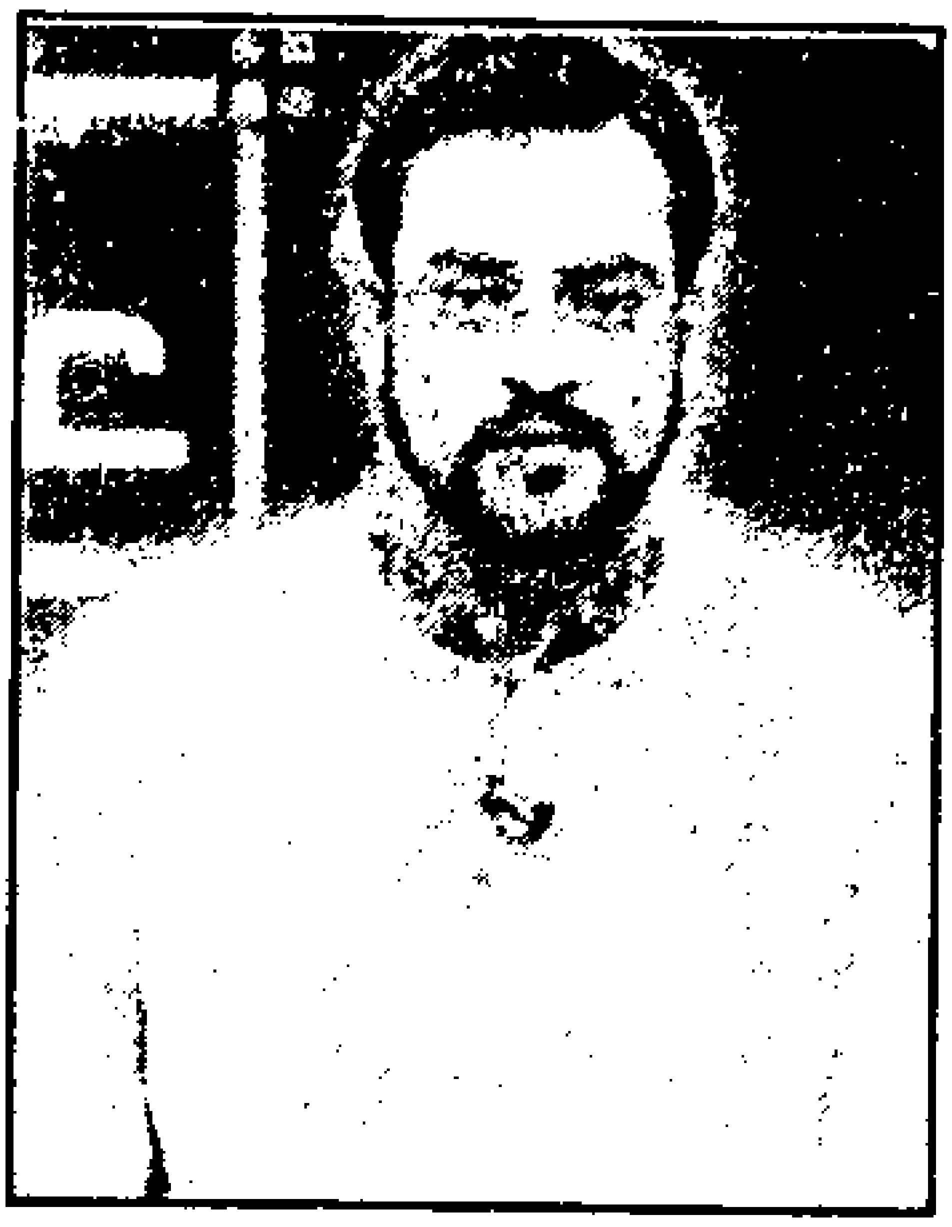

عامر لیاقت حسین 5 جولائی 1971ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔نعت خوانی میں بھی خوب نام کمایا اور متحدہ قومی موومنٹ کے پلیٹ فارم سے سیاست بھی کی 2002ء کے عام انتخابات میں ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوئے اور وزیر مملکت برائے مذہبی امور کے طور پر بھی فرائض سر انجام دے ہی رہے تھے کہ 4 جولائی 2007ء کو اچانک مستعفی ہو گئے۔جنرل مشرف کہتے ہیں کہ میں ڈاکٹر عامر کا بہت بڑا فین ہوں۔انہوں نے گستاخ رسول سلیمان رشدی کے خلاف بھرپور آواز اُجاگر کی۔انکی پی ایچ ڈی پر تو سوالات بھی اُٹھے مگر نوجوان عامر لیاقت نے اپنی آواز کی خوبصورتی اور الفاظوں کی طاقت سے کافی حد تک یہ ثابت کر دیا ہے کہ انہیں جو عزت مل رہی ہے وہ اسکے مستحق ہیں۔ڈاکٹر عامر ابتدائے عمر سے ہی اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث خاندان میں اعلیٰ درجے کے منتظم اور ذمہ دار فرد کی حثیت سے پہچانے جاتے۔آپ نے ایک دینی اور سیاسی گھرانے میں پرورش پائی، عشق مصطفیٰ ﷺ میں ڈوب گئے۔

میں نے روزنامہ پرچم کے ایڈیٹر کے طور پر بھی کام کیا، ریڈیو ایشیاء کا پروگرام ڈائریکٹر بھی رہا، جب جیو شروع ہوا تو میں اس کا پہلا نیوز کاسٹر تھا۔متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کے پلیٹ فارم سے میں نے سیاست شروع کی اور قومی اسمبلی کی نشست پہ کامیابی ملی۔

Marfat.com

ایک دن آئے گا......!

پاکستان ہیومن رائٹس کمیشن کی چیرمین عاصمہ جہانگیر پاکستان میں انسانی حقوق کے حوالے سے صفِ اول کی وکیل تسلیم کی جاتیں ہیں، عاصمہ1952ء میں لاہور میں پیدا ہوئیں، اپنے والد ملک غلام جیلانی کے مقدمات میں بچپن سے ہی عدالتوں اور جیلوں کے چکر کاٹتی رہیں، عاصمہ نے جب ہوش سنبھالا تو قانون دان بننے چاہا، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ قانون کی کتابیں پڑھنے سے قبل ہی ماہر قانون بن چکی تھیں۔ عاصمہ جہانگیر نے صرف اٹھارہ سال کی عمر میں اپنے والد کو جیل سے رہائی دلانے کی پہلی پیٹشن دائر کی۔ وکیل بن کر عاصمہ جب سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنا ہی نہیں ثابت کرنا بھی سیکھ لیتی ہے تو اسکی وکالت صرف ذات تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ وہ معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف اپنی آواز اُجاگر کرنا شروع کردیتی ہے۔ وہ عورتوں کی آزادی، بچوں پر تشدد کے خاتمے اور غریب مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کیلئے بولتی ہے۔ ایوب خان کے خلاف عورتوں کے جلوس کی قیادت کرنے پر اسے کالج سے نکال دیا جاتا ہے۔ وہ ضیاءالحق کے حدود آرڈیننس کے خلاف اپنے دانت تک تراش بیٹھتی ہے، انکے کردار کو علامت بنا کر انڈین فلم ''ویرزابرہ'' بنائی گئی۔ اپنے گھر کو قانونی تحفظ فراہم کرانے کیلئے شروع ہونیوالی یہ جہدوجہد آج بے شمار بے گناہوں کو تحفظ فراہم کرکے بھی جاری ہے۔

عاصمہ جانگیر کے مطابق انکے والد نے 62ء میں سائیوال سے الیکشن لڑا، وہ زندگی بھر اپوزیشن کی سیاست کرتے رہے، مارشل لاء سے بھی لڑے، کئی سال جیل میں رہے۔ ہم نے اپنی ابتدائی میں بس عدالتیں اور وکیل ہی دیکھے کیونکہ اتنی بار تو والد بیمار نہیں ہوئے جتنی بار انہیں جیل میں بند کیا گیا۔ میں اپنے والد کو آزادانہ ماحول میں نہیں دیکھ پائی۔ میں نے اپنے گھر غربت دیکھی، گولی چلنا دیکھی اور یہ بھی دیکھا کہ حکومت سے ٹکر لینا کتنا مشکل کام ہے۔ میں نے بچپن میں ہی دیکھ لیا تھا کہ حکومت اگر کرنا چاہے تو کیا کرسکتی ہے اور کیا نہیں۔ سمجھتی ہوں کہ چمٹے سے کوئلہ تو پکڑا جاسکتا ہے مگر شعلہ نہیں۔ میرے تلخ بچپن نے

Marfat.com

میرے اندر سے خوف اور ڈر کو مٹا کر اسمیں فائٹنگ سپرٹ ڈال دیا۔ ہماری ماں اسوقت ایک کالج میں پڑھاتی تھیں جب صرف چند مسلمان خواتین اعلیٰ تعلیم کی طرف آتیں۔

1981ء میں اور میری بہن حناء جیلانی نے پاکستان میں پہلی آل وومن لاء فرم قائم کی۔ 82ء میں مجھے کم سن شیر دِل عورت کہا گیا۔1986ء میں پاکستان میں پہلا ''لیگل ایڈ'' سنٹر شروع کیا۔

مجھے ملک کی پہلی خاتون جج کا اعزاز مل رہا تھا لیکن یہ پیشکش ٹھکرادی۔95ء میں مجھے حکومت پاکستان نے ''ستارہ امتیاز'' سے نوازا۔ مجھے امریکن بار ایسو سی ایشن انٹرنیشنل ایوارڈ1992ء بھی دیا گیا۔ سال2002ء مجھے اور حناء جیلانی ''ملینیم پیس پرائز'' سے نوازا گیا۔ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انسانی حقوق کا نمائندہ مقرر کیا گیا۔ عاصمہ کے خیال کے مطابق عورت مرد کے بنائے ہوئے معاشرے کی غلام ہے۔

Marfat.com

میں نے انگریز سائنسدانوں کی پچاس سالہ تحقیق کو غلط ثابت کر دکھایا

سماج میں کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بلند پہاڑ پر بیٹھ کر مٹی سے اپنا رابطہ نہیں توڑتے.....

ڈاکٹر عطاء الرحمن کا شمار پاکستان کے اُن گنے چنے سائنسدانوں میں ہوتا ہے جو بین الاقوامی اُفق پر منفرد

شناخت رکھتے ہیں۔42ء میں دہلی میں ممتاز بزنس مین اور وکیل جمیل الرحمن کے گھر پیدا ہوئے۔ پاکستان میں سائنسی خدمات کے عوض ملنے والا کون سا اعزاز ہے جو عطاء کو عطا نہیں ہوا، انہیں سائنسی خدمات پر جنرل ضیاء الحق کے ہاتھ سے ''تمغہ امتیاز''، میاں نواز شریف سے ''ہلال امتیاز''، بے نظیر دور میں ''ستارہ امتیاز''، جبکہ اعلیٰ ترین اعزاز ''نشان امتیاز'' جنرل پرویز مشرف کے ہاتھوں سے ملا۔ آپ دو سال تک سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے وفاقی وزیر بھی رہے۔ آپ بلڈ پریشر، ہارٹ اٹیک اور متعدد بیماریوں کی ادویات دریافت کر چکے ہیں۔ اپنے خاندانی پس منظر اور ماضی کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عطاء بتاتے ہیں کہ میرے دادا سر عبدالرحمن مدراس ہائی کورٹ کے جج اور دہلی یونیورسٹی کے پہلے مسلمان وائس چانسلر تھے۔ ہمارا خاندان قیام پاکستان کے وقت ہجرت کر کے لاہور آیا، کچھ عرصہ بعد ہمارے والد نے اوکاڑہ میں فیکٹری شروع کی تو ہم یہاں آ گئے، ہمارے ساتھ حیدر آباد دکن پبلک سکول کے پرنسپل سید تجمل حسین بھی ہجرت کر کے لاہور آئے تھے، انہیں میرے والد اپنے ساتھ اوکاڑہ لے آئے۔ تجمل صاحب نے مجھے گھر پر غیر رواتی تعلیم دی، انہوں نے میرے تجسس کو بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔1951ء میں ہم کراچی چلے گئے، اسوقت میری انگریزی خاصی کمزور تھی۔ مجھے کراچی گرائمر سکول کے دوسرے درجہ میں داخلہ ملا۔ یہاں امتحان میں 26 بچوں میں سب سے آخری نمبر میرا تھا چونکہ اس تعلیمی ماحول کو پوری طرح سمجھ نہیں سکا تھا۔ اسکے بعد میری پوزیشن بہتر ہوتی گئی اور میں نے تیسری جماعت سے پانچویں میں چھلانگ لگا دی اور اپنی جماعت میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ میں نے زندگی میں چیلنج اور مشکلات قبول کی ہیں۔ اولیول کے امتحان میں کیمیا، اور طبعیات کے علاوہ تمام مضامین میں نمایاں رہا۔ یہاں میں نے فیصلہ کیا کہ ان مضامین میں اچھی کارکردگی دکھاؤں گا۔ پھر میں مرحلہ وار اس میدان میں کامیابیاں حاصل کرتا رہا۔ میں نے 1963ء میں بی ایس سی آنرز اور پھر پہلی پوزیشن کے ساتھ ایم ایس سی مکمل کیا۔ تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ میری ٹینس اور ٹیبل ٹینس میں خصوصی دلچسپی رہی۔ میں 80 کے قریب

Marfat.com

اہلخانہ کے ہمراہ

کتابوں اور عالمی تحقیقی جرائد میں بے شمار تحقیقی مضامین لکھ چکا ہوں۔ میری ایک کتاب کو جاپانی یونیورسٹی لیول پہ نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ حکومت پاکستان نے مجھے تمغہ امتیاز، ستارہ امتیاز، اور ہلال امتیاز عطا کیا۔ عالمی سطح پر بھی یونسکو ایوارڈ، اسلامک میڈیسن پرائز اور ایران کا قومی اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ میری تحقیق نے برطانوی سائنسدانوں کی پچاس سال سے رائج تحقیق کو غلط ثابت کر دکھایا۔ مجھے دنیا کی چار مختلف جامعات نے سائنس کے میدان میں شاندار کام کے اعتراف میں ''ڈاکٹر آف سائنس'' کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ میرے خیال میں انسان اپنے تجسس اور علم کی پیاس کو قائم رکھ کر ترقی کی معراج تک پہنچ سکتا ہے۔ سائنس کے میدان کسی سائنسدان کیلئے سب سے پُر جوش عنصر یہی ہوتا ہے کہ وہ غور و فکر کے سہارے نامعلوم سے معلوم کا سفر کرے۔ کچھ عوامل نے میری زندگی میں اہم کردار ادا کیا، ان میں سے ایک میرے والدین ہیں کیونکہ انہوں نے انتہائی احسن طریقے سے میری تعلیم و تربیت کی، خصوصا میری والدہ کی دعائیں ہیں، دوسرے میرے اساتذہ خواہ وہ پاکستان سے ہوں یا باہر سے انہوں نے میری صلاحیتوں کو نکھارنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ تیسرا نام پروفیسر ڈاکٹر سعید الزمان صدیقی کا ہے جنہوں نے کم عمر ہونے کے باوجود میری بے حد حوصلہ افزائی کی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک بار کہا تھا کہ میری سب سے بڑی دریافت ڈاکٹر عطاء الرحمٰن ہیں۔ اسکے علاوہ ڈاکٹر اقبال چوہدری، ڈاکٹر فاطمہ پاشا، اور ڈاکٹر سُہیل ملک کے ساتھ ساتھ ہمارے ادارے کے وہ باصلاحیت طالبعلم جنہوں نے دنیا بھر میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ میں اپنے والد کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میرے والد صنعتکار تھے اور انکی خواہش تھی کہ میں انکا ہاتھ بٹاؤں۔ لیکن میرا رجحان تحقیق اور تدریس کی جانب تھا۔ والدین میرے اس شوق سے خوش تھے لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ میں کیمرج یونیورسٹی میں اپنے طور پر جاؤں گا۔ اسکے بعد میں جامعہ کراچی میں 375 روپے ماہانہ پر لیکچرار بھرتی ہوا۔ جولائی 1965ء میں میری شادی ہوگئی اور اسکے تین ماہ بعد میں کیمرج یونیورسٹی چلا گیا، کیمبرج کے طالب علموں سے میں بہت پیچھے تھا، میں وہاں کی انڈر گریجویٹ کلاس میں جا بیٹھتا اور نوٹس لیتا۔ اس ایک سال میں خوب محنت کی اور درسی کتابوں میں دیئے گئے سوالات

Marfat.com

حل کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتا۔ اسطرح میں نے لگن سے جب کیمبرج سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تو اسوقت میری عمر صرف 26 سال تھی۔ پی ایچ ڈی کے دوران میں اس تحقیق میں مصروف تھا کہ تجربہ گاہوں میں آخر کسطرح کیمائی مرکبات کی مصنوعی طور پر تالیف کی جاتی ہے۔ مذکورہ مقالہ نوبل انعام یافتہ سائنسدان رابرٹ رابنسن سمیت تین عظیم سائنسدانوں نے مشترکہ طور لکھا تھا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ جو مقالہ انہوں نے ترتیب دیا تھا اسکے کچھ حصے درست نہیں تھے۔ پھر اسی پر میرا تحقیقی مقالہ برطانیہ کے ممتاز جریدے ''جنرل آف کیمیکل سوسائٹی'' نے شائع کیا، اس مقالے میں نے بیان کیا تھا کہ ہارملین کے اصل کیمیائی تعاملات کیا ہوتے ہیں اور کون سے مرکبات بنتے ہیں۔ اسطرح میں نے نوبل پرائز ہولڈر کیمیا دان کے کام کو غلط ثابت کر دکھایا۔ یہ میرا دوسرا مقالہ تھا جو 29 سال کی عمر میں شائع ہوا تھا۔ جب میں نے پہلا تحقیقی مقالہ جمع کروایا تو اسوقت میرے پاؤں کانپ رہے تھے، جریدے کے مدیر نے مجھے دو دن بعد بلایا، دورانِ ملاقات ایڈیٹر خاصی دیر خاموش رہا اور مجھے گھورتا رہا۔ میں پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ پھر اچانک ایڈیٹر نے اُٹھ کر ہاتھ ملایا، مبارکباد دی اور کہا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ کے مقالے کو شامل اشاعت کر لیا جائیگا۔ یہ لمحہ میرے لیے اطمینان اور خود اعتمادی کا بہت بڑا تجربہ تھا چونکہ میں نے اُن لوگوں کے کام کو چیلنج کیا تھا جو اپنے اپنے شعبوں میں غیر معمولی مہارت رکھتے ہیں۔

میری ہمیشہ سے خواہش رہی کہ پاکستان واپس آکر یہاں کام کروں۔ چونکہ اپنے معاشرے میں نمایاں مقام حاصل کرنے کی آرزوئیں پرورش پا رہی تھیں۔

Marfat.com

''ہارنے سے ڈرنے والا شخص کبھی نہیں جیت سکتا''

عمران خان تاریخِ پاکستان کی ایسی انقلابی شخصیت ہے جسکا ثانی شاید ہی کوئی نظر آئے۔ اِن جیسی شہرت بہت کم پاکستانیوں کونصیب ہوئی، وہ سوائے سیاست کے جس میدان میں بھی گئے خوب عروج پایا شاید کرکٹ کی طرح سیاسی میدان میں ابھی تک انہیں بہتر ین ٹیم میسر نہیں آئی۔ انہوں نے تاریخ کے اوراق پر دہ روشن باب چھوڑے ہیں کہ ہر کوئی ان ابواب کا مطالعہ دل کی گہرائیوں سے کرتا ہے۔

میٹرک انگلینڈ کے رائل گرائمر سکول سے اے لیول کر نے کے بعد انہوں نے معاشیات اور سیاسیات میں اکسفورڈ یونیورسٹی برطانیہ سے گریجویشن مکمل کی، اِس یونیورسٹی میں سابق وزیراعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھی انکی کلاس فیلو تھیں، عمران یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی رہے۔70-1969 میں فرسٹ کلاس کرکٹ کا آغاز کیا لیکن انکی کامیابی کا آغاز 80ء سے شروع ہوا۔ انہوں نے 88 ٹیسٹ میچ کھیلے اور 37.69 کی اوسط کے ساتھ 3,807 سکور کیے جسمیں انکا سب سے زیادہ سکور 136 تھا، 6 سنچریاں اور اٹھارہ نصف سنچریاں بنائیں۔ جبکہ اپنے 175 ایک روزہ میچوں میں انہوں نے 33.41 کی اوسط کے ساتھ 182 وکٹیں حاصل کیں۔ خان 62 مرتبہ ایک اننگز میں پانچ یا اس سے زیادہ اور بارہ مرتبہ ایک ٹیسٹ میچ میں دس یا اس سے زیادہ وکٹیں حاصل کر چکے ہیں۔ عمران خان کو انکی خدمات کے عوض اعلیٰ ترین سول ایوارڈ ''ہلال پاکستان'' سے نوازا گیا۔ کھیلوں کے حوالے سے خان یونیسیف کے سفیر بھی مقرر ہوئے۔ آپ انگریزی کی چار کتابوں انڈس جرنی، آل راونڈر ویو وار یئیٹر ریس اور عمران خان آٹو بائیوگرافی کے مصنف ہیں۔ انہوں نے بطور کپتان 49 ٹیسٹ میچوں میں پاکستانی ٹیم کی قیادت کی، تیرہ جیتے چھ ہارے جبکہ 27 برابر رہے۔ انکی برق رفتار باولنگ سے جہاں بلے باز خوفزدہ رہتے وہاں انکے باولنگ ایکشن کے دوران چلنے والی ٹانگیں لاکھوں خواتین وحضرات کے دِلوں کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتی تھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا اس سیاستدان یا سماجی کارکن سے زیادہ اُس عمران کو جانتی ہے جس نے 92ء میں ورلڈ کپ ہاتھوں پر اُٹھایا تھا۔ اُس وقت ورلڈ کپ چیمپئن شپ کیلیے جو گانا بنایا گیا تھا

Marfat.com

عمران خان ورلڈ کپ 1992 ہاتھوں پہ اٹھا رہے ہیں

اسکا آخری مصرعہ یہ تھا کہ Let see who rule the world اور جب فتح پاکستان کے حصے میں آئی تو ہر پاکستانی کہتا تھا We rule the world یعنی ہم دنیا کے حاکم ہیں۔خان نے ورلڈ کپ ہی نہیں جیتا بلکہ پاکستانی عوام کے دل جیت لیے تھے اوراس نے اسی وقت بے مثال عوامی چاہت کوشوکت خانم کینسر ہسپتال کی چندہ مہم میں استعمال کیا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ورلڈ کپ جیتنے سے پانچ سال قبل انہوں نے کرکٹ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا تھالیکن انہیں اسوقت کے صدر جنرل ضیاء الحق اور دوستوں کے اصرار پر یہ فیصلہ واپس لینا پڑا تھا۔عمران اپنے منفرد لہجے میں جب باتیں کرتا ہے تو ماحول کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے،عمران کے بارے میں کئی بار میں نے سوچا کہ کیا چیز ہے یہ۔اس سے کئی بار ملا۔ ہر بار مل کر یہ محسوس کیا کہ اس کے اندر کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔

عمران خان بتاتے ہیں کہ وہ 25 نومبر 1952ء کو لاہور معروف تعلیمی گھرانے کے ایک فرد اکرام اللہ خان نیازی کے ہاں پیدا ہوئے۔کرکٹ سے انکی گہری دلچسپی بچپن ہی سے تھی،میں نے صرف نو سال کی عمر میں اپنے کزن جاوید برقی کو ایک دن سنچری سکور کرتے دیکھا تو اُسی دن گھر آکر والدہ کو کہا کہ میں کرکٹر بنوں گا۔اگر کسی نے خود کو شہرت،عزت اور دولت کی بلندیوں تک پہنچانا ہے تو ماں سے عشق کی حد تک پیار کرے،اور تکلیف کی حالت میں اسکی اسی طرح نگہداشت کرے جسطرح بچپن میں ہر ماں اپنے بچے کی دل و جان سے نگہداشت کرتی ہے۔والدہ سے کرکٹر بننے کی خواہش کا اظہار کرنے کے بعد میں تعلیم کے ساتھ ساتھ کرکٹ کے اُبھرتے ہوئے کھلاڑی کے طور پر شناخت پاتا گیا۔میں والد کی طرف سے ''نیازی'' پٹھان اور والدہ سے ''برقی'' پٹھان ہوں،میری والدہ کا قبیلہ وزیرستان سے آیا تھا اور والد کے اجداد افغانستان سے آئے۔یہ ہمارے ساتھ بہت غلط ہوا کہ ہم اپنی زبان بھول گئے۔چند سال قبل جب میں اپنی والدہ کے آبائی علاقے وزیرستان گیا تو وہاں میں ان لوگوں سے بہت متاثر ہوا،پٹھانوں کی خودداری اور تاریخ سے پیار میں کبھی نہیں بھول سکتا،وہاں ہی میں نے فیصلہ کیا کہ میں وزیرستان پر کتاب لکھوں گا چنانچہ اس موضوع پر میری کتاب منظر عام پر بھی آئی۔

Marfat.com

میرے دو چچازاد جاوید برکی اور ماجد خان کے علاوہ ماموں ماہرتعلیم ڈاکٹر جہانگیر خان بھی کرکٹر رہ چکے ہیں۔ میں نے 20 سال میدانِ کرکٹ میں رہنے کے بعد کرکٹ سے مستقل علیحدگی اختیار کی اور 1989 میں اپنی والدہ شوکت خانم کی یاد میں دوسو پچاس بستروں پر مشتمل کینسر ہسپتال کے قیام میں مصروف ہوگیا۔ ہسپتال میں داخل ہونے والی پہلی دس سالہ مریضہ سمیرا نے اس منصوبے کا افتتاح کیا۔ اس ہسپتال میں علاج معالجے کے بہترین آلات اور اعلی تربیت یافتہ ڈاکٹروں کی ٹیم موجود ہے۔ یہ آج کینسر کے حوالے سے پاکستان کا صف اول کا ہسپتال شمار کیا جاتا ہے۔ میں ہمہ وقت کچھ کرنے کے لیے بے تاب رہتا ہوں۔ 1996ء میں ہسپتال کے منصوبے پر کامیابی کے بعد اپنی سیاسی جماعت ''تحریک انصاف'' کی بنیاد رکھ دی۔ گو ہماری جماعت فروری 93ء کے انتخابات میں ناکام رہی اور 2001ء کے الیکشن میں بھی مضبوط جماعت کے طور پر سامنے نہیں آ سکی مگر ہم سماجی انقلاب برپا کرنے کی کوششوں میں ابھی تک لگے ہیں چونکہ تبدیلی ایک دم نہیں آتی۔ قومی امور پر ہماری تحریک کا دلیرانہ مواقف انفرادی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ عصر حاضر میں سچ بولنا اور سچ لکھنا ہی بہت اہم کام ہے یہ دونوں کام ہم بہت موثر انداز میں کر رہے ہیں۔ انصاف عام، احتساب سر عام، عدلیہ کی آزادی اور کرپشن کے خلاف جنگ ہمارا نعرا ہے۔ میرے علاوہ میرے پانچ چھ دوست تحریک انصاف کے مالی معاملات کے ذمہ دار ہیں، میرے مخلص ساتھی ایک طرح کے ہیں ایک جو شوکت خانم کی معاونت کرتے ہیں اور دوسرے جو تحریک کو تعاون فراہم کرتے ہیں۔ تحریک انصاف کا ووٹ بنک روز بروز تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ لوگ خوف اور بزدلی کی سیاست سے تنگ آ چکے ہیں اور وہ پاکستانی میر جعفروں اور میر صادقوں کے چہرے پہچان چکے ہیں۔ میرے مطابق حکومت میں چلے جانا کامیاب سیاستدان ہونے کی دلیل نہیں نہ ہی ضمیر کی قیمت ایک وزارت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ماضی میں سیاستدان ساتھ نہ دیتے تو فوج ملک پر حکمرانی نہیں کر سکتی تھی۔'' کرکٹ میں تاریخی کامیابی اور سیاست میں تاریخی ناکامی آخر کیوں''......؟ جو شخص ہارنے سے ڈرتا ہے وہ کبھی نہیں جیت سکتا۔

ایک سوال پر عمران کہتے ہیں کہ میں نہیں سمجھتا کہ میں ضدی ہوں، میری زندگی کا اُصول ہے کہ میں اپنے مشن پر کبھی سمجھوتا نہیں کرتا بلکہ اپنے مشن کی کامیابی کیلئے سمجھوتا کرتا ہوں۔ ہاں مجھ میں غصہ ہے۔

Marfat.com

مانتا ہوں! تیز باولر بنا ہی اس لیے کہ مجھ میں غصہ تھا۔ میری نظر میں غرور وتکبر خدا کی نفی ہے۔ جب ان سے پوچھا کہ آپ نے انقلاب کیلئے آخر سیاست ہی کا انتخاب کیوں کیا تو کہنے لگے کہ تبدیلی ہمیشہ سیاست سے آتی ہے سماجی خدمت یا کسی اور طریقے سے نہیں۔ میں جو سیاست کر رہا ہوں وہ پہلے کبھی کسی نے نہیں کی۔ ہم پارٹی کے قیام کے پانچ ماہ بعد ہی اقتدار میں اپنا حصہ لے سکتے تھے مگر اقتدار ہماری منزل نہیں جب ہمارے پاس حکومت آئے گی تو ہم عملی تبدیلی لائیں گے۔ میں نے جب وادی سیاست میں قدم رکھا تو میں کوئی بچہ نہیں تھا نہ ہی میں بے وقوف تھا میں نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر سیاست میں قدم رکھا تھا۔ میں اپنی اس جدوجہد میں آخر تک جاؤں گا چاہے میری جان بھی کیوں نہ چلی جائے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ لوگوں کے آنے جانے سے بنتی اور ختم نہیں ہوتی بلکہ جماعتیں منشور پر بنتی ہیں اور اس پر عمل سے قائم رہتی ہیں۔ پہلے الیکشن پر میری شادی اس لیئے اثر انداز ہوئی کہ میں نیا نیا سیاست میں آیا تھا، میڈیا ہمارے پاس نہیں تھا۔ مخالفین نے ''یہودی لابی'' کہہ کر میرے خلاف مہم چلائی اور ہم اسکا جواب نہیں دے سکے۔ باکمال عمران اپنے بارے میں کئے جانے والے کئی سوالات کا جواب صرف اس ایک جملے میں دے دیتے ہیں کہ ''میں پیچھے مڑ کر باتیں کرنا پسند نہیں کرتا، اب میں اگے بڑھ چکا ہوں''۔

شوکت خانم کے بارے میں پوچھے گئے سوال کہ اسوقت بعض مریضوں کی شکایت ہے کہ شوکت خانم میں انکا علاج نہیں ہوا؟ عمران کہنے لگے کہ اکیلا شوکت خانم سارے پاکستان کے مریضوں کا علاج نہیں کرسکتا۔ ہمارا ہسپتال مریضوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہمارے پاس سالانہ تقریباً پچاس ہزار مریض آتے ہیں اور پہلے سے موجود مریض بھی علاج کی سہولتوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ اپنے محدود وسائل کے پیش نظر ہم نے مریضوں کے داخلہ کے حوالے سے ایک معیار اور طریقہ کار طے کیا ہوا ہے جہاں نہ میری سفارش چلتی ہے نہ وزیراعظم کی۔ شوکت خانم پاکستان کا واحد ہسپتال ہے جسے ڈبلیو۔ایچ۔او کی طرف سے نمایاں طبی خدمات کے عوض خصوصی ایوارڈ دیا گیا۔

عمران خان نے وضاحت کی کہ اسلام آباد میں موجود میرا ایک ایکڑ کا گھر جمائما کی نشانی

Marfat.com

نہیں، حقیقت یہ ہے کہ میں نے لندن والا فلیٹ فروخت کر کے اسلام آباد شہر سے کافی دور ویران علاقہ ''بنی گالہ'' میں زمین خریدی جس پر میں نے مکان تعمیر کروایا۔

ایک سوال پر انہوں نے کہا کہ مجھ پر یہ الزام غلط ہے کہ میں غریب کارکنوں سے ہاتھ ملانا پسند نہیں کرتا حالانکہ میری جماعت کے ملک بھر میں پھیلے کارکن مجھ سے صرف اسلئے محبت کرتے ہیں کہ وہ مجھے اپنے میں محسوس کرتے ہیں اور میں انکے دلوں کی ترجمانی کرتا ہوں۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے بعد دُنیا میں پیدا ہونیوالی صورتحال پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ نو گیارہ کے بعد ہر وہ شخص جس نے دہشت گردی کے بنیادی اسباب تلاش کرنے کی بات کی اس پر دہشت گردی کا الزام لگا دیا گیا۔ روس، اسرائیل اور اس تنازعہ کے دیگر فریقین کے علاوہ مسلم دنیا کے حکمران بھی اس سازش میں شریک رہے، وہ اپنی حکمرانی کے تحفظ اور اسے جائز قرار دلوانے کیلئے راتوں رات مارڈریٹ ہو گئے تا کہ وہ امریکہ کی حمایت سے اپنی حکومت کا تختہ مضبوط کریں۔ افسوس تو یہ ہے کہ مسلمان دانشور بھی اس بات کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکے کہ کس طرح ایک ارب تیس کروڑ لوگوں کے مذہب کو کسی چیز کا ملزم قرار دیا جا سکتا ہے؟ پوری دنیا میں مسلمان بدنام ہوئے، اگر آپ کی داڑھی ہو اور آپ امریکہ میں سفر کر رہے ہوں تو ہر ایک یہ سمجھے گا کہ آپ کسی بھی وقت بم پھاڑ سکتے ہیں۔ اسلام کو دہشت گردی سے ملانے کی ایک سازش کی گئی اور میرے خیال میں یہ اسلامی قیادت کی ناکامی کی وجہ سے ہوا۔

گزشتہ ساٹھ سالوں اور آج کے پاکستان پر نظر ڈالی جائے تو بات عیاں ہو جائے گی کہ ہمارے قومی زندگی زیادہ تر بیرونی آقاؤں اور ان کے پٹھوؤں کے زیر تسلط رہی، جنہوں نے عظیم قومی مفاد کے نام پر ہماری آئندہ نسلوں اور قومی وقار کو نقصان پہنچایا ہے۔ جب تک ہماری معشیت بین الاقوامی مالیاتی اداروں کی محتاج رہے گی اسوقت تک ہم ترقی نہیں کر سکتے۔ مالیاتی اداروں کی خودغرضانہ پالیسوں کے باعث آج مہنگائی نے غریب عوام سے سکون چھین لیا ہے۔

Marfat.com

مزدور سے ممبر قومی اسمبلی تک

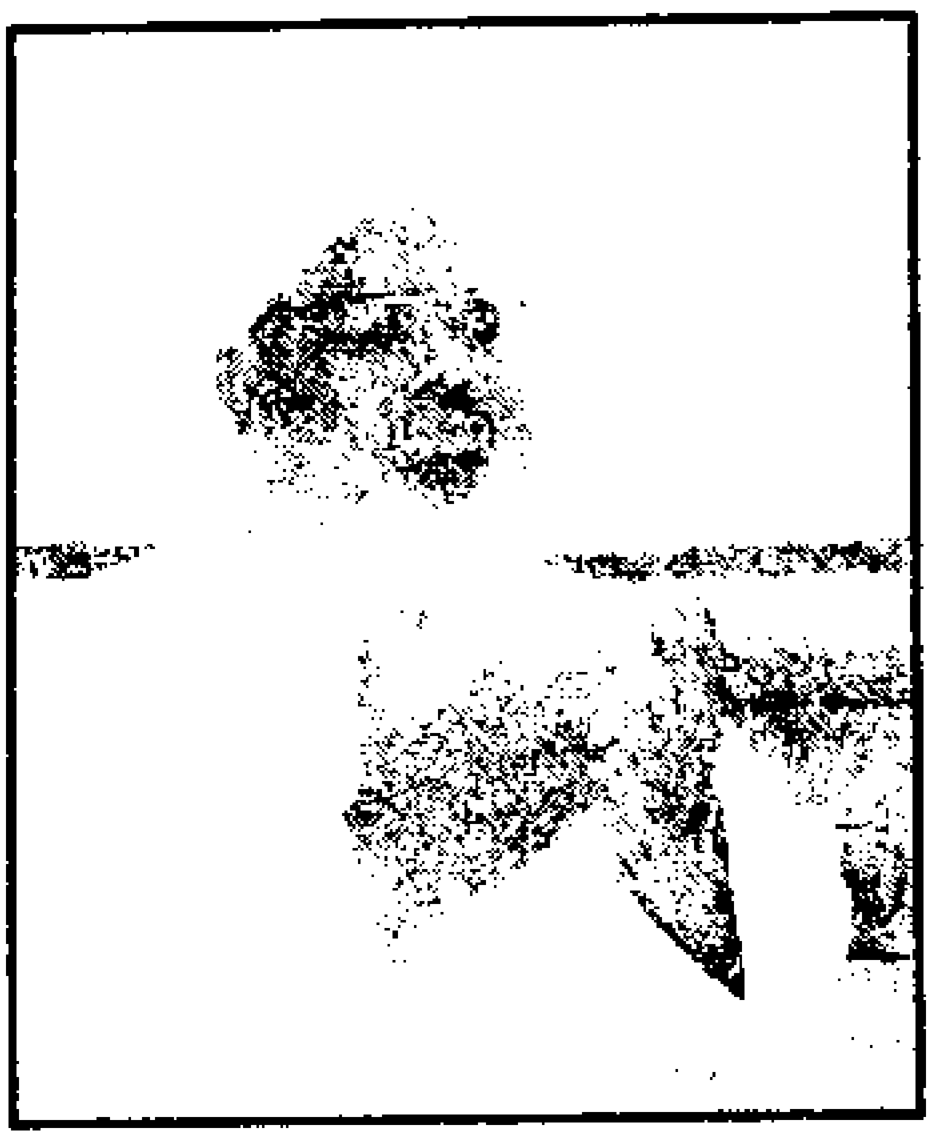

مہمند ایجنسی کا شمار وفاق کے زیر اہتمام اہم قبائلی علاقوں میں ہوتا ہے۔2296 مربع کلومیٹر رقبہ پر پھیلے اس زمین کے ٹکڑے پر بسنے والے غیور عوام کیلئے ممبر قومی اسمبلی مولانا غلام محمد صادق ایک ''اپنے'' کا درجہ رکھتے ہیں..... جو غریب گھر میں پیدا ہوا، جس نے زندگی میں دُکھ کے منتر پڑے، اپنے ہاتھوں سے جسمانی مزدوری تک کی مگر استقامت سے برسوں جدوجہد کر کہ عوامی خدمت کا وہ مقام حاصل کیا جسکی خواہش کی جا سکتی ہے۔ایک انتھک جدوجہد کے بعد کامیابی حاصل کر کے مولانا غلام صادق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زندگی اگر کسی مقصد کے سانچے میں ڈھل جائے تو فاصلہ دُور ونزدیک بھی ہوسکتا ہے، پُر پیچ اور دشوار گزار بھی... لیکن مشن کی سچائی اور ناقابل شکست عزم وحوصلہ سے کامیابی حاصل کر لینا ناممکن ہرگز نہیں ہوتا۔ یہ اقتدار کے ایوان میں بیٹھے ایک درویش سیاستدان کی ایک انوکھی داستان ہے،جس نے فاٹا کی پسماندہ دھرتی سے اُٹھ کر ملکی مرکزی سیاست میں خاصا اہم مقام بنایا۔غلام ایک تحمل مزاج، متحرک اور سیاسی نشیب وفراز سے آگاہ شخصیت کے مالک ہیں۔پاکستان کے ایک اشاعتی ادارے نے انہیں نمایاں مذہبی وعوامی خدمات کے پیش نظر سالانہ ''پاک یوکے ایکسیلنس ایوارڈ'' عطا کیا جو قومی سطح پر انکی مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔وہ اکیلے سیاست میں نہیں آئے بلکہ اپنے بیٹے حافظ رشید احمد کو بھی خلق خدا کی خدمت کیلئے سیاست کی کانٹوں بھری راہ دیکھائی۔انکا بیٹا رشید احمد ممبر سینٹ آف پاکستان کے طور پر اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔مولانا اور انکے بیٹے نے حزب مخالف میں رہنے کے باوجود مہمند ایجنسی کی ناپختہ سڑکوں کو پختہ کروایا، تاریکی میں ڈوبے علاقوں کو بجلی فراہم کی، فراہمی آب سے محروم جگہوں میں ٹیوب ویلز لگوائے، تعلیمی روشنیوں پہنچانے کیلئے نئے سکولز تعمیر کروائے اور کئی سکولوں کا درجہ بڑھایا۔قومی اسمبلی میں آوازیں بلند کر کہ پسماندہ مہمند ایجنسی کو ترقی کی نئی شاہراہ پر گامزن کیا۔انکے قریب رہنے والے نوجوان عبدالواحد اور صبغت اللہ شاید صحیح ہی کہتا ہے کہ صادق کی شخصیت میں سادگی کی نفسیاتی مصوری ہوتی ہے۔سیاست ہو یا مذہبی معاملات وہ لوگوں کے دکھ درد اور مسائل ختم ہونے تک اپنی کوششیں جاری رکھنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔مولانا کے بقول انکی خواہش ہے کہ دنیا سے غربت اور محرومیوں کے اندھیرے دُور ہوں اور وہ اپنی زندگی میں اُجالا دیکھیں۔انسانیت کی بھلائی

Marfat.com

رکن قومی اسمبلی مولانا غلام صادق انکے بیٹے یغفر رشید اور حسان علی عباسی بات چیت کر رہے ہیں

کیلئے اس شخص نے آج بھی سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں اپنا کام جاری رکھا ہوا ہے۔عوامی حقوق کیلئے جاری ان کا غیر معمولی سفر پسماندہ مجبور اور مظلوم لوگوں کو بے شمار مسائل سے نجات دلا رہا ہے اور ہمیشہ انکے دل کی آواز مصالحت کا دروازہ توڑ کر باہر نکل آتی ہے۔مولانا انقلابی مزاج رکھنے والے لیڈر کی حیثیت سے ابھرے ہیں غلام محمد کو اگر پس منظر کے آئینے میں دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ آپ 19 اگست 1954ء کو پیدا ہوئے ،دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ ایم اے اسلامیات پشاور یونیورسٹی سے فسٹ ڈویژن میں پاس کیا، عملی سیاست کی ابتدا 1969ء میں کی ..... 74ء میں جمیعت علماء اسلام میں شامل ہوئے جو سفر تا حال جاری ہے۔مولانا 97ء کے انتخاب میں بھی حصہ لے چکے ہیں انہوں نے حلقے کے ووٹروں کو زیادہ وقت دیا اور ان کیلئے کام کیا۔انکے قریبی دوست مولانا گوہر شاہ ''ایم این اے '' کی زیر سرپرستی چلنے والے مدرسے دار العلوم اسلامیہ چارسدہ کا شمار صوبہ سرحد کی مشہور مذہبی درسگاہوں میں ہوتا ہے ابھی تک ہزاروں فرزندان اسلام ''دارالعلوم اسلامیہ'' سے فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔غلام صادق بھی اس مدرسہ میں گذشتہ کئی سالوں سے دینی تعلیم کی روشنیاں بکھیر رہے ہیں جبکہ انکی زیر سرپرستی مہمند ایجنسی میں کئی مدرسے بھی کام کر رہے ہیں۔صادق کی مذہبی خدمات کا جائزہ انہیں'' غلام ''محمد ﷺ'' ثابت کرتا ہے۔اپنی ماضی کی تصویر کشی کرتے ہوئے مولانا غلام صادق بتاتے ہیں کہ میں زمانہ طالبعلمی سے ہی مذہبی تحریکوں کے ہراول دستے میں شریک رہا اور عوامی آواز بلند کرنے پر مشکلات بھی جھلیں۔میرا ماضی گواہ ہے کہ میں نے مصیبت کی ہر گھڑی میں بے سہارا لوگوں کی دستک پر دل کے دروازے کھول دیئے۔بچپن انتہائی غربت میں گزرا، والد مہمند ایجنسی سے غربت سے تنگ آکر چارسدہ میں آباد ہوئے۔آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے بچپن میں مزدوری بھی کی اور شرارتیں بھی۔مفتی محمود کا گرویدہ ہوں اور میرے اُستاد مولانا مفتی محمد فرید میری پسندیدہ شخصیت ہیں انہوں نے ہی میری تربیت کی۔علوم حاصل کر کہ جب ذمہ داریوں کی وادی میں داخل ہوا تو یہ میری زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ تھا

Marfat.com

سابق سنیئر منسٹر سرحد سے ایوارڈ وصول کرتے ہوئے

، اسوقت میں اپنے کندھوں پہ بوجھ محسوس کر رہا تھا، کافی پریشان تھا چونکہ یہ ذمہ داری بہت نازک تھی، اسمیں معاشرتی اصلاح، بچوں گھر والوں کا خیال اور کچھ دیگر اُمور شامل تھے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ملک گیر تحریک شروع ہوئی تو میں نے بھی قائدین کے حکم پہ اسمیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایک سوال پر انہوں نے واضح کیا کہ مفتی محمود صاحب کی وفات کے بعد جب جمعیت علماء اسلام تقسیم ہوئی تو میں نے مولانا فضل الرحمٰن گروپ کا ساتھ دیا تھا، میں نے 88ء، 90ء، 97ء تینوں انتخابات میں حصہ لیا اور 2002ء میں کامیابی حاصل کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ دین میں سیاست ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتے، میری نگاہ میں اگر دین میں سیاست نہ ہو تو یہ بے لگام گھوڑا ہے۔ اپنے پڑوسی طالبان سے متعلق پوچھے گئے سوال پر مولانا کہنے لگے کہ افغانستان کے سابق طالبان حکومت پاکستان کے حق میں تھے مگر نائن الیون کے بعد اس پشت کو برقرار نہیں رکھا جاسکا۔ مذہبی طبقات نے نو گیارہ کے بعد بننے والی پالیسیوں پر جو شدید ردعمل کیا میرا خیال ہے پاکستان کی عوام نے اسی لئے انہیں لاکھوں ووٹوں سے نوازا۔ چونکہ لوگ اسوقت موجود امریکی حکمرانوں کی پالیسیوں کے سخت خلاف تھے۔ میرے حلقے میں ہزاروں کی تعداد میں میرے شاگرد ہیں، کچھ ہمسفر ساتھیوں کا وجود بھی ہے اسلئے لوگوں کا میرے ساتھ عقیدت کا رشتہ استوار ہے اور وہ مجھے ہر الیکشن میں تیار ہو جانے کیلئے کہتے ہیں۔ اپنے علاقے کے تاریخی پس منظر پر بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مہمند ایجنسی کے قبائل نے انگریزوں کے خلاف برسرپیکار ہو کر اُن کے توسیع پسندانہ عزائم کو خاک میں ملایا تھا۔

''آپ کچھ بھی نہیں تھے سیاست کر کے بہت کچھ کر لیا، بتایئے کیا کھویا کیا پایا''؟ سیاسی رسی سے گزرنا ایک کٹھن کام ہے، میری نظر اور تجربات میں سیاست عام لوگوں کیلئے کوئی مزے کی چیز نہیں۔ ہاں: جو لوگ اپنے من کو مارتے ہوئے عوامی خدمت کرنا چاہتے ہیں انکے لیئے یہ اچھا میدان ہے۔ آج مسلسل محنت کے بعد اپنے گھر میں دو عہدے دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ جس تیزی سے عوامی بھلائی کیلئے ہمارے ذہن میں کوئی خیال آتا ہے اس سے کہیں زیادہ پُھرتی ہے ہم اسے تکمیل تک پہنچانے کیلئے سرگرم ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

''اِک چہرے پہ کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ''

پاکستان ٹیلی ویژن پر ''انکل سرگم'' بن کے مسکراہٹیں بکھیرنے والا فاروق قیصر طنز کے ہتھیار سے لیس ہو کر میدان جنگ میں نکلتا ہے، سرگم ماسک پہنتا تو بچوں کیلئے ہوگا لیکن اسکے پروگرامز بڑوں کے مسکرانے کی بھی وجہ بنتے ہیں۔ ٹی وی پر مختلف حیثیتوں میں کام کرنے کے علاوہ فاروق قیصر لوک ورثہ میوزیم کے ڈپٹی ڈائریکٹر بھی رہے، متعدد پروگرامز کی میزبانی کی، کالم لکھے، مسکراہٹ تخلیق کرنے کے لیے کامیڈی رول بھی کیے، چہرہ بدل کے قومی کمزوریوں کی نشاندہی کی۔ دنیائے فن میں یہ فاروق قیصر کی خدمات کا اعتراف ہی تو ہے کہ وہ آج اپنی ذات میں انجمن کہلاتے ہیں۔

اپنے ماضی کی عکاسی کرتے فاروق قیصر بتانے لگے کہ میں یکم نومبر 1945ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوا، ابھی تین دِن ہی کا تھا کہ ہم کوہاٹ چلے گئے، پھر کچھ برس یہیں رہے، پرائمری تک میری تعلیم بھی یہاں ہی سے ہوئی۔ میرے والد سید گلزار شاہ تصوف کے ایک معروف سلسلے کے گدی نشین تھے لیکن بلحاظ پیشہ وہ انجینئر کے طور پر ملازمت کرتے تھے اسلیئے وہ مختلف پروجیکٹس کے سلسلے میں مختلف علاقوں میں جاتے رہتے، کوہاٹ سے مردان، بنوں، مالاکنڈ اور سرحد کے کئی شہروں میں ہم رہے یعنی بچپن خانہ بدوشوں کی طرح گزر گیا۔ میٹرک میں نے پشاور کے اسلامیہ ہائی سکول 3 سے کیا۔ اسکے والد صاحب کی ایک بار پھر تبدیلی کے باعث ہمیں پھر شہر بدلنا پڑا۔ ایف اے میرا کوئٹہ سے ہی ہوا۔ اس شہر میں ہی میرے والد کی مدت ملازمت پوری ہوگئی اور ہم دوبارہ لاہور منتقل ہو گئے۔ میرا اپنا اور فیملی کی طرف سے رجحان مذہبی ہی رہا ہے۔ میری شاعری کا آغاز کالج لائف ہی سے ہو چکا تھا۔ میری بچپن میں کھیلوں میں بھی دلچسپی تھی، فٹ بال ٹیبل ٹینس، بیڈمنٹن، ہاکی اور کرکٹ کھیلتا۔ گورنمنٹ کالج کوئٹہ کی کرکٹ ٹیم کا کپتان بھی رہا۔ ماضی پر نگاہ دوڑاتے ہوئے میں شروع میں سوچتا تھا کہ جاگیردار تو سفید فام آقاؤں کے کارندے تھے۔ 47ء سے قبل جو مقامی بااثر لوگ گوروں سے مل گئے، انہیں انعام میں زمینیں ملیں اور انہی کی وجہ سے تماش بین کلچر کی بنیاد پڑی۔ اس کلچر میں مار دھاڑ اور عورتوں کے رقص کا رواج عام تھا۔ اسطرح جب یہ لوگ فلم سازوں کو سرمایہ مہیا کرنے لگے تو پھر یہی کلچر ہمارے فلموں میں بھی نظر آیا۔ ٹی وی کی جانب آنے کے سوال پر انہوں نے بتایا

Marfat.com

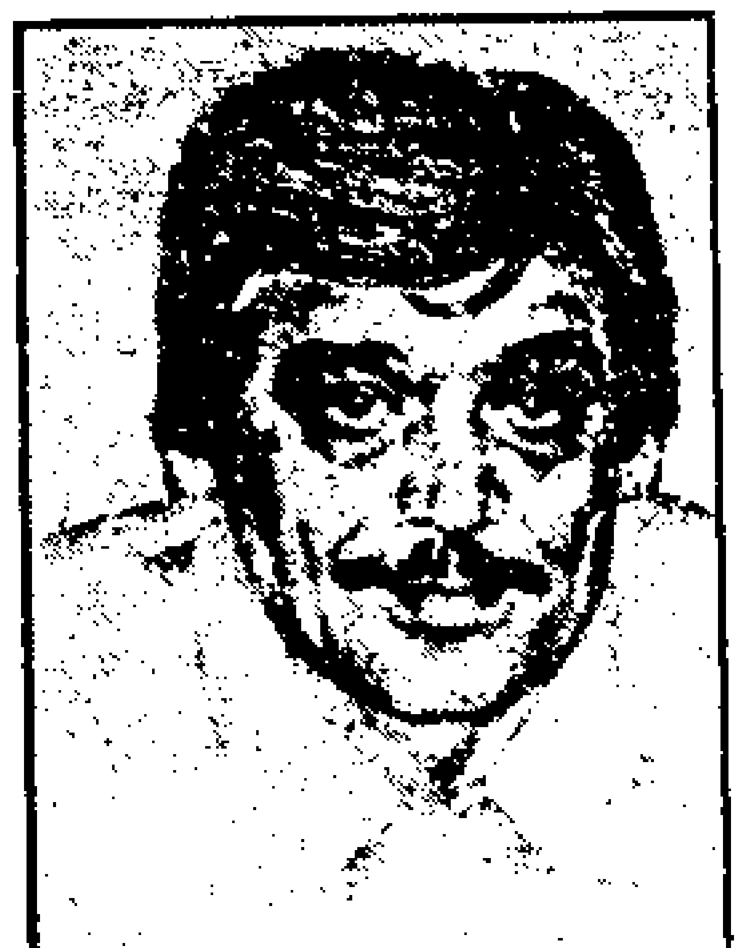

کہ میں نے زندگی بڑی عجیب وغریب گزاری ہے، نظام نے میرے راستے میں بڑے کانٹے بچھائے، 71ء میں جب نیشنل کالج آف آرٹس سے فارغ ہوا تو نوکری کی تلاش میں نکل پڑا۔ سلیمہ ہاشمی جو میری استاد تھیں ایک دِن مجھے ٹی وی سٹیشن لے گئیں، اُس دور میں ہمارے گھر ٹی وی تک نہیں تھا۔ پی ٹی وی کا صرف یہ ایک چکر مجھے یہاں لے آیا۔ 75ء میں نے ٹی وی پر بچوں کا پہلا رنگین پروگرام ''کلیاں'' شروع کیا جو تیرہ سال تک چلتا رہا، میرا پروگرام ''اکڑ بکڑ'' بھی ٹیلی ویژن سکرین پر چلا آپ یہ سُن کر حیران ہونگے کہ ٹی وی کے لیے پہلے کام پر مجھے 35 صرف روپے کا چیک ملا، پھر جب لکھنا آ گیا تو یہ معاوضہ بڑھ کر 65 روپے تک پہنچ گیا۔ میں نے رومانیہ سے گرافکس آرٹس میں ماسٹرز بھی کیا۔ ''سرگم'' نام کے پیچھے ایک میٹھی یاد موجود ہے، رومانیہ بخارسٹ یونیورسٹی میں میرے ایک استاد تھے، انکا نام پروفیسر مولنر تھا اور وہ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ تم بے وفا نکلو گے جبکہ میں اِن سے وعدہ کر بیٹھا تھا کہ میں کسی نہ کسی صورت میں آپ کو ضرور یاد رکھوں گا۔ چنانچہ میں نے سرگم کی صورت اور اسکی آواز میں پروفیسر مولنر کی گہری مشابہت رکھی پھر اسکا نام بھی پروفیسر سرگم رکھا لیکن پھر پی ٹی وی کے جی ایم کے کہنے پر میں نے اس نام سے ''پروفیسر'' ہٹا دیا اور ''انکل سرگم'' کر دیا۔ میں نے ٹی وی کیلئے تیس بتیس سال، کام کیا اب میں اسکے مزاج سے واقف ہو گیا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے ملک کے ٹیلی ویژن سے کبھی انقلاب نہیں آ سکتا اگر آنا ہوتا تو آج تک آ چکا ہوتا۔ ہماری عوام اس ذریعے کو صرف تفریح کیلئے دیکھتی ہے لہذا میں ابلاغ کے اس ذریعے کو انقلاب کا موضوع ہی نہیں سمجھتا۔ میں نےٹی وی کیلئے پچاس کے قریب ڈرامے لکھے اور پرائیویٹ چینلوں کیلئے بھی بے شمار سیریز لکھے۔ فاروق قیصر مطالبہ کرتے ہیں کہ پاکستان ٹیلی ویژن کو ایک مستقل پالیسی اختیار کرنی چاہیے تا کہ ''اب کام چلاؤ بعد میں دیکھا جائیگا'' والی روش کا خاتمہ ہو سکے۔ اب پرائیویٹ چینلز کی وجہ سے کچھ چھپایا جا سکتا ہے نا ہی کچھ روکا جا سکتا ہے فاروق قیصر کی نظر میں ہمارے ہاں اچھے پروگراموں کے نہ بننے کی ایک وجہ تربیت یافتہ پروڈیوسر کا فقدان اور مصنف کے معاوضے میں کمی ہے۔

ایک سوال پر انہوں نے کہا کہ میرے نزدیک میرا کالم نگار بننا ایک حادثہ ہی تھا۔ میرے لکھنے میں میرے استاد نیاز علی شاہ کا ہاتھ ہے جو ادب سے لگاؤ نہیں رکھتے تھے۔ ایک بار ریکارڈنگ سے فارغ ہوا

Marfat.com

میرے والد مجھ سے کہیں زیادہ باصلاحیت انسان تھے

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ مقبولیت حاصل کرنے کے باوجود عاجزی کا دامن نہیں چھوڑتے، اور ان سے ملتے ہوئے قطعاً یہ احساس نہیں ہوتا کہ لاکھوں لوگ انہیں جانتے یا مانتے ہیں۔ مولانا فضل کو آپ ایسے ہی لوگوں میں شامل کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہیکہ ایک طبقہ مولانا کو مذہبی جماعتوں کا حقیقی نمائندہ تصور نہیں کرتا مگر جس شخص نے مذہبی مواقف اپنا کر دُور دُور تک شناخت حاصل کی ہے اسے کسی کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے فرق نہیں پڑتا۔ مولانا انیس سو تیرپن میں ڈیرہ اسماعیل خان کے مشہور مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کی ذات کے مختلف گوشے اجاگر کرنے کیلئے دو آئینے استعمال کیے جاسکتے ہیں، ایک انکے سیاسی اور دوسرا دینی خدمات کا۔ مولانا کا اُٹھنا، بیٹھنا بتاتا ہے کہ انکے خاندانی ماحول اور دوست احباب نے انکی شخصیت پر گہرے نقوش چھوڑے۔ اگر مذہبی جماعتوں کے اتحاد ''متحدہ مجلس عمل'' کو کوئی شاعر ایک گاڑی سے تشبیہ دے تو وہ یقیناً مولانا کو اس گاڑی کا انجن قرار دے گا۔ جب بھی ان سے ملتا ہوں وہ ہنستے، مسکراتے ہوئے پُرخلوص انداز میں باتیں کرتے ہیں۔ آیئے انکے بچپن سے جوانی اور پھر قائد حزب اختلاف بننے کی کہانی انکی اپنی زبانی سنتے ہیں۔

میرا بچپن دیہاتی ماحول میں ایسے گزرا جیسے دوسرے دیہاتی بچوں کا گزرتا ہے۔ پڑھائی کے علاوہ فارغ وقت میں ہم پہ بہت سی پابندیاں عائد تھیں۔ یہ زمانہ زیادہ چچا کی زیرنگرانی رہا۔ بچپن بہت سادہ گزرا، جب کبھی ہم شرارت کرتے تو امی اور چچا سے مار اور ڈانٹ بھی پڑتی تھی۔ میٹرک کے بعد میں نے

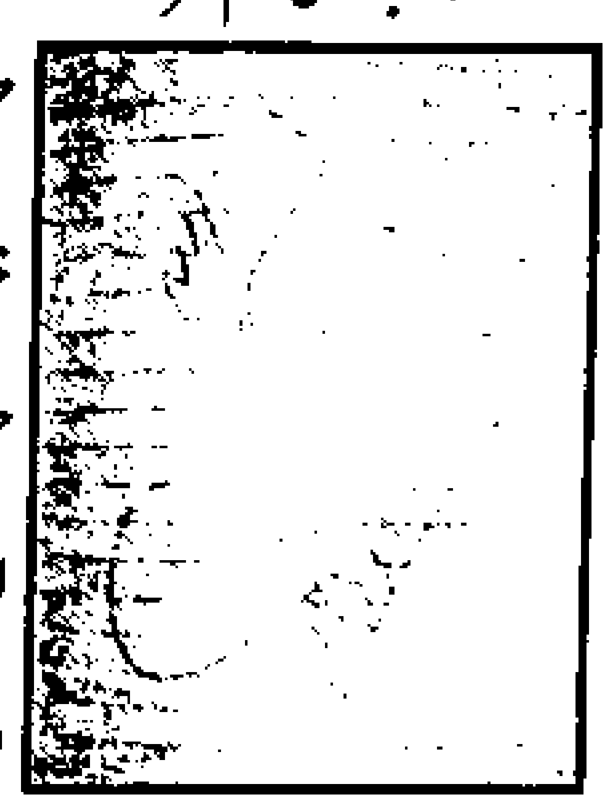

گاؤں واپس جا کر عربی کی بنیادی کُتب پڑھیں۔ پھر دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک چلا گیا اور آٹھ سال تک یہیں رہا۔ انیس سو اُناسی میں ایک مدرس کی حثیت سے قاسم العلوم چلا گیا۔ اسکے ایک سال بعد ہی میرے والد مفتی محمود کا انتقال ہوگیا۔ جسکے چھ سال بعد تک میں ملتان میں ہی درس و تدریس سے وابستہ رہا لیکن اچانک سیاسی مصروفیات تدریسی عمل پہ غالب آگئیں۔

Marfat.com

پارلیمنٹ لاجز میں ہونے والی ملاقات، مولانا غفور حیدری بھی موجود ہیں

مجھے افسوس ہے کہ اسوقت دینی تعلیم کوعلم نہیں سمجھا جاتا۔ اسوقت معاشرہ جہانت کے اندھیروں کی جانب رواں دواں ہے۔ ان حالات میں ایک مولوی ہی جانتا ہے کہ سماج کی اصل جڑیں اور اقدار کون سی ہیں۔ علم کی پیاس بجھانے کی تمنا کرنے والے ہر شخص کی مرضی ہے کہ وہ ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، بیوروکریٹ بنے اسی طرح اگر ایک شخص قران وحدیث کی تعلیم حاصل کر کے زندہ رہنا چاہتا ہے تو یہ اس کا حق ہے اور میرے خیال میں ہر کسی کو یہ راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ میں نے میٹرک کرنے کے بعد دینی تعلیم میں سپشلائزیشن اور دینی علوم میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پاکستان کے مدارس میں جو دینی علوم پڑھائے جارہے ہیں انکا مقابلہ کوئی دوسرا ملک نہیں کرسکتا۔

میرے والد مجھ سے کہیں زیادہ باصلاحیت انسان تھے، میں انکی صلاحیتوں اور اہلیت کا مقابلہ تو کسی صورت نہیں کرسکتا لیکن جن خطوط پر انہوں نے تعلیم دی اور ہمیں چلایا ہم انہی خطوط پر چل رہے ہیں۔ میری موجودہ حثیت انکی سرپرستی اور تعاون کا نتیجہ ہے۔ تمام تر نااہلی کم علمی اور کم تجربات کے باوجود مجھے والد کے دوستوں نیو ہی مقام اور انکے جماعتی لوگوں نے وہی احترام دیا ہے، اس پر میں اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ میرے والد جیلوں میں بھی گئے، تحریکیں چلائیں لیکن دیہاتی ماحول کی گھریلو خاتون میری ماں نے یہ تمام مسائل بہت خوش دلی اور صبر سے برداشت کیے۔ میری ماں کے نیک مزاج کے باعث گھر میں سکون اور اطمینان ہوتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری والدہ کے مزاج میں بھی میرے والد کی تربیت کا بہت بڑا حصہ اور اثر تھا۔

''اگر آپ سے سیاست چھوڑنے کا کہا جائے تو''؟ سیاست چھوڑنے کا مطلب تو یہ ہے کہ کوئی مجھے کہہ کہ دین چھوڑ دو۔

ایک سوال پر انکا جواب تھا کہ جی یو آئی کا سربراہ بننا میری خواہش نہیں تھی۔ یہ فیصلہ جماعت والوں نے وراثت کی بنیاد پہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے محسوس کیا کہ اسوقت جماعت کو چلانے کیلئے میری ضرورت ہے۔ پھر میں نے اس منصب کوقبول کرنے سے انکار نہیں کیا چونکہ یہ دین کی خدمت کا ذریعہ ہے۔

Marfat.com

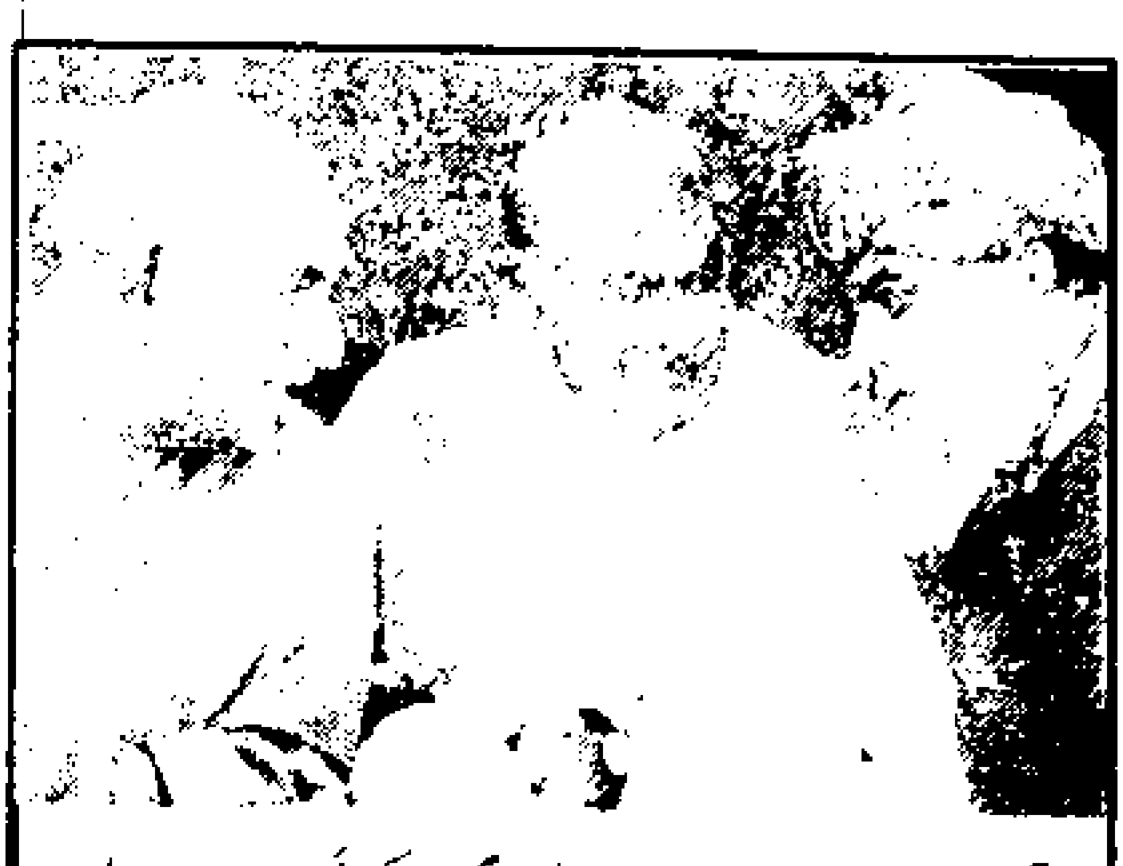

قوم پرست راہنماؤں اسفند یار ولی اور محمود اچکزئی سے تبادلہ خیال

ماضی میں اپنے مقابلہ میں سامنے آنے والی ایک خاتون فلم سٹار کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ اسوقت میرا اصل مقابلہ تو مسلم لیگی امید وار سے تھا،لیکن مجھے افسوس ہے کہ ہمارے اخبارات نے سیاست میں سامنے آنے والے اس غیر سنجیدہ عمل کو اہمیت دی۔اس سلسلہ میں مجھے میڈیا سے یہ شکایت ہے کہ انہوں نے سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔لیکن میں آپ کو بتاؤں کے میں اکثر اُردو اخبارات پڑھتا ہوں خاص طور پر اپنے اوپر ہونیوالی تنقید پڑھتا ہوں۔پشتو مادری زبان ہے،اسکے علاوہ اُردو بھی بول لیتا ہوں اور سرائیکی، پنجابی اور عربی بھی آتی ہے۔اب تو حالات نے اتنی قدرت دیدی ہے کہ انگریزی میں میرے سامنے کوئی راز کی بات نہیں کہ سکتا۔

میں نے انتہائی تلخ حالات میں سیاست کی ابتداء کی،انیس سو اسی سے اٹھاسی کے جنرل ضیاء کے دور میں ہمیں جن مصائب اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا انکا تذکرہ کرنا ہم نے کبھی مناسب نہیں سمجھا۔اس دوران ہم جیلوں میں گئے،صحراؤں، پہاڑوں اور جنگلات میں روپوش رہے۔

ہمارا خاندان کئی پشتوں سے علم وعرفان کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ہمارے دادا مرحوم محمد صدیق بھی اپنے وقت کے عالم تھے،انکے والد اور دادا بھی علمی حوالے سے امتیاز کے حامل تھے۔اس طرح ہمارا خاندان کئی برسوں سے علمی حوالے سے منفرد شناخت کا حامل چلا آرہا ہے۔

جب میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو اپنے والد کو تعلیم وتدریس میں مشغول پایا۔وہ مدرسہ قاسم العلوم کے استاد تھے،اسوقت سے ہم سمجھتے تھے کہ ہمارے والد ایک غیر معمولی شخصیت ہیں۔لوگ انہیں بے حد احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔جوں جوں میں بڑا ہوا انکا سیاسی قد بھی بڑھتا گیا۔وہ انیس سو باسٹھ میں رکن قومی اسمبلی منتخب ہو گئے۔انیس سو پینسٹھ میں جب میں چھٹی کا طالبعلم تھا تو انہیں صدر ایوب خان نے ملاقات کیلئے بلایا،دوسرے دن مجھے اخبار میں صدر کے ساتھ انکی تصویر دیکھ کر یہ احساس ہوا کہ ہمارے ملک کا صدر بھی انکی عزت کرتا ہے۔میں اپنے والد کے ساتھ چل کر نہ صرف خوش ہوتا بلکہ ہمیشہ ایک نئی بات سیکھتا تھا۔

Marfat.com

مجھے وہ دن خواب کی طرح یاد ہیں جب میرے والد مدرسہ سے چھٹی پر گھر آتے اور چند دِنوں بعد واپس چلے جاتے۔ اسکے ہمارے گاؤں تک سڑک نہیں جاتی تھی لوگ اُونٹوں پر سفر کرتے تھے۔ والد صاحب بھی اونٹ پر آتے جاتے۔ جب وہ گھر چھٹی گزار کر واپس جاتے تو میں اسوقت تک انہیں کھڑا دیکھتا رہتا جب تک انکی سواری میری انکھوں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔ انہوں نے میرے لیے ایک اصول بنایا ہوا تھا کہ ''تعلیم کے وقت تعلیم اور کھیل کے وقت کھیل'' اسی لیے تعلیم کے وقت کھیل اور کھیل کے وقت تعلیم مجھے کبھی یاد نہیں آئی۔ میری عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ والد کی بے تکلفی کم ہوتی چلی گئی اور میں نے دس بارہ سال کی عمر میں کھیل کود کو خود ہی ترک کر دیا۔ انہوں نے مجھے تمیز سکھانے کیلئے سختی نہیں کی بلکہ حکمت استعمال کی۔ اسطرح میں کھیلنے کی عمر میں کھیلا اور جب پڑھنے کی عمر آئی تو پڑھائی کی جانب خوب توجہ دی۔ چونکہ میرے سامنے والد پسندیدہ شخصیت تھے اسلیئے قدرتی طور میں اسی راستے پر چلا جو میرے والد کی راہ تھی۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ پہلے دینی کتابوں کو پڑھ کر پھر عصری علوم کی طرف آؤں گا۔

مولانا فضل الرحمٰن نے اس بات کی تردید کی کہ انکے والد انگریزی تعلیم کے خلاف تھے، فضل الرحمٰن بتاتے ہیں کہ جب والد قومی اسمبلی کے رکن بنے تو وہ اپنے دوست شیخ محمد اقبال سے انگریزی سیکھتے اور پڑھتے تھے۔ البتہ انگریزی تہذیب کے سخت مخالف تھے۔

Marfat.com

مردان کا وہ مرد جو مسجد سے اُٹھ کر قومی اسمبلی تک آ پہنچا

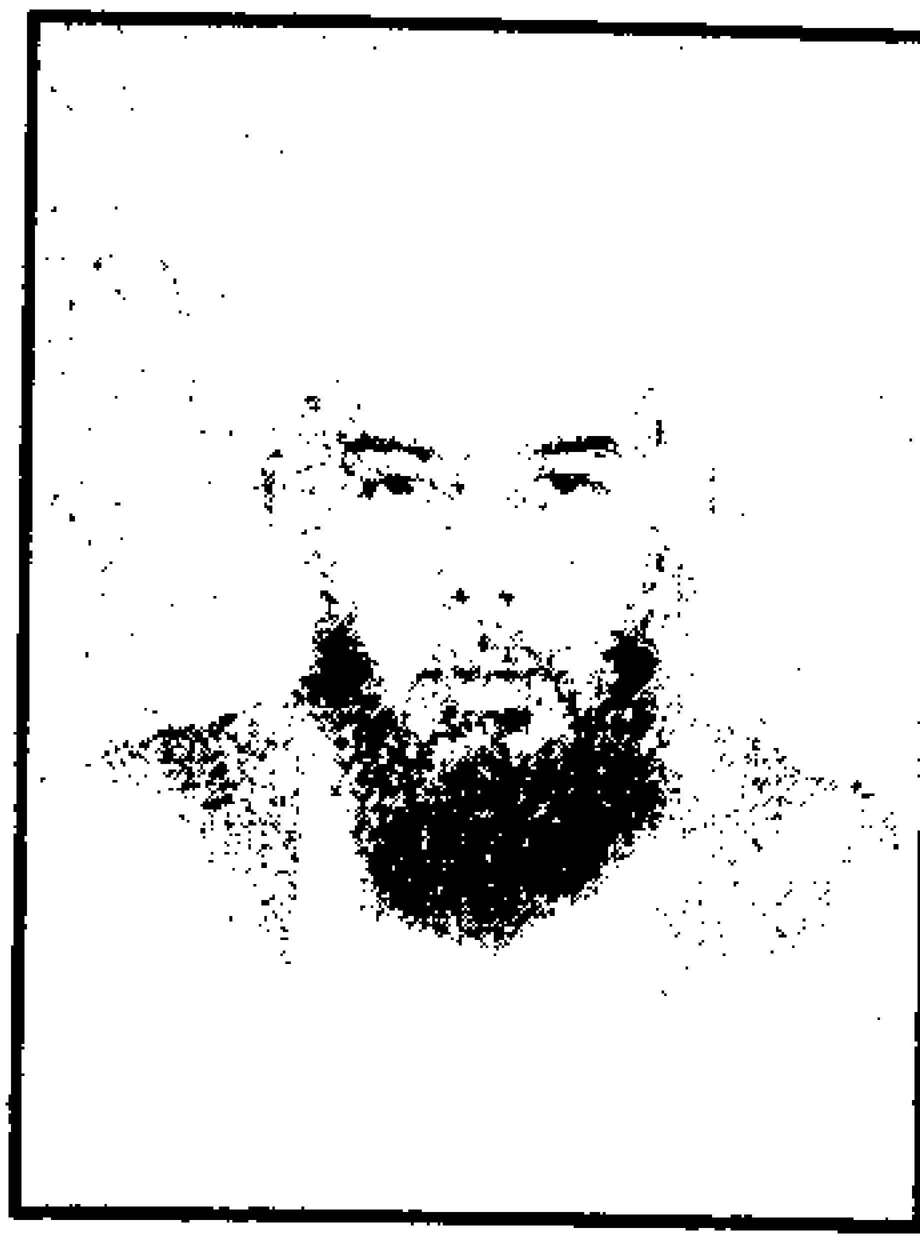

مولانا محمد قاسم کا وادی سیاست میں دوسروں سے الگ کھڑے دیکھائی دیتے ہیں۔16 فروری 1960ء کو شیر گڑھ میں پیدا ہونے والا قاسم مردان کی تاریخ کے گنے چنے غیر جانبدار ناموراشخاص میں شمار کیا جاتا ہے۔قاسم صاحب کی شخصیت اور کامیابیوں میں انکے والد مولانا محمد احمد کا بڑا ہاتھ ہے جو1988ء میں قومی اسمبلی کے رکن رہے، ضلع مردان کا ہر طبقہ انہیں ایک باعمل عالم سمجھتا ہے۔مولانا قاسم کے دادا مولانا پیر حسن مرحوم بھی ایک جید عالم دین اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔انکے پوتے محمد قاسم نے پشاور یونیورسٹی کے تحت منعقدہ امتحانات میں ایم اے اسلامیات مضامین میں یونیورسٹی میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے کے علاوہ دینی تعلیم قاسم دارلعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے حاصل کی اور آج کل قومی اسمبلی اور وفاق المدارس کی مجلس عاملہ کے ممبر ہیں اور جمعیت علماء اسلام ضلع مردان کی امارت بھی انہی کے پاس ہے۔یہاں آپ کے سامنے انہیں ایک غیر معمولی ایم این اے کے طور پر پیش کیا جارہا ہے جس نے وفاق میں حزب اختلاف کا ساتھ دینے کے باوجود حلقے کو پسماندہ نہیں رہنے دیا، جو ایک مسجد سے اُٹھا اور بغیر کسی دولت کے قومی سیاست میں شامل ہو گیا۔مولانا قاسم صاحب کو قریب سے جاننے والے انکے اس دعوے کو درست قرار دیتے ہیں کہ انہوں نے اپنے مدمقابل امیدوار جو ایک سیاسی جماعت کے صوبائی سیکرٹری جنرل بھی تھےکے مقابلے میں قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا اور پوری کمپین میں انکی جیب سے دس ہزار روپے تک خرچ نہیں ہوئے۔

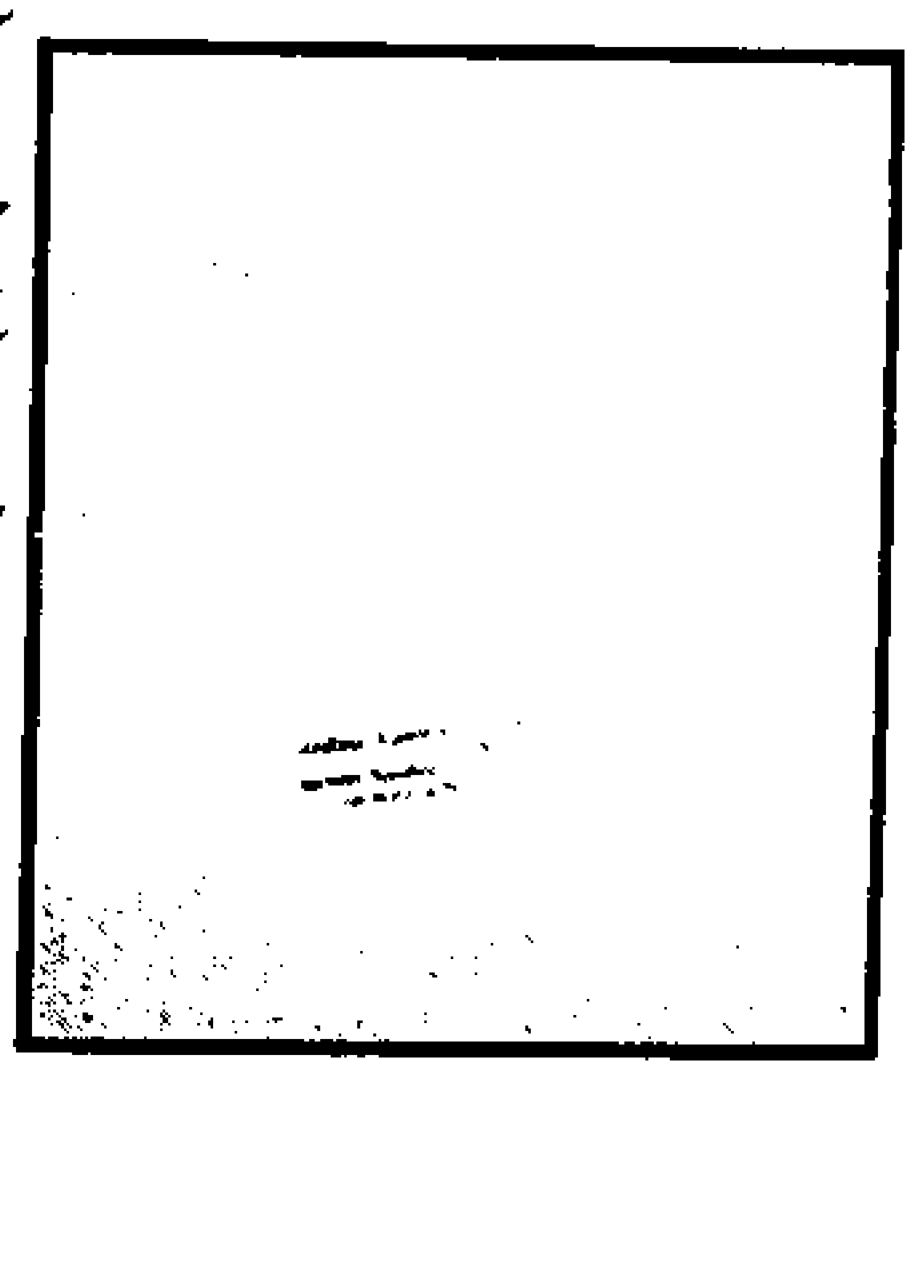

آٹھویں جماعت تک گورنمنٹ مڈل سکول شیر گڑھ سے تعلیم حاصل کی پھر 1977ء میں میٹرک کا امتحان گورنمنٹ مڈل سکول سخاکوٹ سے پاس کیا۔میٹرک کے بعد میں نے اپنے مدرسے میں داخلہ لیا اور دس سال تک یہاں پڑھا۔میٹرک کرنے کے دو سال بعد پرائیویٹ امیدوار کی حثیت سے انٹرمیڈیٹ بورڈ پشاور کے تحت ایف اے مکمل کیا۔اسی طرح میری گریجویشن 81ء میں پشاور یونیورسٹی سے ہوئی۔بی اے کے بعد بھی میں نے تعلیمی سلسلہ توڑا نہیں بلکہ ایم اے میں

Marfat.com

شیر گڑھ مردان میں مولانا محمد قاسم حنان علی سے ہم کلام ہیں

پشاور یونیورسٹی کے ہزاروں امیدواروں میں نمایاں رہا۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے زیر اہتمام منعقدہ شہادۃ العالمیہ کے امتحانات میں کل 600 نمبروں سے میرے 553 نمبر آئے اور مجھے ملک بھر میں تیسری پوزیشن ملی۔

میں عملاً ایک مدرسہ کا مدارس تھا ،میں نے دیگر بھائیوں مولانا محمد ادریس، مولانا محمد طیب، حافظ محمد سعید اور حافظ محمد نعیم کیطرح والد صاحب کی مجالس میں بیٹھ کر وعظ ونصیحت سیکھی۔ ہمارا جمعیت سے کافی پرانا رشتہ ہے 2002ء کے عام انتخابات میں اپنی جماعت اور علاقے کے لوگوں کے پرزور اسرار پر الیکشن میں حصہ لیا اور 56 ہزار ووٹوں کی بھاری برتری سے فتح حاصل کی۔ الیکشن میں ہمارے گھرانے کی نیک نامی نے ستر ہزار لوگوں کو میرے حق میں ووٹ کی طاقت استعمال کرنے پر مجبور کیا۔ اسمبلی کا رکن ہوتے ہوئے میں نے مرکزی وصوبائی حکومتوں کے فنڈز کو صحیح استعمال کیا۔ ہمارے دور میں دو 2 لڑکیوں کے ڈگری کالج بنے جو آج علاقے کی ماضی میں تعلیمی سہولیات سے محروم ہزاروں خواتین کی کی پیاس بجھا رہے ہیں۔ ہم نے 2 کروڑ 47 لاکھ کی لاگت سے مزدوروں کے بچوں کیلئے ''ویلفیئر بورڈ سکول'' قائم کروایا۔ ان کاموں کے علاوہ بھی بے شمار ترقیاتی کاموں کے جھال بچھائے۔ ہمارا بدترین مخالف بھی ہماری ایمانداری پر انگلی نہیں اُٹھا سکتا کیونکہ ہماری سیاست جھوٹ، منافقت، اقرباء پروری، اور فراڈ سے پاک ہے۔ میری پوری زندگی پر یاس کے عنصر پر آس کا عنصر حاوی رہا یہی وجہ ہے کہ میں کبھی مایوس نہیں ہوا ہوں۔

ہم سیاست کو مذہب کا حصہ سمجھتے ہیں۔ میرے والد نے 1952ء میں ''دارالعلوم اسلامیہ عربیہ شیر گڑھ'' کی صورت میں جو پودہ لگایا تھا آج اسکی سرحد کے مختلف علاقوں تک شاخیں پھیل چکی ہیں اور یہاں سے ہزاروں طلباء علم وعرفان کی روشنیوں سے فیض یاب ہو چکے ہیں، اس مدرسے کو جاری رکھنا اور یہاں سے فرزندان اسلام پیدا کرنا ہمارا مشن ہے۔ اسلامی پیغام کے پھیلاؤ، دینی مسائل اور انکے حل کیلئے ہم

ممتاز ادیب انتخاب عارف مولانا قاسم کو ایوارڈ دیتے ہوئے، پس منظر میں حنان بھی دکھائی دے رہے ہیں

Marfat.com

"ایک خواب کو تعبیر کے دھاگے میں پرونے والا"

گھاس کھا کر ایٹم بنانے کا عزم کرنے والی قوم کیلئے برسوں تک لکھی جانیوالی ''کہوٹہ کہانی'' کے مصنف و مرکزی خیال ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ عزم و ارادے کا پکا اور منزل کا تعین کر کہ اسے حقیقت کا روپ دے کر ہی دم لیتا ہے...... محنت کی راہوں کا یہ مسافر 28 مئی 1998ء کو عوامی آنکھ کا تارہ بن گیا جب دنیا کے ستاون اسلامی ممالک میں پاکستان پہلی ایٹمی قوت بن کر اُبھرا تھا۔ پاکستانی قوم آج بھی ڈاکٹر خان کو محسن کا درجہ دیتی ہے اور انکے مطابق ڈاکٹر خان کو ''اسلامی بم'' بنانے کی پاداش میں ایٹمی راز بلیک مارکیٹ میں فروخت کرنے کا مجرم قرار دیا گیا جبکہ امریکی سی آئی اے کے ایک سابق ڈائریکٹر کا مواقف ہے کہ ''ڈاکٹر قدیر، اسامہ بن لادن سے کم خطرناک شخص نہیں''۔ اپنوں اور بیگانوں کے مواقف کو ایک طرف رکھ کر تجزیہ کرنے والے ڈاکٹر خان کے بارے میں کہتے ہیں کہ حقیقت میں اس انسان نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ علم اور سائنس انسانیت کی مشترکہ میراث ہے۔ پہلے دنیا میں ایٹم بم بنانے کا کام بڑے ملکوں کے ادارے کرتے تھے لیکن ڈاکٹر قدیر اکیلا اس جانب چلا اور اس نے چند معاونین کے ساتھ ایک حیرت انگیز کامیابی حاصل کر لی۔ پاکستان میں آٹھ سال کے بچے سے اسی سال کے بوڑھے تک سب کی نظروں میں اسکی تصویر بسی ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ہر طبقہ فکر سے ''تصدیق شدہ'' محسن

ہے اور کہا جاتا ہے کہ زندہ قومیں محسنوں کو اپنی پلکوں پہ بیٹھایا کرتی ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ ڈاکٹر نے یورپی ممالک کی پُرآسائش زندگی کو لات ماری لیکن وہ اپنے ملک میں پابند سلاسل ہوا...... پاکستان ٹیلی ویژن کی سکرین پر اس نے قوم سے معافی مانگی...... سیاستدان شروع میں تو کہتے رہے کہ ڈاکٹر خان پاکستان کی پندرہ کروڑ غیور عوام کے دلوں میں بستے ہیں مگر اسکی طویل نظر بندی پر نہ ہر محب وطن پاکستانی احتجاج کی علامت نہ بنا اور نہ ہی پاکستانی سائنسی لیبارٹیاں بند ہوئیں...... مسلم امہ اسے اپنا سب سے بڑا جوہری

Marfat.com

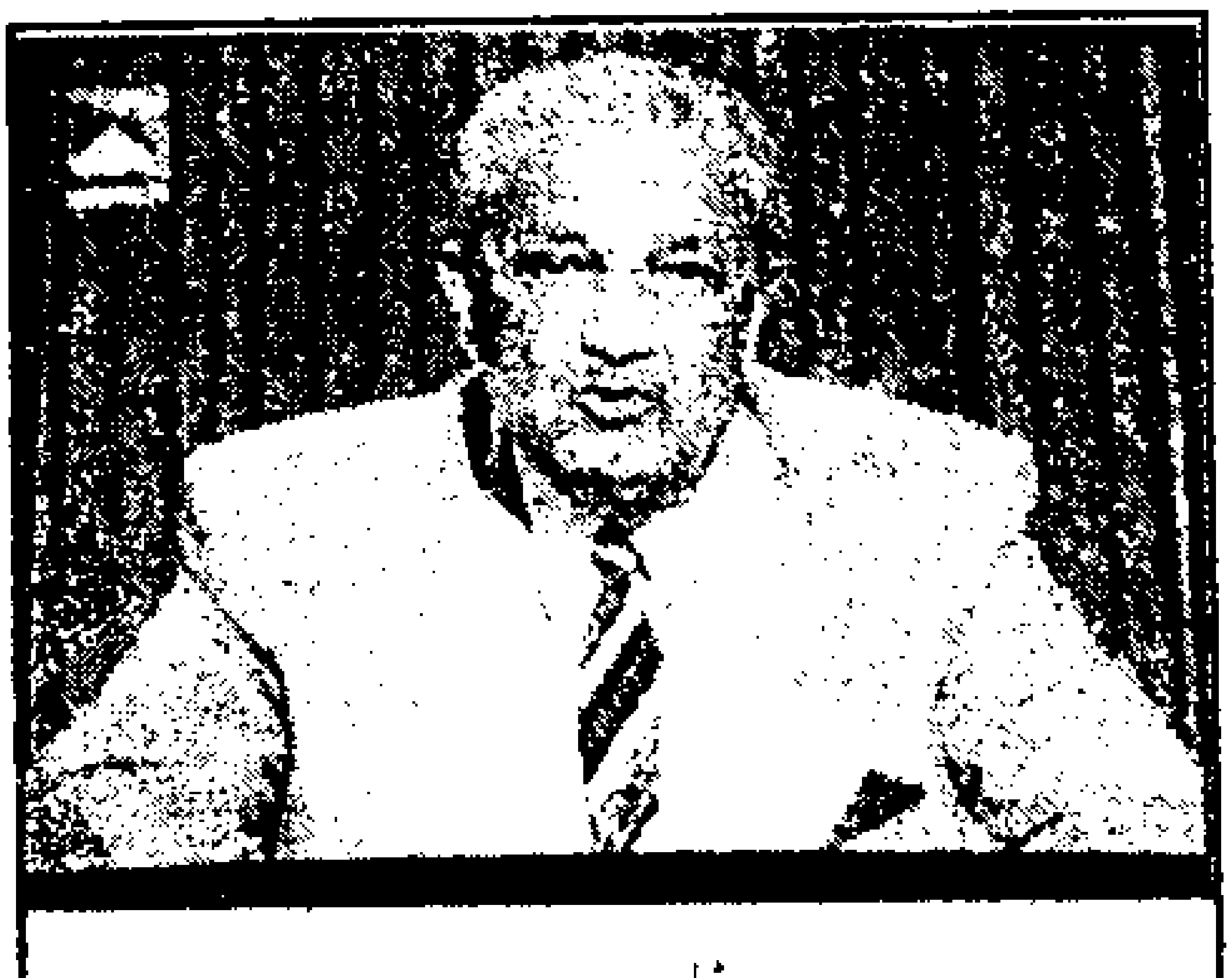
ٹیلی ویژن پر

سائنسدان تو مانتی ہے مگر کوئی اس کے وجود سے تنہائی کی زہر کے قطرے نکالنے کی جسارت نہیں کرتا۔

ڈاکٹر قدیر کے قریبی حلقے انکی شخصیت کی جو تصویر پیش کرتے ہیں اسکے مطابق وہ بیک وقت سائنسدان، اعلیٰ منتظم، ہمدردانسان اور علم وادب کا ذوق رکھنے والی ایک باذوق شخصیت کے مالک ہیں۔ انکے بارے میں اکثر پاکستانی دانشوروں کا خیال ہے کہ جب تک چاغی کے پہاڑ باقی ہیں تب تک شہاب الدین غوری کا یہ پیروکار بھی زندہ رہے گا اور اسے کوئی سائنسی تاریخ کے اوراق سے نہیں نکال سکتا۔ انکے قریب رہنے والے اس مغربی پروپیگنڈے کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیتے ہیں کہ خان کوئی غضب ناک انسان ہیں۔ ممتاز کالم نگار ارشاد احمد عارف کے اِن لفظوں کو تو آنے والا وقت ہی واضح کرے گا کہ ’’ڈاکٹر عبدالقدیر نے ایک بہادر، محبِ وطن اور ایثار پیشہ شخص کی طرح اعتراف جرم کے زہر کا پیالہ پی کر قوم اور اسکی مقدس گائے کو بچانے کی کوشش کی ہے‘‘۔ جناب عبدالقادر حسن ڈاکٹر قدیر خان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ ’’ہم اس احسان کے لائق اور مستحق نہیں تھے جو تم نے ہم پر کیا، جب آپ ٹی وی پر معافی مانگ رہے تھے تو مجھے حیرت تھی کہ کوئی اتنا بڑا آدمی بھی ہوسکتا ہے جو قوم کی مصلحت کیلئے بھری دنیا کے سامنے اپنے بارے میں خود ہی اتنا بڑا جھوٹ بول رہا ہو...... قادر حسن مزید کہتے ہیں کہ میں نے تو تاریخ کی کتابوں میں بھی آپ جیسے انسان کے بارے میں نہیں پڑھا‘‘۔ جبکہ برطانوی صحافی گورڈن کوریرا نے اپنی کتاب ’’Shopping for bombs‘‘ میں ڈاکٹر قدیر خان کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور ان کے حوالے سے اپنے ذاتی خیالات و معلومات پر مبنی کتاب میں بعض ناپختہ دلائل کے ذریعے بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ڈاکٹر اے کیو خان نے دنیا میں غنڈا گردی کیلئے جوہر

جنرل مشرف اور ڈاکٹر قدیر کی ایک ملاقات

Marfat.com

ی ٹیکنالوجی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ملک کے ممتاز اینکر پرسن ڈاکٹر شاہد مسعود اپنے مضمون ''ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ایٹمی پاکستان'' میں قدیر پر لگائے جانے والے دفاعی رازوں کی چوری کے حوالے سے کہتے ہیں کہ دنیا کی تمام ایٹمی قوتوں کی طرح ہم نے بھی اپنے ایٹمی پروگرام کا آغاز ہالینڈ کی ایک لیبارٹری سے بعض رازوں کے حصول سے کیا تھا، شاہد مسعود یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ اس منصوبے کے حصول کے لیے اگر بلیک مارکیٹ سے رابطہ نہ ہوتا تو کیا راجہ بازار یا لبرٹی مارکیٹ سے جا کر ایٹمی پروگرام کی خریداری کی جاتی...... ؟ ڈاکٹر شاہد کے مطابق اگر یہ واقعہ جنرل مشرف حکومت میں پیش آتا تو ہم ڈاکٹر عبد القدیر کو چوری کے الزام میں گرفتار کر کے ہالینڈ کے حوالے کر دیتے۔ اسی طرح عالمی مواتمر اسلامی کے سربراہ راجہ ظفر الحق جنکا تعلق بھی کہوٹہ سے ہے جہاں سے ایٹمی پروجیکٹ پر کام ہوا۔ راجہ صاحب کا کہنا ہے کہ '' مغربی ممالک شروع دِن سے ہی اِس پروگرام کو ختم کرنے کے درپے رہے۔ انہوں نے اسکی بے انتہا کوششیں کیں۔ بیرون ملک کے ایک سفارت کار نے کہوٹہ پلانٹ سے متعلق علاقوں کی تصاویر حاصل کرنے کیلئے کہوٹہ پروجیکٹ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن سیکورٹی نے اس کوشش کو ناکام بنادیا۔ بیرونی ایجنسیوں نے یہاں کی زمین کی تھرتھراہٹ کو محسوس کرنے کیلئے چٹان طرز کا ایک آلہ نصب کیا تھا جو اسے غیر ملکی سٹیلائٹ کو بھیجتا تھا...... اسطرح کے کئی واقعات ہوئے لیکن نہایت ذہانت سے ان سے نمٹا گیا''۔ آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل حمید گل کے خیال میں قوم کے سامنے ''ڈاکٹر قدیر خان کے معافی مانگنے کی دو وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ وہ پاکستانی ایٹمی پروگرام کو بچانا چاہتے تھے اور دوسری یہ کہ وہ کمزوری دیکھا گئے۔ حمید گل جارج ٹینٹ کی کتاب کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ جب جارج پاکستانی ایٹمی پروگرام کے بارے میں انتہائی خفیہ دستاویزات لے کر آیا تو جنرل مشرف اپنی ڈیوٹی میں فیل ہوئے انہیں چاہیے تھا کہ وہ شکریے کے بجائے پوچھتے کہ تم بتاؤ کہ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے تمہیں یہ خفیہ دستاویزات دی ہیں اور وہ اُن لوگوں کا کورٹ مارشل کرتے''۔ لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس محمد اختر شبیر نے عدالت میں یہ ریمارکس دیئے کہ'' ہیرو کبھی مرا نہیں کرتے، ڈاکٹر قدیر خان کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ انہوں نے پاکستان کی خدمت کی ہے۔ انہیں متنازعہ نہ بنایا جائے، انہیں عدالتوں کے فیصلوں کی ضرورت نہیں۔ ایک معزز جج کے یہ ریمارکس ڈاکٹر کے عظمت کردار کی دلیل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی سوانح عمری کے مصنف مشہور صحافی زاہد ملک کا کہنا ہے کہ انہوں نے کئی بار ڈاکٹر قدیر خان کو روتے دیکھا جب وہ اسرائیلی افواج کی جانب سے نہتے فلسطینیوں پر وحشیانہ جارحیت کے مناظر دیکھتے، وہ یہ سوچا کرتے تھے کہ اگر مصر،

Marfat.com

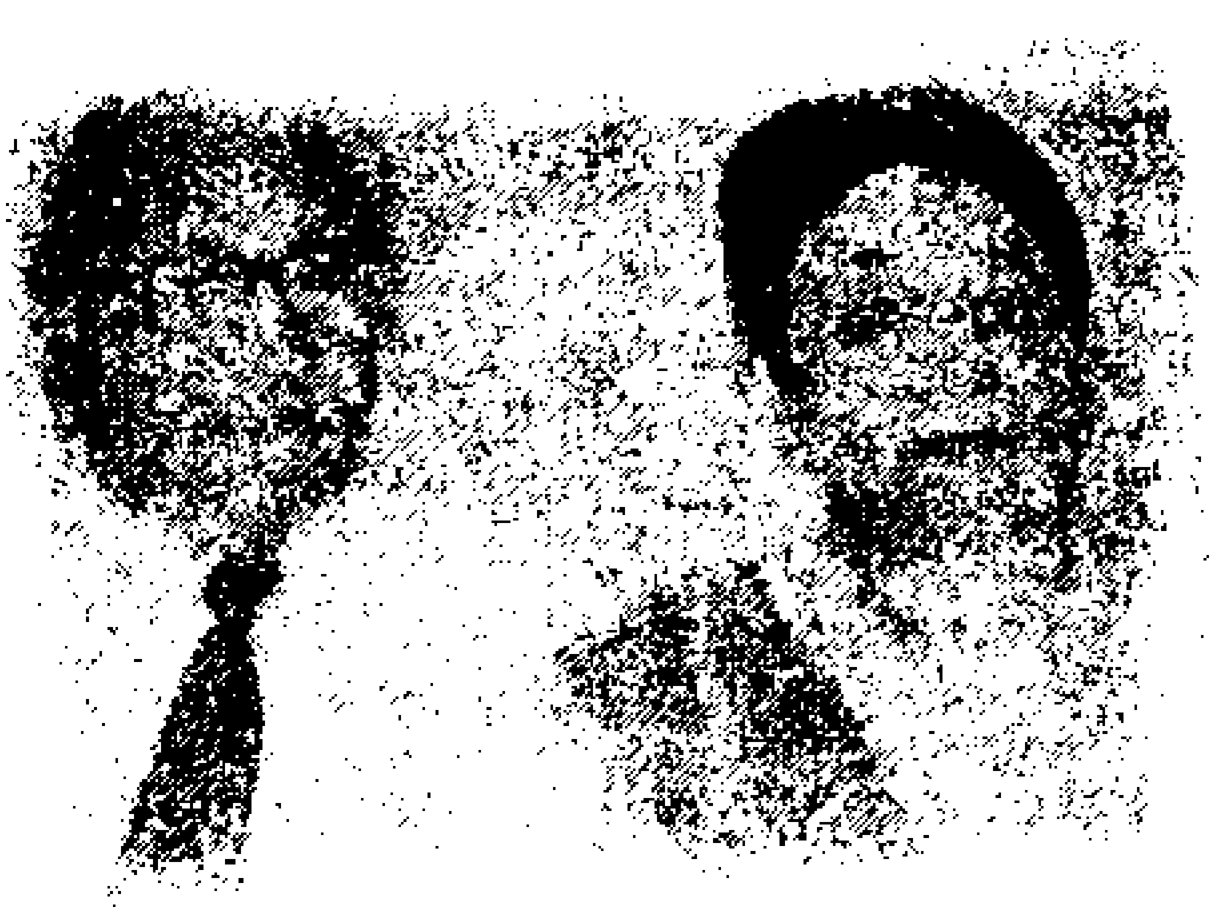

لبنان، شام، سعودی عرب، عراق اور ایران کے پاس اگر اگر ایٹمی صلاحیت ہوتی تو اسرائیل کی جرأت نہیں تھی کہ وہ فلسطینیوں کو اپنے ظلم اور نشانہ بنا سکے۔

اپنی داستان حیات سے پردہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر خان بتاتے ہیں کہ میں 27 اپریل 1936ء کو بھوپال انڈیا میں پیدا ہوا۔ والد عبد الغفور خان معلم تھے، جنہوں نے زندگی بھر جہالت زدہ معاشرے میں علم کے چراغ جلائے، گھر کا ماحول دینی تھا، میری والدہ زلیخا اسلامی اصولوں پر عمل پیرا خاتون تھیں اور اپنے محلے کی بچیوں کو قران مجید پڑھاتی تھیں، ہمارے تایا محمود خان ریاست بھوپال میں محکمہ مالیات کے سیکرٹری تھے۔ وطن، نظریے اور ملت کی حفاظت کا درس میں نے اپنے خاندان ہی سے پالیا تھا۔ سکول یا کالج میں میرا شمار کوئی پڑھاکو قسم کے بچوں میں نہیں ہوتا تھا، والدہ کے بنائے ہوئے ٹائم ٹیبل کے مطابق ہم کھیلنے کے وقت پر کھیلتے اور پڑھنے کے وقت پر پڑھتے تھے۔ اسی وجہ سے میں ہر جماعت میں امتیازی نمبرات کے ساتھ کامیاب ہوتا، مجھے بچپن ہی سے اُردو ادب سے گہرا لگاؤ تھا اس زمانے میں بے شمار شعر زبانی یاد تھے۔ میں ترکی النسل ہوں ہمارے اجداد بارہویں صدی عیسوی میں برصغیر آئے تھے۔ خاندانی روایت کے مطابق میرے جد امجد ملک بہبل سلطان محمد شہاب الدین غوری کے دست راست اور اسکی فوج کے ایک دستے کے کمانڈر تھے۔ میرے دادا بھی فوجی افسر تھے۔ پانچ بھائیوں اور دو بہنوں میں میرا آخری نمبر ہے۔ جب میں بچہ تھا تو ہمیشہ اپنی قریبی مسجد میں آذان دیا کرتا تھا، میں نے ابتدائی تعلیم گھر کے قریب گنوری سکول، مڈل جہانگیریہ مڈل سکول اور میٹرک کا امتحان حمیدیہ ہائی سکول سے امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ باؤن میں ہمارا خاندان ہجرت کر کے کراچی منتقل ہو گیا۔ اگست 1952ء میں بھوپال سے اعلیٰ نمبروں کے ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد کھوکھر پار کے راستے کئی کلومیٹر ریت پر ننگے پاؤں چل کر جب میں پاکستان میں داخل ہوا تو میرے سر پر ٹین کا ایک بکس تھا اور میرے گلے میں جوتے لٹک رہے تھے۔ بارڈر کراس کر کے میں ایک ایسی ٹرین میں سوار ہوا جسمیں جانور لائے جاتے تھے اسی ٹرین کے ذریعے کراچی پہنچا۔ روشنیوں کا شہر میری کامیابی کی پہلی

Marfat.com

حضرت شہاب الدین غوریؒ کے مزار کی تعمیر و مرمت بھی کروائی۔

ڈاکٹر خان خاصے اُردو داں ہیں وہ بہت سی سائنسی وانگریزی اصطلاحات کا خوبصورت اُردو ترجمہ کر لیتے، سائنسی مضامین میں فزکس کے علاوہ تاریخ اور اُردو ادب کی کتابیں شوق سے پڑھتا تھا مجھے صرف ایک مضمون حساب سخت ناپسند تھا۔ آپ کی بیوی ڈاکٹر ہنی خان قران مجید کا ڈچ اور انگریزی زبان میں ترجمہ کر چکی ہیں۔

ایک بار ڈاکٹر خان سے کسی نے پوچھا کہ ''آپ نے زندگی میں کیا کھویا کیا پایا''؟ تو ان کا کہنا تھا کہ میں جب اپنے ماضی پر نگاہ دوڑاتا ہوں تو بے اختیار میرے دل سے شکرانے کے کلمات نکلتے ہیں۔ رب العزت کا احسان مند ہوں کہ اس نے مجھے میری بساط سے زیادہ نوازا۔ میں نے تو صرف وطن عزیز کا قرض چکانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے بھائی عبدالقیوم اور ہمشیرہ رضیہ حسین کہتے ہیں کہ ''ہمارے بھائی نے پاکستان سے عشق کیا''۔ قدیر اپنے مشن میں اس حد تک مخلص تھے کہ ہماری والدہ کا یکم ستمبر 1992ء میں انتقال ہوا تو ہمارا یہ لاڈلا بھائی میزائل لانچنگ پروگرام میں مصروفیت کے باعث اپنی ماں کے جنازے میں شرکت نہیں کر سکا تھا۔

انکی زندگی میں ایک ڈرامائی موڑ تب آیا جب انہیں یورینیم کے پھیلاؤ کے الزام میں نظر بند کیا گیا۔ انکے قابل اعتماد ساتھی جنہیں اس جرم میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گرفتار کیا گیا تھا اُن میں میجر اسلام الحق، بریگیڈیر (ر) سجاول خان، ڈاکٹر محمد فاروق خان، نسیم الدین اور ڈاکٹر نذیر احمد شامل ہیں۔ بلاشبہ تنہائی کی زندگی اس گروپ کے لیے بہت بڑا دھچکا ہے۔ نہ جانے وہ آئندہ سنبھل پائیں گے بھی یا نہیں اور مقدر کی زنجیریں انہیں کب تک لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل رکھیں گی ؟

یہ تھا ڈاکٹر خان کا سفر حیات! دکھ کی گہرائی اور عمل کی سچائی اس ذات کے دو کنارے ہیں یہ طے ہے کہ اسکے نام اور جدوجہد کو تاریخ کے اوراق سے کھرچا نہیں جا سکتا۔ ناصر زیدی کا قدیر خان پر تازہ شعر ہے کہ!

تمغہ نیا سجا ہے یہ سینے پہ اسکے اب
پاداش بے گناہی میں گھر میں اسیر ہے

Marfat.com

"اپنے لفظوں سے ان دیکھی دنیا میں لے جانے والا" **"پاکستانی ابن بطوطہ"**

پاکستانی ادبی دُنیا میں قمر علی عباسی کسی تعارف کا محتاج نہیں، علمی، ادبی اور صحافتی میدان میں بے پناہ عزت قمر کے حصہ میں آئی۔ بابا نے لفظوں سے نصف صدی قبل رشتہ جوڑا، اور آج بھی اسے نبھا رہے ہیں۔ تمغہ امتیاز، یونیسف ایوارڈ سمیت پچاس کے قریب دیگر اعزازات انہیں عطا ہوئے۔ قمر علی عباسی کے قلم سے 25 سے زائد سفرنامے اور کہیں تاریخی کہانیاں تحریر ہوئیں، دنیا بھر میں انہوں نے کتنا سفر کیا؟ اگر انکے سفری ٹکٹوں کی رسیدیں اکٹھی کر کے حساب لگایا جائے تو یقیناً وہ "پاکستانی ابن بطوطہ" کہلائیں گے۔ نگر نگر پھر کر خوبصورت الفاظ تراشنے والے قمر علی کے سفرنامے قاری کو ایک ان دیکھی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ قمر عباسی کیسفری مشاہدات سے بھرپور کتاب "بہادر علی" دنیا کی اکثر اہم زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئی، انہوں نے ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن کیلئے کئی ڈرامے بھی لکھے۔ بچوں کے ادب میں بھی "بابا" نمایاں مقام رکھتے ہیں اور ابھی تک بچوں سے متعلقہ انکی 16 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اگر چہ قمر علی عباسی کامیابیوں کی ایک طویل اننگز کھیل رہے ہیں لیکن زندگی کی وکٹ پر "کامیاب کھلاڑی" بننے کیلئے انہوں نے انتھک محنت کی۔ پچاس سال قبل انکے سفر کا آغاز کس جدوجہد سے ہوا یہ جاننے میں نے ایک پروانہ امریکہ روانہ کیا، اس پر اپنے ہاتھوں سے انہوں نے جوابات لکھ کر بھیجے۔ سوالاً جواباً گفتگو پیش خدمت ہے۔

☆ آپکا تعارف، خاندانی و تعلیمی پس منظر؟

میں 13 جون 1938ء کو امروہہ یوپی ہندوستان میں پیدا ہوا، میرے والد عباسی خاندان اور والدہ عثمانی گھرانے سے تھیں، والد یعقوب علی عباسی سروے آف انڈیا میں سروے آفیسر تھے۔ جب پاکستان وجود میں آیا تو انہوں نے پاکستان کیلئے درخواست دی اور محکمہ کی طرف سے دسمبر 1947ء میں کوہ مری آ گئے۔ میں نے یہاں سے تیسری اور چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ میرے ددھیال اور ننھیال میں زیادہ تر لوگ تدریسی شعبے سے منسلک تھے اسلئیے ادب سے لگاؤ بچپن سے ہی تھا، شروع سے بچوں کیلئے لکھتا، میں نے سندھ یونیورسٹی سے بی اے آنرز ایم۔ اے معاشیات اور ایم اے اُردو کیا۔ میں اپنے سکول اور کالج دور بہترین مقرر بھی تھا، ڈھیروں ٹرافیاں اور انعامات حاصل کیے۔

Marfat.com

قمر عباسی سابق وزیر اعظم نواز شریف سے ایوارڈ لیتے ہوئے اس موقع پر [illegible] صاحب بھی موجود ہیں

☆ بچپن کیسا رہا؟

اسی طرح جس طرح سب بچوں کا ہوتا ہے، لیکن میں بڑی منتوں، مرادوں کی اولاد تھا اس لیے والدین کی زیادہ توجہ اور محبت میرے حصے میں آئی۔

☆ زندگی کا کوئی ناقابل فراموش لمحہ؟

زندگی میں جو گزر گیا وہ سب اچھا تھا اور سب یاد ہے۔ اس سلسلے میں دو کتابیں بھی تحریر کیں ہیں ''اک عمر کا قصہ'' اور قمر عباسی 32 ناٹ آؤٹ۔

☆ ریڈیو کی طرف کیسے آنا ہوا، یہ تجربہ کیسا تھا؟

لکھنا میرا پیشہ کبھی نہیں تھا، یہ میرا شوق ہے مشغلہ ہے اور مجھے بے حد پسند ہے۔ یہ تجربہ اس لحاظ سے بہت اچھا رہا کہ میں اپنے تجربات، مشاہدات دوسروں تک پہنچا سکتا ہوں۔ میں لفظوں سے وابستہ ہوا جو کبھی نہیں مرتے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بے انتہا نوازا اور ہر وہ ایوارڈ دیا جسکی تمنا کی جاسکتی ہے۔

☆ اپنی ادبی کاوشوں کے بارے میں بتائیے؟

میرے افسانوں کی تعداد پچیس ہے، 32 سال ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہا۔ ریڈیو میں ملازمت کے دوران میں نے بہت سے ریڈیائی ڈرامے لکھے۔ ''چاند نہیں نکلا'' میرا پہلا ڈرامہ تھا جو میں نے پروڈیوس کیا، اس ڈرامے میں اسوقت کے ممتاز اداکار محمد علی، زیبا نگہت سلطانہ، کمار اور ایم اے رشید جیسے فنکاروں نے صداکاری کی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت اپنے کرم اور احسان سے مجھے عطاء کی۔ کسی قسم کی شعوری کوشش اور کاوش کا اسمیں دخل نہیں، یہ صرف اُس ذات کا کرم تھا جو پتھر کو ہیرا اور مٹی کو سونا بنا دیتی ہے۔ میں نے کالم نگاری شروع کی تو مجھے اے پی این ایس ایوارڈ مل گیا، بچوں کیلئے قلم اُٹھایا تو چار مرتبہ رائٹرز گلڈ ایوارڈ ملا، لندن گیا امریکہ آیا تو یہاں سفرناموں پہ مجھے انعامات ملے۔ اب کوئی حسرت میری باقی نہیں رہی۔

☆ پسندیدہ شخصیت کسے مانتے ہیں؟

میری پسندیدہ شخصیت نیلوفر عباسی میری اہلیہ ہیں کیونکہ انکی وجہ سے مجھے ایک ایسی خوشحال اور پرسکون زندگی بسر کرنے کا موقع ملا جس میں اللہ کی دی ہوئی سب نعمتیں موجود تھیں۔

☆ پاکستان کی مجموعی صورتحال کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

Marfat.com

پاکستان میرا ملک ہے، اس سے ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہے اور جو اسکی حالت ہے سب جانتے ہیں.....اس کو بلندی پر لے جانے کی ذمہ داری ہر اُس شخص پر ہے جو پاکستانی ہے۔

☆ پاکستانی ادب کے مستقبل پر آپ کیا کہتے ہیں؟

''پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ''

☆ پاکستان کے شعراء اور ادیبوں کو کن مسائل کا سامنا ہے؟

کہاں تک سناؤں کہاں تک سنو گے۔

☆ کبھی سیاست میں حصہ لیا یا اس بارے کچھ سوچا؟

میرا سیاسی جماعتوں سے کوئی تعلق نہیں میں صرف اور صرف پاکستانی ہوں۔ جمہوریت کا حامی ہوں کیونکہ اس سے بہتر کوئی طرز حکومت ابھی تک رائج نہیں ہوا۔

☆ آپ کا پیغام؟

قرآن پاک کے پہلے لفظ پر عمل کریں، اقراء یعنی ''پڑھ'' تعلیم حاصل کریں۔ علم وہ روشنی ہے جو بے روزگاری ،غربت، جہالت اور بیماری پر قابو پالیتی ہے۔

Marfat.com

کل کی صحافی آج کی سفارت کار

بیسویں صدی کے رواں عہد میں خواتین مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے میں فخر محسوس کرنے لگی ہیں، مسلم دنیا کا مردانہ نظام کہیں انہیں اگے بڑھنے سے روکتا ہے تو کہیں انکی حوصلہ افزائی بھی ہوتی ہے۔ کم خواتین ایسی ہیں جنکا راستہ زمانہ نہیں روک سکتا۔ آج آپ کو ایک ایسی ہی خاتون سے ملاتے ہیں جسکی کتاب حیات کا کل صحافت اور آج سفارت کاری سے بھرا ہے۔ ڈاکٹر ملیحہ لودھی! لاہور کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ملیحہ لودھی اپنے بچپن ہی میں صحافتی دنیا کا رُخ کرلیا ہوگا چونکہ انکی والدہ بھی پیشہ صحافت سے وابستہ تھیں، اس لحاظ سے وہ ''پیدائشی صحافی'' کا درجہ رکھتی ہیں۔ ملیحہ کی ابتدائی تعلیم راولپنڈی کے کانونٹ سکول سے ہوئی، وہ اسلام آباد یونیورسٹی میں بھی زیرِ تعلیم رہیں اسکے بعد اپنے وجود کو تسلیم کرانے 73ء میں لندن سکول آف اکنامکس چلی گئیں۔ اس نے 76ء میں ماسٹرز کیا، 80ء میں اکنامکس اینڈ پولیٹکل سائنس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملیحہ پہلے شعبہ تعلیم اور پھر ریاست کے چوتھے ستون صحافت سے وابستہ ہوگئیں۔ انہیں اہم ترین ملکی و بین الاقوامی اداروں میں لیکچرز دینے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ انکی خدمات کے عوض اگست 2002ء میں انہیں صدارتی ایوارڈ ''ہلال امتیاز'' عطا ہوا۔ عالمی شہرت یافتہ جریدے ''ٹائم'' نے 94ء میں انکا نام دنیا کی سو اہم ترین شخصیات میں شامل کیا تھا۔

اب میں چاہوں گا کہ معروف سفارت کار، دانشور اور صحافی ڈاکٹر ملیحہ لودھی آپ سے خود مخاطب ہوں۔ میں قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں پبلک ایڈمنسٹریشن اور لندن سکول آف اکنامکس میں پولیٹکل سوشیالوجی پر لیکچرز دیتی رہی۔ 87ء میں صحافت سے منسلک ہوئیں اور اسوقت کے انگریزی اخبار ''دی مسلم'' کی ایڈیٹر کے طور پر فرائض سرانجام دیئے۔ 94ء میں مجھے امریکہ میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا گیا جہاں میں نے تین سال تک کام کیا۔ جب امریکہ سے واپس اپنے دیس آئی تو ایک بار پھر قلم اُٹھالیا 2003ء میں مجھے برطانیہ میں پاکستانی ہائی کمشنر بنایا گیا۔ میرا صحافت اور پھر سفارت کاری کرنے کا مقصد

Marfat.com

صرف ملک کی خدمت کرنا تھا۔ جب میں برطانیہ آئی تو اسوقت میرے ذہن میں میرے اہداف بڑے واضح تھے۔ میں نے ملک کے امیج کو بہتر بنانے، پاک برطانیہ تعلقات کو بہتر بنانا، سٹریٹجک ڈائیلاگ کا آغاز کے حوالے سے کافی کام کیا۔ میری نظر میں اگر پاکستان اور برطانیہ کے تعلقات اچھے ہونگے تو نہ صرف دونوں ممالک کے درمیان سرمایہ کاری بڑھے گی بلکہ برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کے مسائل بھی حل ہوں گے۔ پاکستانی کمیونٹی کے برطانیہ میں مواقع بھی ہیں اور چیلنجز بھی۔ ملیحہ لودھی کے خیال میں صدر جنرل پرویز مشرف کی دور حکومت میں عالمی سطح پر پاکستان کا امیج بہت بہتر ہوا۔ ملیحہ لودھی اس بارے میں کہتی ہیں کہ دنیا جانتی ہے کہ مشرف نے اقتدار شوق سے نہیں سنبھالا تھا، وہ تو صورتحال ہی کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ مشرف کے پاس کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ صدر مشرف نے جس طرح اپنی جان داؤ پر لگا کر امریکہ اور اتحادیوں کا ساتھ دیا وہ کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ ایک سوال کے جواب وہ کہتی ہیں کہ کشمیر ایک دیرینہ تنازعہ ہے جو عرصہ دراز سے جنوبی ایشیا میں قیام امن کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا تب تک جنوبی ایشیا میں امن کے قیام کے خواب کو بھی تعبیر نہیں مل سکتی۔

نائن الیون کے بعد علما کرام کا کردار بہت بدل گیا ہے اور برطانیہ میں علماء نے انتہائی مثبت کردار ادا کیا۔ ملیحہ لودھی مطالبہ کرتی ہیں کہ بڑی طاقتیں دہشگردی کے خلاف جنگ کو کشمیر اور فلسطین میں آزادی کی تحریکوں کو دبانے کیلئے استعمال نہ ہونے دیں چونکہ اسکے اصل ہدف سے توجہ ہٹ جائیگی۔ ملیحہ لودھی کہتی ہیں کہ بین الاقوامی تعلقات میں کوئی ملک مستقل دوست یا دشمن نہیں ہوتا۔ امریکہ اور پاکستان دونوں اپنے اپنے قومی مفادات کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ملیحہ لودھی کی نظر میں ایک اچھا صحافی اچھا سفارت کار تو بن سکتا ہے مگر ایک اچھا سفارتکار اچھا صحافی نہیں بن سکتا۔ ملیحہ لودھی سے جب پوچھا جاتا ہے کہ آپ نے کس میں زیادہ لطف اُٹھایا تو ان کا کہنا تھا کہ شعبہ صحافت میں بھی مطمئن تھی اور سفارت کاری میں بھی اطمینان ہے۔

ذخیرہ

Marfat.com

سردار مہتاب کی ذات کے مختلف خانے

کپڑے کے کاروبار سے وابستہ محمد نواز کے گھر 1952ء میں ایک ''مہتاب'' نمودار ہوا، جس نے پسماندہ دھرتی کی آواز پہلی بار اونچے ایوانوں تک پہنچائی۔ سردار مہتاب کے چچا سرفراز خان سیاسی و سماجی امور کی جانب مہتاب خان کو توجہ دینے پر راغب کرتے اور کاروباری فرد کی حیثیت سے پولٹری ایسوسی ایشن کے پلیٹ فارم سے اپنے آپ منوانے کی جنگ بھی کرتے رہے، مگر انکے وکیل بھتیجے نے سیاست میں ایک ناقابل فراموش مقام حاصل کر کے سب کو حیرت کی کھائی میں دھکیل دیا۔ پولٹری کے کاروبار سے شروع ہونیوالی انکی انوکھی جدوجہد 1997ء میں انہیں صوبائی اسمبلی کے قائد ایوان تک لے گئی۔ پسماندہ سرکل بکوٹ کا یہ پہلا ''سی ایم'' بتیس مہینے تک جیل کی ہوا کھاتا رہا۔ انکی عوامی خدمات کو مقامی سیاستدان مختلف دلیلوں سے متنازعہ بنا دیتے ہیں مگر اس امر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سردار نے مختلف ادوار میں پسماندہ علاقوں میں بجلی کی روشنی کی فراہمی اور چند دیگر منصوبوں کی تکمیل کیلئے بے نظیر کردار ادا کیا۔

مہتاب احمد خان کا نام سرحد کے سیاسی حلقوں میں ایک منفرد تعارف رکھتا ہے اور آٹھ یونین کونسلز کی دھرتی سرکل بکوٹ میں انکی حیثیت مرحوم نوابزادہ نصر اللہ کی سی ہے مگر سردار مہتاب گروپ کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود انکا گراف اس وقت نیچے آیا جب مشرف حکومت کے دوسرے بلدیاتی انتخابات میں وہ اپنا آبائی پولنگ سٹیشن بھی ہار گئے۔ اسی طرح قومی اسمبلی کے انتخابات میں انہوں نے وفاقی وزیر پیٹرولیم امان اللہ جدون کے مقابلے میں ایک سوشل ورکر ڈاکٹر اظہر جدون کی بھرپور حمایت کی مگر انہیں بھی کئی ہزار ووٹوں سے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

سردار مہتاب کے ماضی میں جھانک کر دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس ہونہار فرد نے گورنمنٹ ہائی سکول اوسیاہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، پھر کوہسار کے ان خارزاروں کی خاک چھانتا وہ ملکوٹ سے راولپنڈی منتقل ہو گیا اور یہاں سے بی اے اور پھر ایل ایل بی مکمل کی۔ مہتاب خان اپنے والد

Marfat.com

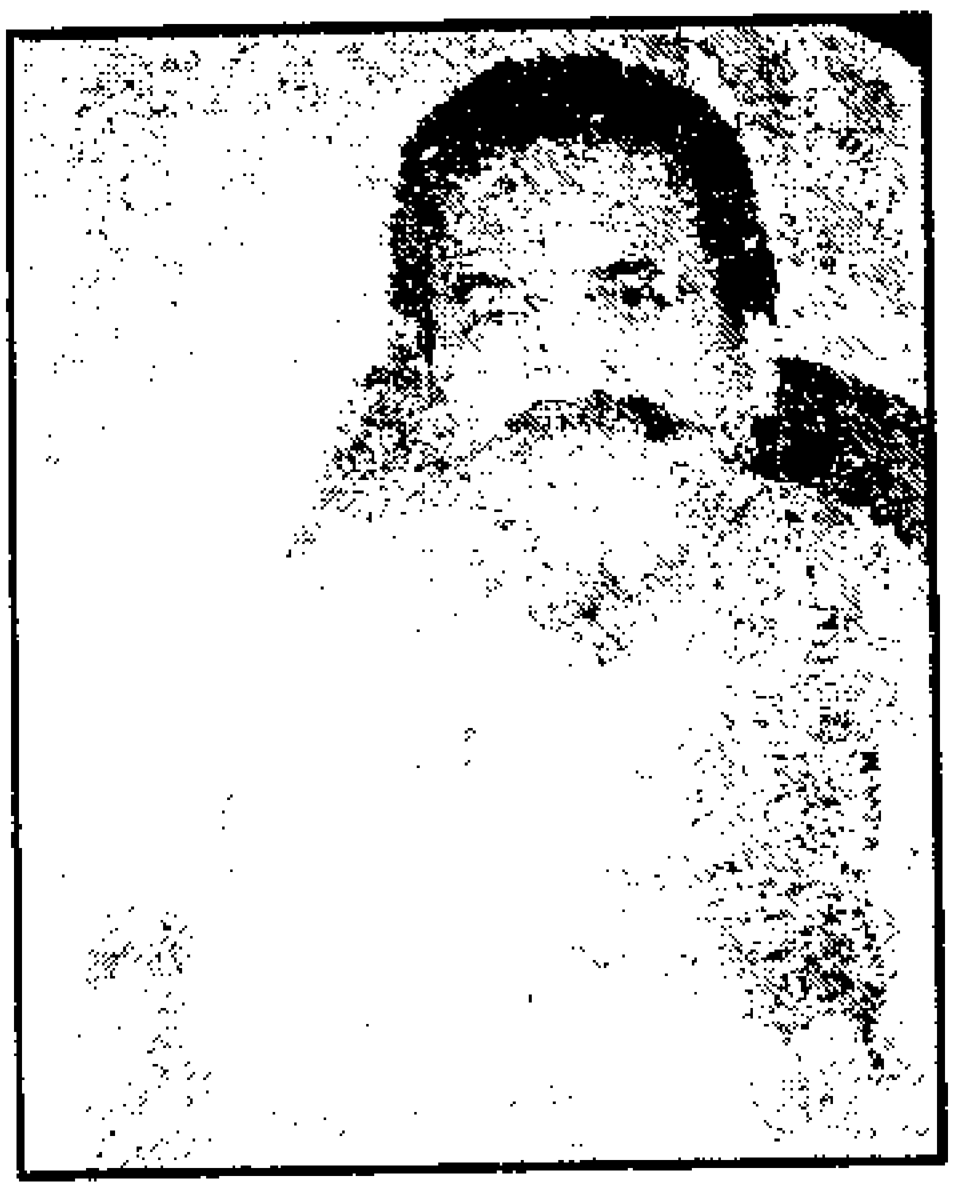

کے کپڑوں کے کاروبار اور چچا کے پولٹری بزنس سے بھی وابستہ رہے۔85ء کے عام انتخابات میں سردار مہتاب احمد آزاد امیدوار کے طور پر سیاست میں قدم رکھ دیا پھر وہی ''لوگ ملتے گئے ،کارواں بنتا گیا'' والی بات۔ پچاسی کے بعد ہر الیکشن میں مہتاب کا سورج ہی چمکتا رہا۔

بارہ اکتوبر1998ء کے دن نے تو اس ''مہتاب'' کو یوں ڈوبویا کہ ایسے لگتا تھا اب وہ کبھی نہیں اُبھر پائے گا مگر وہ ساڑھے نوسو دن جیل میں گزارنے کے بعد ممبر سینٹ آف پاکستان کے طور پر ایک دفعہ پھر سامنے آ گیا ۔سردار مہتاب کو گندم سکینڈل میں اٹک قلعے میں بند کیا گیا۔اسکیقید کے دنوں میں سردار ادریس کی صورت میں گلیات سے ایک اور لیڈر نکل آتا ہے،جس نے آغاز میں سردار مہتاب سے اپنا نام وابستہ کیا مگر نہ جانے کیوں اسے بھی اپنی طاقت (مجلس عمل) کی کتابمیں ڈالنا پڑی۔ادریس کو صوبائی کابینہ میں وزیر بلدیات کی ذمہ داری ملی۔

مہتاب خان کو انکے چچا اُنگلی پکڑ کر سیاست میں لائے اور سردار مہتاب کا ہاتھ پکڑ کر انکے بیٹے شہر یار خان اور شمعون خان بھی قیادت کے عزائم رکھتے نظر آتے ہیں۔

Marfat.com

''مجھے اس لڑکے کے ماتھے پر لکھا نظر آ رہا ہے کہ یہ ضرور ملک میں کوئی طوفان لائے گا'' یہ الفاظ 1940ء میں ایک ہندو اُستاد رام چند نے تحصیل پونچھ کے گاؤں غازی آباد کے سولہ سالہ نوجوان سردار قیوم کے بارے میں کہے تھے۔ اس نوجوان نے زمانے کی سازگاری کا انتظار نہیں کیا بلکہ دِن رات ایک کر کے رام چند کے ان الفاظوں کو کافی حد تک سچ ثابت کر دکھایا، فقیرانہ عادات کے مالک سردار قیوم کی جہد وجہد کشمیر سے آج زمانہ واقف ہے۔ قیوم خان چار مرتبہ آزاد کشمیر کے صدر ایک بار وزیر اعظم اور دو سال تک قانون ساز اسمبلی کے قائد حزب اختلاف رہے۔ 83ء سالہ سردار نے عمر بھر آزاد کشمیر کی سیاست میں ایک متحرک کردار ادا کیا۔ سردار صاحب کی صورت میں موجود ایک جیتی جاگتی تاریخ سے ملاقات کیلئے ''مجاہد منزل'' پہنچا تو انہوں نے حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر دھیمے لہجے میں گفتگو شروع کی۔

سردار صاحب کیا سوچتے ہیں.....؟ کیا کرتے ہیں.....؟ نیلا بٹ کے مقام پر ''سیاسی'' گولی چلی تھی یا.....؟ سردار کی ذات کی کشتی کون کون سے طوفان عبور کر کے کامیابی کی منزل تک پہنچی اور قومی و بین الاقوامی مسائل پر ان کا کیا مواقف ہے.....؟ آیئے یہ اسکے ساتھ کچھ مزید بھی جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

سردار عبدالقیوم خان 1924ء میں ضلع باغ کے چھوٹی سے گاؤں ''غازی آباد'' کے ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئے، انڈیا اور لاہور کے تعلیمی اداروں سے ابتدائی تعلیم کے بعد برٹش انڈین آرمی میں شامل ہو گئے جہاں انہیں جنگی حکمت عملی کے حوالے سے کافی باتیں سیکھنے کا موقع ملا۔ مقبوضہ کشمیر کی آزادی کیلئے پہلی گولی چلانے کے اعزاز میں وہ ''مجاہد اول'' کہلائے یہ الگ بات ہے کہ ان کے سیاسی مخالفین اس حوالے سے اپنا الگ مواقف رکھتے ہیں مگر کشمیر کاز کیلئے انکی بے مثال جدوجہد کو نہ صرف انکے حریف تسلیم کرتے ہیں بلکہ عالمی برادری بھی مسئلہ کشمیر کے

Marfat.com

حوالے سے انکی خدمات کا اعتراف کرتی ہے۔وکٹوریہ جوبلی ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے والے سردار قیوم کسی بھی موضوع پر اُردو اور انگریزی میں دلائل دے سکتے ہیں۔سردار قیوم دنیا کے ممتاز اطلاعتی مراکز اور تعلیمی اداروں کے علاوہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول، کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کوئٹہ، سول سروسز اکیڈمی لاہور اور نیشنل ڈیفنس کالج میں باقاعدگی سے عسکری حکمت عملی اور کشمیر ایشو پر لیکچر دیتے آئے ہیں۔انکے ''ولی عہد'' سردار عتیق احمد خان ان دنوں وزارت اعظمی کے تخت پر فائز ہیں۔

دنیا بھر کے کشمیریوں کی زبان سے نکلنے والا نعرہ ''کشمیر بنے گا پاکستان'' انہی کا تخلیق کردہ ہے۔آپ اُردو کی نو اور انگریزی کی چھ کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔سردار صاحب کی زندگی جہادِ کشمیر، کشمیر کاز اور آزاد کشمیر کے اقتدار میں گزری ہے۔

اپنے بچپن کے بارے میں بہت سی باتیں یاد نہیں ہیں تاہم انہیں یہ یاد ہے کہ میں اتفاقات اور حادثات کی بدولت کرسی صدارت تک نہیں پہنچا بلکہ جس قوم کی آزادی کیلئے میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ وقف کیا اُس نے کثرت رائے سے مجھے منصب صدارت تک پہنچایا۔

وہ ایسا شخص ہے جس پر خود آنے والی نسلیں ناز کریں گی لیکن سردار صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اپنے ماضی پر کم بات کرنے کا کہتے ہوئے یہ مواقف اختیار کیا کہ میں پیچھے مُڑ کر دیکھنا پسند نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ آگے کو دیکھتا ہوں۔میں نے اپنی شخصیت کو بھی سامنے نہیں رکھا میرے پیش نظر ہمیشہ مقاصد رہے ہیں۔

وہ دوسروں کو قائل کرنے اور انہیں اپنا ہم نوا بنانے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔چند منٹوں کی ملاقات میں انہوں نے ایسے جملے ادا کیے جنہیں ذہن میں لا کر انکی بڑھائی کا احساس ہوتا ہے۔کہنے لگے میں نے بائیس سال کی عمر میں اپنی غیرت کی زنجیر کو دشمن کے گلے کا ہار بناتے ہوئے غلامی کی افیون کھا کر سوئی قوم کو بیدار کیا۔جب ہم نے ڈوگرہ سپاہیوں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا تو ڈوگرہ حکومت نے میرے سر کی قیمت کا اعلان کیا۔میرے افراد خانہ کو گرفتار کر لیا گیا۔مجھے کہا گیا کہ گرفتاری دے دو لیکن میں نے تب واضح الفاظ میں کہا تھا کہ ''پوری قوم کی ماں بہنوں کی عزت میری عزت ہے میں اپنی ماں بہن کیلئے

Marfat.com

مجاہد منزل میں ہونے والی ملاقات میں سردار قیوم کا ایک انداز

قوم کی عزت کو داؤ پر نہیں لگا سکتا، میں انہیں خدا پر چھوڑتا ہوں، گرفتار ہونے کے بجائے میں لڑنا چاہتا ہوں''۔ سردار کہتے ہیں کہ نیلا بٹ سے چلنے والی تحریک اسلامی اصولوں کے عین مطابق تھی اسوقت ہم نے طاقت کے باوجود نہتے لوگوں کا خون نہیں کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ نیلا بٹ سے شروع ہونیوالی تکمیل پایہ تکمیل تک ضرور پہنچے گی۔ کروڑوں کشمیریوں کی قسمت کا فیصلہ ابھی ہونا ہے بھارت نے کشمیر کے حوالے سے سب اچھا کی جو رٹ لگا رکھی ہے وہ دھوکہ اور فریب کے سواء کچھ بھی نہیں۔

مسئلہ کشمیر کے پس منظر پر بات چیت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ ایک لمبی اور پیچیدہ داستان ہے۔ اسکی پیدائش کے دو پس منظر ہیں پہلا وہ نتائج جو تقسیم ہند سے رانما ہوئے اور دوسرا انگریزوں اور ہندوؤں کی ملی بھگت، جو پاکستان کے استحکام اور اتحاد کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کی گئی۔ تقسیم ہند کی دستاویز کے مطابق اسوقت کے ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے لوگوں کو ایک حق دیا گیا تھا کہ وہ کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں چونکہ اس حق سے آزاد کشمیر کی عوام کو جبراً محروم کیا گیا اسلئے اس مسئلہ کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ انگریزوں اور ہندوؤں نے کشمیر قادیانیوں کو اپنے ساتھ ملا کر گورداسپور کو غیر مسلم اکثریت کا ضلع قرار دلایا اور اسطرح بھارت کو کشمیر کے اندر فوجیں بھیجنے کا راستہ ملا اور انہوں نے اس وادی میں آگ و خون کا بازار گرم کیا۔ بھارت کو اگر فوجیں بھیجنے کا راستہ نہ ملتا تو کشمیر کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا تب ریاست کے لوگ اپنے جغرافیائی حصہ کے ساتھ خود بخود کشمیر میں شامل ہو جاتے۔ بھارت نے برصغیر کی تقسیم کو روز اول ہی سے تسلیم نہیں کیا، چونکہ ہندو جانتے ہیں کہ کشمیر کے پاکستان میں شامل ہونے سے یہ ملک ناقابل تسخیر قلعہ بن جائے گا، انگریز اور ہندو نے پاکستان کو نامکمل رکھنے کیلئے یہ مسئلہ کھڑا کیا۔ ایک سوال کے جواب میں سردار قیوم نے مواقف اختیار کیا کہ خود مختیار کشمیر کی باتیں ذہنی عیاشی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مسئلہ کشمیر پر اقوام متحدہ نے بھی آج تک اپنا وہ فرض ادا نہیں کیا جسکے لیے اسکا قیام عمل میں لایا گیا۔ میں بچپن سے عالم اسلام کے اتحاد کے بارے میں سوچتا تھا۔ ایک کارکن بنے کی

Marfat.com

خواہش ضرور میرے دِل میں رہی مگر قیادت کا کبھی بھی میں نے اپنے ذہن میں تصور نہیں تھا۔ دوسروں کو دھکیل کر آگے بڑھنے کی حرکت کبھی مجھ سے سرزد نہیں ہوئی، یہی وجہ ہے کہ زندگی میں شخصی طور پر تصادم نہیں ہوا۔ لوگ میرے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں لیکن میں ان کی پروہ نہیں کرتا بلکہ اپنے کام میں لگا رہتا ہوں تحریک آزادی کشمیر کیلئے میں نے کیا کچھ کیا یہ بھی ایک طویل کہانی ہے اگر خود سناؤں تو لوگ خودنمائی کہیں گے۔

''کیا آپ مارشل لاء حکومتوں کے حامی رہے ہیں''؟ جب 1958ء میں ایوب خان نے مارشل لاء لگایا تو میں پہلا شخص تھا جس نے مارشلا کی مخالفت کی، تاہم میں یحیٰی دور کو اس اعتبار سے بہتر سمجھتا ہوں کہ اسمیں آزاد کشمیر کو ایک صوبے کے برابر حقوق دیئے گئے۔ فوجی اور ترقیاتی اصلاحات ہوئیں، کشمیر کونسل معرض وجود میں آئی اور خارجہ پالیسی میں کشمیریوں کی آواز شامل کی گئی۔ سردار قیوم کہتے ہیں کہ بنگلہ دیش کے الگ وجود کا سبب بننے والی صورتحال میں تینوں یعنی یحیٰی خان، ذوالفقار بھٹو اور مجیب الرحمٰن تینوں قصوروار تھے یا تینوں بے قصور تھے میں اس بارے میں آج تک فیصلہ نہیں کر پایا۔ ''آپ فوجی اور سیاسی حکومتوں میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں''؟ فوج اور سیاستدانوں کے اقتدار میں واضح اور بڑا فرق ہے۔ فوج کا اصل کام ملک کا دفاع ہے انکے اقتدار میں آنے سے سیاسی لیڈر شپ کا فقدان پیدا ہوتا ہے، اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ خلا بڑھتا جاتا ہے۔ اس لیئے میں سمجھتا ہوں کہ فوج کا اصل کام سیاست کرنا نہیں ہے۔

جنرل ضیاء الحق کی حادثاتی موت کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک حادثہ تھا، اسمیں امریکی بھی ملوث تھے۔ انہوں نے حادثہ ظاہر کرنے کیلئے اپنا سفیر بھی مروا دیا تا کہ اقوام عالم اسے حادثہ قرار دیں۔ سردار قیوم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جنرل ضیاء الحق سمیت کئی پاکستانی اہم لوگوں نے انہیں پاکستانی سیاست میں حصہ لینے کی دعوت دی مگر انہوں نے ہمیشہ شہ رگِ پاکستان کو سنبھالنے کا ہی عزم کیا۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ سابق خاتون وزیراعظم پاکستان بےنظیر بھٹو کے دونوں ادوار ایک دوسرے سے مختلف تھے، اپنے پہلے دور میں وہ بات سنتی تھی مگر عمل نہیں کرتی جبکہ دوسرے دور میں تو وہ بات بھی نہیں سنتی تھیں۔ نواز شریف کے بارے میں مجاہد اول کا خیال ھیکہ وہ سیاست بالکل نہیں سمجھتے تاہم انکی قسمت بہت اچھی ہے۔ اسی طرح پرویز مشرف کے بارے میں بھی وہ کہتے ہیں کہ جنرل مشرف ایک خالص فوجی ہیں،

Marfat.com

سیاست انکی فیلڈ نہیں، وہ کشمیر جوائنٹ سیشن سے خطاب کیلئے آئے تو میں نے وہاں اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ''جنرل مشرف کی کشمیر پالیسی کی سمجھ تو آتی ہے لیکن ان کی دوسری پالیساں میرے اوپر سے گزر جاتی ہیں''۔

موروثی سیاست سے متعلق پوچھے گئے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میرا بیٹا سردار عتیق میری کوشش سے وزیر اعظم نہیں بنا، اس نے خود کوشش اور محنت کی جسکا اسے صلہ ملا، میں سمجھتا ہوں کہ میرے پوتے عثمان میں بھی سیاست کے جراثیم موجود ہیں۔ ہماری سیاست ایک کھلی کتاب ہے جو آئے اسے پڑھ سکتا ہے۔ ہماری جماعت مسلم کانفرنس نے کبھی دشمنی کی سیاست نہیں کی اور فسادکی سیاست کے بھی ہم ہمیشہ خلاف رہے ہیں۔ مورخ جب تاریخ لکھے گا تو وہی بتائے گا کہ مسلم کانفرنس کا کیا کردار رہا اور دوسروں نے کشمیر کاز کیلئے کیا کیا۔

ذاتی زندگی سے متعلق سوالوں کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں ذہنی اور فکری طور پر فوجی ہوں، اسلیئے کبھی کبھی فوجی یونیفارم پہن لیتا ہوں، میوزک سننے کا بلکل شوق نہیں البتہ کبھی وقت ملے تو تو الی سُن لیتا ہوں، اللہ تعالٰی کا ذکر میری زندگی کا اثاثہ ہے، مجھے تصوف کی زندگی بہت اچھی لگتی ہے، دنیا بھر میں سب سے زیادہ اپنے گاؤں میں سکون ملتا ہے، کسی سے توقعات ہیں نہ مدد چاہتا ہوں، میرے لیئے اللہ ہی کافی ہے۔

Marfat.com

قاری خوشی محمد کا خوش آواز فرزند

میری خواہش ہے کہ میں آپ کو مرحوم قاری خوشی محمد الزھری کے خوش آواز صاحبزادہ نجم مصطفیٰ سے متعارف کروانے سے قبل اوکاڑہ سے تعلق رکھنے والے پاک نیوی کے ایک معمولی ملازم خوشی محمد کے متعلق بتا رہا ہوں، جس نے اپنی خوبصوت آواز کو استعمال میں لا کر دنیا کے اکثر کونوں تک شناخت حاصل کی۔ خوشی ملازمت کے سلسلہ میں لاہور آئے یہاں سے پھر اپنی منزل کی تلاش میں 77، میں اسلام آباد کی طرف بڑھے، جہاں انکے عروج کی کہیں کہانیاں قلمبند ہوئیں۔ اسی سال جب قومی مقابلہ قرأت انعقاد پذیر ہوا، تو ملک بھر کے قراء حضرات میں سے قاری خوشی محمد پہلے نمبر پہ آئے۔ اس کے بعد اسوقت کے مارشل لاء ایڈمنسٹر جنرل ضیاء الحق نے انہیں اعلیٰ تربیت کے لیے جامعہ الزھر بھیج دیا، جہاں سے فرغت کے باعث قاری خوشی محمد الزھری کے حصے میں وہ مقام آیا کہ قرات میں پاکستان سمیت دنیا کے کئی اسلامی ممالک کو انکا متبادل نہیں مل سکا اگرچہ انکے جگر گوشہ نجم مصطفیٰ نے اپنی آواز سے عالم اسلام میں ایک منفرد نام پیدا کیا۔ ایوان صدر، قومی اسمبلی، ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن کے قاری نجم مصطفیٰ 12 اگست 1998ء کو قاری خوشی محمد الاھزری کے انتقال کے بعد کچھ اس طریقہ سے سامنے آئے کہ ''وہ آیا، اس نے دیکھا اور فتح کر لیا والا جملہ ان پہ صادق آتا ہے''۔ نجم کی ابتدائی تعلیم سرسید سکول راولپنڈی، ڈویژنل پبلک سکول سے میٹرک اور پھر اسلام آباد کالج فار بوائز سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ وفات کی ناگہانی موت کے باعث انہوں نے دینی تعلیم کو ترک کر کے اپنے ادارے ''قرآن اکیڈمی'' پر توجہ دینا شروع کر دی۔ نجم کی دیرینہ خواہش ہے کہ اس کا ادارہ دنیا بھر میں دینی تعلیم اور اسلامی پیغام کے فروغ کیلئے انفرادی کردار ادا کرے۔ قاری نجم شیخ مصطفیٰ اسماعیل سے متاثر ہیں۔

Marfat.com

ٹاٹ سے لارڈ تک

میر پور کے گاؤں ''کلیال'' کا ایک گیارہ سالہ بچہ روشن مستقبل کی تلاش میں جب دیارِ غیر گیا تو اسکی کوئی راہ متعین نہیں تھی کہ اسے جانا کہاں ہے...... مستقبل کا کوئی خاکہ نہیں تھا کہ کیا کرنا ہے .... اس نے اپنے لیے خود راستے ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا.... اپنے دماغ سے اُٹھنے والی روشنی کو صحیح سمت لگایا .... پھر اسکی راہ میں پتھر آئے، کانٹے بھی، دھوپ کی تمازتیں بھی رہیں اور موسم کی سرد مہریاں بھی .... مگر عزم و حوصلے اور اپنی دنیا تعمیر کرنے کی لگن نے اس دیہاتی نوجوان کو ''لارڈ نذیر احمد'' کی پہچان دی اور جو شہرت، عزت اور دولت اس کے حصہ میں آئی اسکا تصور کسی خواب سے کم نہیں۔ ٹاٹ سے لارڈ تک طے ہونیوالا سفر کی روداد جاننے کیلئے ان سے دو ملاقاتیں ہوئیں اور جب وہ برطانیہ چلے گئے تو میں نے ''کاغذی ہوائی جہاز'' بنا کر انکے پیچھے روانہ کر دیا .... سوالات سے بنایہ ''طیارہ'' جب انکی نظروں سے ٹکرایا تو انہوں نے ٹیلیفون پر جوابات دیئے۔ لارڈ نذیر سے ہونیوالی گفتگو پیش خدمت ہے۔

''میں آپ کو اپنی زندگی کے حوالے سے بتاتا ہوں جسکی تفصیل میں آپ کے کئی سوالوں کے جواب ہونگے، لارڈ احمد نے یہ کہہ کر اپنے بچپن، تعلیم و تربیت کے مراحل اور شاندار کامیابی پر پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کرنے لگے کہتے ہیں کہ میں 24 اپریل 1957ء کو میر پور کلیال میں پیدا ہوا۔ میرے والد حاجی سائیں محمد مزدور کسان تھے۔ میرے والدین پڑھے لکھے نہیں تھے مگر انکے دل میں اپنی اولاد کو تعلیم دلوانے کا تمنا تھی۔ مجھے پڑھائی سے گہری دلچسپی تھی اسلیئے میری عزت سب چھوٹے بڑے کرتے۔

میرے والد پہلے پنجاب کے علاقوں میں بھٹوں پر کام کرتے تھے اور پھر انہوں نے اپنے علاقہ میں آکر زمینداری شروع کی اور اسکے بعد وہ انگلینڈ کی سٹیل فیکٹریز میں بھی ملازمت کرتے رہے۔ میرے بچپن ہی سے ہمارے علاقہ کے بہت سے لوگ محنت مزدوری کیلئے برطانیہ جانا شروع ہوگئے تھے۔ میرے والد بھی تب ہی برطانیہ چلے گئے۔ میرے نانا سیف علی اپنے گاؤں کے نمبردار تھے۔ ابتدائی تعلیم کے حصول کیلیے میں جس سکول میں داخل ہوا، اس سکول کی کوئی مستقل عمارت نہیں تھی اسکے باوجود میں محنت نے ترک نہیں

Marfat.com

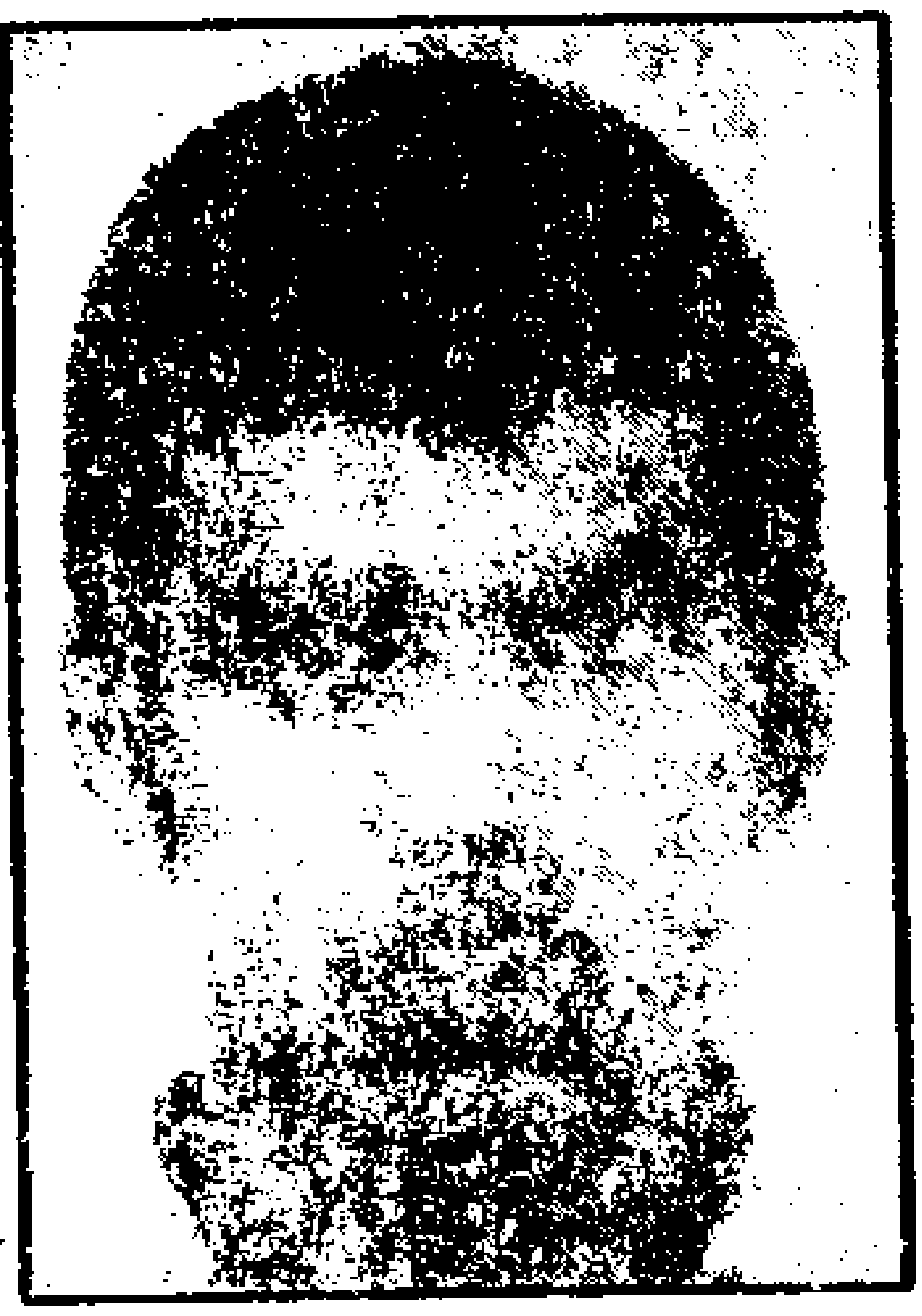

کی۔ بچپن میں کھیل کے ساتھ ساتھ تلاوت کرنا اور نعتِ رسول مقبول ﷺ پڑھنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ کم عمری میں ہمارے سکول کے دورے پر آئے ہوئے محکمہ تعلیم کے ڈی او کی جانب سے ملنے والا ایک روپیہ میرا پہلا ''باضابطہ انعام'' تھا، جس نے مزید کام کرنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ 1969ء میں جب میں پانچویں سے پاس ہوا تو میرے والد انگلینڈ میں قدم جما چکے تھے۔ 14 نومبر 1969ء کو میں بھی اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ برطانیہ آ گیا، یہاں مجھے ''سپرلے'' سکول میں داخل کروایا گیا۔ ابتداء میں یہاں کے ماحول میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا پھر یہ سفر آسان ہو گیا۔ 76-75ء میں جب ٹامس رادھرم کالج میں طلباء یونین کے انتخابات انعقاد پذیر ہوئے تو میں نے کافی محنت کی اور مجھے کالج یونین کا صدر منتخب کو لیا گیا یوں میں یہاں کا پہلا ایشیائی صدر تھا۔ برطانوی سیاست میں اس پہلی فتح نے میرے قدم مضبوط کیے۔ سیاسی عمل کو جاری رکھنے کیلئے میں نے محسوس کیا کہ معاشی طور پر مستحکم ہونا نہایت ضروری ہے لہذا 1978ء میں کاروبار کی جانب توجہ دی اور منی مارکیٹ سٹور چلایا جہاں سے تھوڑے ہی وقت میں کامیابیاں ملتی گئیں۔

اپنے سیاسی سفر کے بارے انہوں نے کہا کہ میں نے لیبر پارٹی کے پلیٹ فارم سے برطانیہ میں اُسوقت متحرک کردار ادا کرنا شروع کیا جب پارٹی میں پاکستانیوں اور کشمیریوں کی کوئی نمائندگی نہیں تھی۔ ہاں! آپکو بتا تا چلوں کہ میں نے 85ء میں پاکستان آ کر یہاں ریسٹورنٹ قائم کر کے بزنس کی کوشش کی لیکن یہ تجربہ بُری طرح ناکام رہا اور مجھے پھر انگلینڈ آنا پڑا۔ مجھے انگلینڈ میں تین مرتبہ کونسلر اور کم عمرترین مجسٹریٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ میں 1992ء میں نیشنل فورم آف برٹش مسلم کونسلرز کا کنوینز منتخب ہوا، اسکے دو سال بعد میری شادی ہوئی، اہل خانہ کو ہمیشہ یہ شکوہ رہتا ہے کہ میں اپنا تمام وقت سیاسی سرگرمیوں میں لگا دیتا ہوں۔ میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے اور بیگم نے گھر میں مشرقی ماحول آج بھی قائم رکھا ہوا ہے۔ 1990ء میں کونسلر منتخب ہو کر سیاسی میدان میں بھرپور جدوجہد شروع کی، 92ء میں مجھے رادھرم کا سب سے کم عمر مجسٹریٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مجھے مسلمانوں کی سماجی سطح پر پسماندگی کا احساس تھا اسلیئے مسلمان کونسلرز کو یکجا کر کے ''نیشنل فورم آف برٹش مسلم کونسلرز'' کے نام سے ایک تنظیم بنائی اور نسلی امتیاز کے خلاف تاریخی

Marfat.com

جد وجہد کی۔20جون1998ء کا دن میری زندگی میں اہم حیثیت رکھتا ہے جب ہاؤس آف لارڈز کے نئے ممبران کے ساتھ مجھے بھی اسکی رُکنیت دی گئی۔ ہاؤس آف لارڈ کا جب ممبر بنا تو دعا کی کہ ''یا باری تعالیٰ تو نے عظیم ذمہ داری میرے کاندھوں پر ڈال دی ہے مجھے اس سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمانا، مجھے اس منصب کے ذریعے اسلام کا خادم بن کر مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کا شرف بخشنا''۔

اجداد کی دھرتی کشمیر کے متعلق اُن کا کہنا ہے کہ مسئلہ کشمیر پر میری جدوجہد صرف بیانات تک محدود نہیں، میں نے اس مسئلہ کے حل کیلئے ایک طویل جدوجہد کی ہے۔90ء میں پہلی بار یورپین پارلیمنٹ میں بھرپور کوشش کر کے اسکے حق میں قرارداد منظور کروائی۔ مسئلہ کشمیر لیبر پارٹی کے منشور کا حصہ میری اور میرے چند مخلص ساتھیوں کی کوششوں سے بنا۔ مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ پاکستان اور بھارت دونوں پر دفاعی اخراجات کا بھاری بوجھ ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ دونوں پڑوسی ممالک مسئلہ کا پُرامن حل نکال کر اپنے وسائل کو عوامی فلاح و بہبود پر خرچ کریں۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ مسئلہ کشمیر کے حل میں پاکستان کا کردار بنیادی حثیت کا حامل ہے۔ یہ کوئی علاقائی مسئلہ نہیں بلکہ یہ سوا کروڑ افراد کے حقِ خودارادیت کا معاملہ ہے۔ کشمیر دنیا کیلئے ایک ''نیوکلیئر فلش پوائنٹ'' کی حثیت رکھتا ہے اور اس پر کسی وقت بھی ایٹمی جنگ ہو سکتی ہے۔

''آپ سیاست میں کس کے کردار کو نشانِ راہ بنا کر چلے''؟

میں نے کوشش کی کہ میں حضرت عمر فاروقؓ کے کردار کو مشعل راہ بناؤں جو دریا کے کنارے بھوک سے مرنے والے کتے کی بھی فکر کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے بعد قائداعظم اور ذوالفقار علی بھٹو بھی سیاسی طور پر خاصی اہمیت کے حامل رہے۔ ''اگر آپ کو اعلیٰ منصب مل جائے تو''؟ کے جواب میں لارڈ نذیر احمد کا کہنا تھا کہ مجھے کوئی اس سے بڑی ذمہ داری ملی تو میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے عوام کے دادکو اپنا درد سمجھوں گا، اور عوامی خوشحالی کی بھرپور جدوجہد کروں گا۔

پاکستانی جمہوریت اور سیاست کے بارے میں پوچھے گئے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں

Marfat.com

نے کہا کہ نظام جمہوریت کا حامی ہوں اور اس لحاظ سے پاکستان میں مسائل موجود ہیں۔ سب پاکستانی سیاسی جماعتوں اور شخصیات کی عزت کرتا ہوں گو ان میں اچھائیاں اور برائیاں بھی موجود ہیں مگر دعا گو ہوں کہ یہاں جمہوریت مکمل طور پر آئے۔ میری نظر میں پاکستانی عوام میں آج بھی جہالت موجود ہے اور موجودہ زمانے میں بھی روٹی، کپڑا اور مکان انکا مسئلہ ہے۔ پاکستانی قوم انفرادی حثیت میں دنیا کی بہترین قوم ہے۔

لارڈ نذیر کے خیال میں اگر مغل بادشاہ تاج محل کے بجائے یونیورسٹیاں قائم کرتے تو آج ہمارے حالات کافی بہتر ہوتے، اکسفورڈ اور کیمرج یونیورسٹی بھی تو اسی عہد میں بن رہی تھیں۔
اپنی کامیابی کا راز بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ میں عزت وذلت کو خدا کے ہاتھ سمجھتا ہوں، اس لیے بڑے سے بڑے مسئلے پر پریشان نہیں ہوتا، اپنی ہر کامیابی کو عطیہ خداوندی تصور کرتے ہوئے سجدہ شکر ادا کرتا ہوں۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود مطالعے کیلئے ضرور وقت نکال لیتا ہوں اور اسلامی، تاریخی اور سیاسی کتب پڑھنے کا مجھے بہت شوق ہے۔

Marfat.com

میں نے مولانا اعظم طارق کے بھائی اور ڈاکٹر طاہر القادری کے بیٹے سے الیکشن جیتا

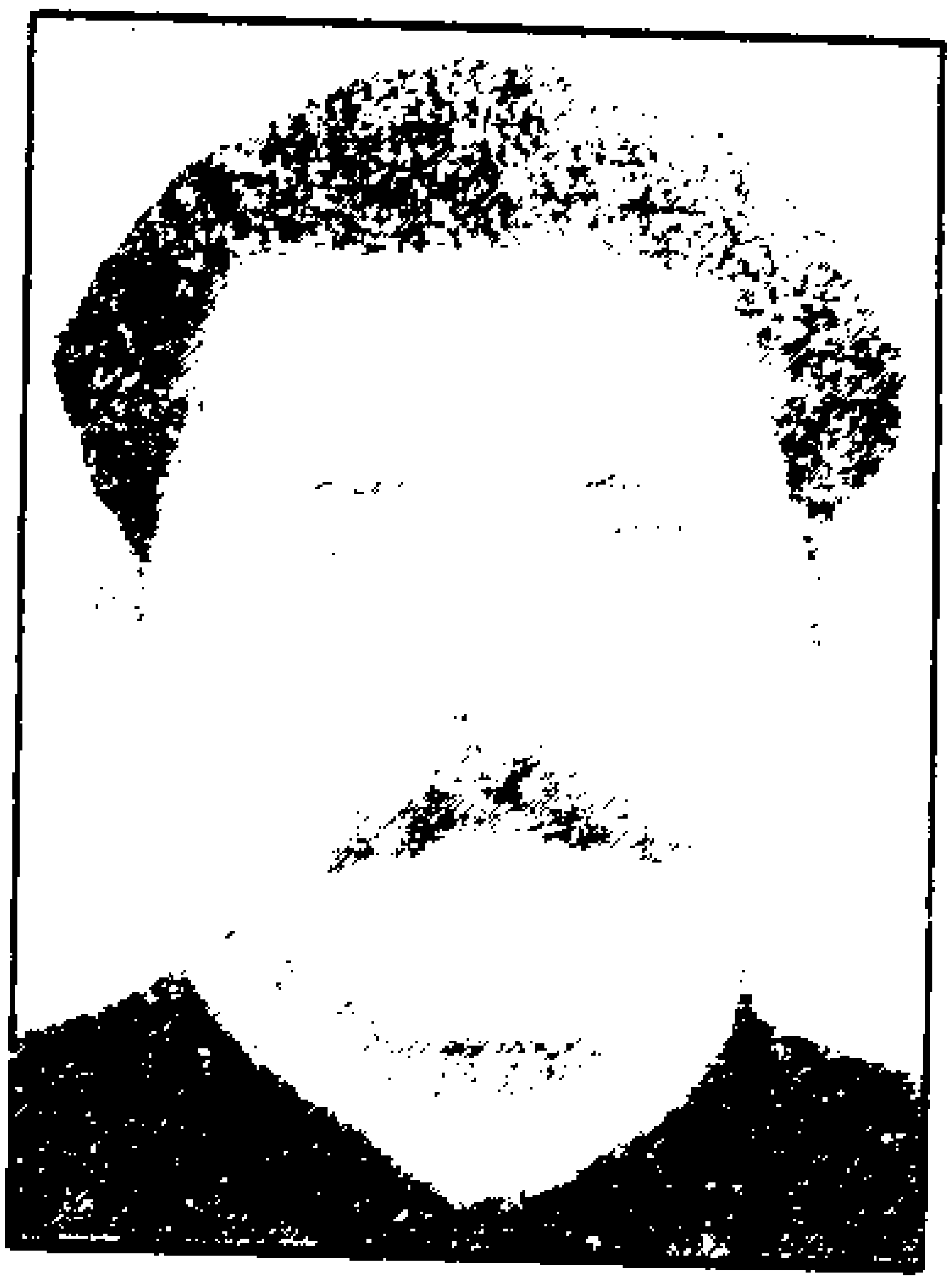

شیخ وقاص اکرم اگرچہ بہت بڑا لیڈر نہیں لیکن اسے چھوٹا لیڈر بھی نہیں گردانا جا سکتا۔قومی سطح پر جونیئر پارلیمنٹرین میں شامل یہ نوجوان سنیئر پارلیمنٹرین والے اعتماد کا مالک ہے۔26اگست1974ءکو ایبٹ آباد میں اپنے نانا کے گھر پیدا ہوئے،بچپن جھنگ میں گزارہ اور چھٹی جماعت تک تعلیم بھی یہاں سے حاصل کی۔ساتھویں میں ایبٹ آباد پبلک سکول میں چلے گئے اور یہیں سے ایبٹ آباد بورڈ کے تحت1981ء میں میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے انٹرمیڈیٹ اور پھر تاریخ اور صحافت کے مضامین میں گریجویشن مکمل کی۔اسکے بعد شیخ وقاص آسٹریلیا روانہ ہوئے اور وہاں سے بزنس،فنانس اور اکاؤنٹس میں گریجویٹ ڈپلومہ منیجمنٹ مکمل کیا۔

اراکین اسمبلی میں سب سے زیادہ سیکورٹی گارڈز رکھنے کا اگر کوئی ایوارڈ ہوتا تو وہ یقیناً وقاص اکرم شیخ ہی کو ملتا۔

خطرات سے کھیلنا میرا مشغلہ ہے آسٹریلیا سے گریجویٹ ڈپلومہ حاصل کرنے کے بعد میں مزید تعلیم کیلئے وہاں کی مختلف یونیورسٹیز میں گیا،ایک یونیورسٹی کے استقبالیہ سے معلومات لیں تو میں نے وہاں ہی داخلہ لینے کا فیصلہ کرلیا،اب داخلہ فارم پُر کرنے کا مرحلہ آیا،اسمیں مضامین کا انتخاب بھی کرنا تھا کہ میں نے استقبالیہ پہ بیٹھی خاتون سے پوچھا کہ کون سا کورس مشکل ہے تو اُس نے ماسٹرز انفارمیشن سسٹم منیجمنٹ کورس کا کہا چنانچہ میں نے وہیں اسی کو منتخب کیا چونکہ مشکلا ت کے سامنے ڈٹ جانا ہی تو میرا انداز تھا اور پھر اللہ نے مجھے اسمیں کامیاب بھی کیا۔لیکن جب پی ایچ ڈی کا ارادہ کیا تو پیچھے سے میرے گھر والوں کی طرف سے یہ ''دھمکی'' ملی کہ واپس نہ آئے تو پیسے بند کردیں گے تمہارے۔2002ء میں پاکستان واپس آ گیا اسوقت میرے والد شیخ محمد اکرم تحصیل ناظم تھے۔میں کاروبار پر بھی بیٹھا مگر مزا نہیں آیا۔الیکشن سر پر تھے اور کالعدم تنظیموں کی وجہ سے حالات خراب تھے۔گروپ کے بھرپور اسرار پر میں نے قومی اسمبلی کی نشست پر انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔علامہ طاہر القادری نے میری عمر کو چیلنج کردیا۔میرے کاغذات مسترد کردیے گئے

Marfat.com

اس فیصلے کے خلاف میں مختلف عدالتوں سے ہوتے ہوئے سپریم کورٹ پہنچا جہاں میرے کیس کے حوالے سے ایک تاریخی فیصلہ ہوا جواب قانون بن گیا ہے۔اس فیصلے کے مطابق اب یونین کونسل ریکارڈ میں درج عمر کو مستند قرار دیا گیا۔میرے وکیل فخر الدین جی ابرھیم اور شہزاد جہانگیر تھے اور جسٹس بھگوان داس نے اسکی سماعت سنی تھی۔آپ یہ سمجھیں کہ میں نے عدالتوں کی سیڑھیوں پر کمپین کی ،جب مجھے الیکشن لڑنے کی اجازت ملی تو پولنگ میں صرف چھ دِن باقی تھے،ہم نے ان آیام میں مہم چلائی مگر چھ ہزار ووٹوں سے مجھے شکست کا سامنا کرنا پڑا تاہم طاہرالقادری صاحب اور میرے ووٹ برابر نکلے۔گوکہ میرے خلاف دو بڑے مذہبی راہنماء کھڑے تھے جنہیں مسلک کی بنیاد پر بھی ووٹ پڑے لیکن اسکے باوجود میں نے 36 ہزار ووٹ حاصل کیے۔پھر دو ہزار چار میں ایک بدقسمت واقعہ پیش آیا جسمیں مولانا اعظم طارق کو قتل کر دیا گیا۔مولانا کی خالی کردا سیٹ پر ضمنی انتخابات کے شیڈول کا جب اعلان ہوا تو جھنگ سے میں نے الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اسوقت شہر کے حالات بہت خراب تھے۔مجھے مولانا اعظم طارق کے بھائی اور علامہ طاہرالقادری کے صاحبزادے کے مقابلے میں کامیابی نصیب ہوئی۔

میرے والد کی شروع میں سیاست میں دلچسپی نہیں تھی لیکن جب میرے تایا کو قتل کیا گیا تو انہوں نے اس میدان مین اُتر کر عوامی خدمت کے تسلسل کو جاری رکھا۔

شیخ وقاص احمد نے کہا کہ میرے لیے ایک واقعہ نا قابل فراموش ہے جب میں چھٹی جماعت میں تھا تو الیکشن والے دن ہمارے خاندان کے لوگوں کو ایک مذہبی تنظیم نے شہر میں گولیاں ماریں،میرے تایا کو قتل کیا گیا،ہماری حمایت کرنے والوں کے بچوں کو گولیاں لگیں۔اسوقت پولیس اور انتظامیہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔بکتر بند گاڑیوں کو نذر آتش کیا جا رہا تھا،امیدوں کا جہاں اُجڑنے پر اسوقت مجھ کم سن کی آنکھوں میں افسوس کی نمی تیری تھی تب میں نے فیصلہ کیا تھا کہ نفرت کے ان شعلوں کو سرد کروں گا اور اللہ نے اگر مجھے موقع دیا تو میں مذہب کے نام پر قتل وغارت بند کرنے کیلئے اقدامات کروں گا اور شہر کو مذہبی تفرقہ بازی سے بچاؤں گا۔

میری ایم این اے شپ کے تین سالوں میں کرفیو نہیں لگے بلکہ سولہ کروڑ روپے کی لاگت سے سوئی گیس کی فراہمی عمل مین لائی گئی،بجلی سے محروم علاقوں کو دس کروڑ روپوں سے بجلی کی سہولت پہنچی اور مختلف شعبوں میں چار کروڑ روپے کے منصوبے پایہ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔

میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ ڈرتا کسی سے نہیں،حضور ﷺ کو اپنا رہبر سمجھتا ہوں جنکی رہنمائی میں کامیابی

Marfat.com

ملتی ہے۔ کسی بھی مصیبت میں والدہ سے رجوع کرتا ہوں۔ اُن کا کہنا تھا کہ ہم امن پسند ہیں اور مسائل کا مذاکرات کے میز پر حل چاہتے ہیں، گولی کسی مسئلہ کا حل نہیں۔ اسوقت پاکستان اس نہج پر پہنچ چکا ہے کہ آج اگر یہاں کا عالم، سیاستدان، مزدور اور کسان اپنی مٹی کے تحفظ کیلئے فرقہ واریت کے خاتمے کی عملی کوشش نہیں کریں گے تو ہماری آنے والی نسلوں کے حصے میں بھی آگ ہی آئے گی۔ بے نظیر نے بھی امن دشمنوں کو مضبوط کیا اور نواز شریف انہیں نوکریاں دیتا رہا۔ اس عذاب سے چھٹکارہ پانے کی اگر کچھ کوشش کی ہے تو وہ جنرل مشرف ہیں۔

میں آپ کو بتاؤں کہ یہ جو امن ہے، یہ سب کچھ ہے۔ جب ہمارے جھنگ کے حالات خراب تھے تو کاروباری طبقہ جس میں ریڑی والے بھی شامل تھے شہر سے بھاگ رہے تھے چونکہ یہاں انہیں تحفظ حاصل نہیں تھا۔ لیکن اس سلسلہ کو ہمارے دور میں کافی کنٹرول ملا ہے۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میری نظر میں جو کاروباری شخصیت کسی امن دشمن تحریک کو مالی معاونت فراہم کرتی ہے اس کے لیے قانون میں سزا ہونی چاہیے، میں نے اس نقطے کو قومی اسمبلی میں بھی زیر بحث لایا ہے۔ میں رات ایک بجے تک بیدار رہتا ہوں اور مطالعہ کرتا ہوں نوم چومسکی میرے پسندیدہ لکھاری ہیں۔ میرے تین بھائی اور ایک بہن ہے۔

''کیا آپ غلطیوں اور خامیوں کا بھی شکار ہوئے''؟ جی ہوا ہوں گا۔ لیکن میں اپنی غلطی کا جلد احساس کر لیتا ہوں اور پھر اسکے ازالے کیلئے کوشاں ہو جاتا ہوں۔ انسان اگر حقیقت پسندی کو اپنا لے تو کبھی مایوسی اس کے پاس نہیں آئے گی۔

ایک سوال پر شیخ نے کہا کہ میں جمہوریت کا دیوانہ ہوں۔ بے شک ہمارے ملک میں آنے والے جمہوری رویوں پر اُنگلی اُٹھائی جا سکتی ہے لیکن یہ نظام بڑا آئیڈیل ہے۔ میں روایتی طور پر مسلم لیگ کو سے وابستہ ہوں، اس لیے اس جماعت کا پلیٹ فارم استعمال کیا۔

Marfat.com

ڈپٹی سپیکر قومی اسمبلی کے کامیاب سفر پہ ایک نظر

جس خاک کو نظر انداز کیا جاتا تھا اسی دھرتی سے آغاز سفر کرنے والے سردار یعقوب کی پیدائش ضلع ایبٹ آباد کے پسماندہ گاؤں نگری بالا میں 15 فروری 1941ء کو ہوئی۔ ان کے ماضی پر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ یہ وہی سردار یعقوب ہیں جنھیں یونین کونسل کے ناظم کی نشست پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن چھیاسٹھ سالہ سرادر یعقوب نے حیرت انگیز طور پر جوان جذبوں سے اسی نگری میں کامیابی کا سکہ جمایا، آپ نہایت قلیل عرصہ میں ملکی مرکزی سیاست میں خاصہ اہم مقام پر فائز ہوئے۔ آج قومی اسمبلی کی ایک خصوصی کرسی پر پہنچ کر بھی وہ ان راستوں کو یاد کرتے ہیں جن پر پیدل چل کر وہ اس اسمبلی تک پہنچے۔

اپنی گفتگو کے دوران انہوں نے بتایا کہ میں نے پرائمری تا مڈل تک مقامی سرکاری سکول، میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 ایبٹ آباد، گورنمنٹ ڈگری کالج ایبٹ آباد سے بی ایس سی اور پھر یونیورسٹی آف بلوچستان کوئٹہ سے ایم۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد 61ء میں گورنمنٹ ہائی سکول نتھیا گلی اور پھر لورہ سکول میں بحیثیت اُستاد فرائض سرانجام دیئے۔ 64ء میں ''ٹیکنیکل آفیسر'' کے طور پر ٹی۔ آئی۔ پی میں کام کیا، اسی سال فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے تحت سروے آف پاکستان کیلئے منعقدہ امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا

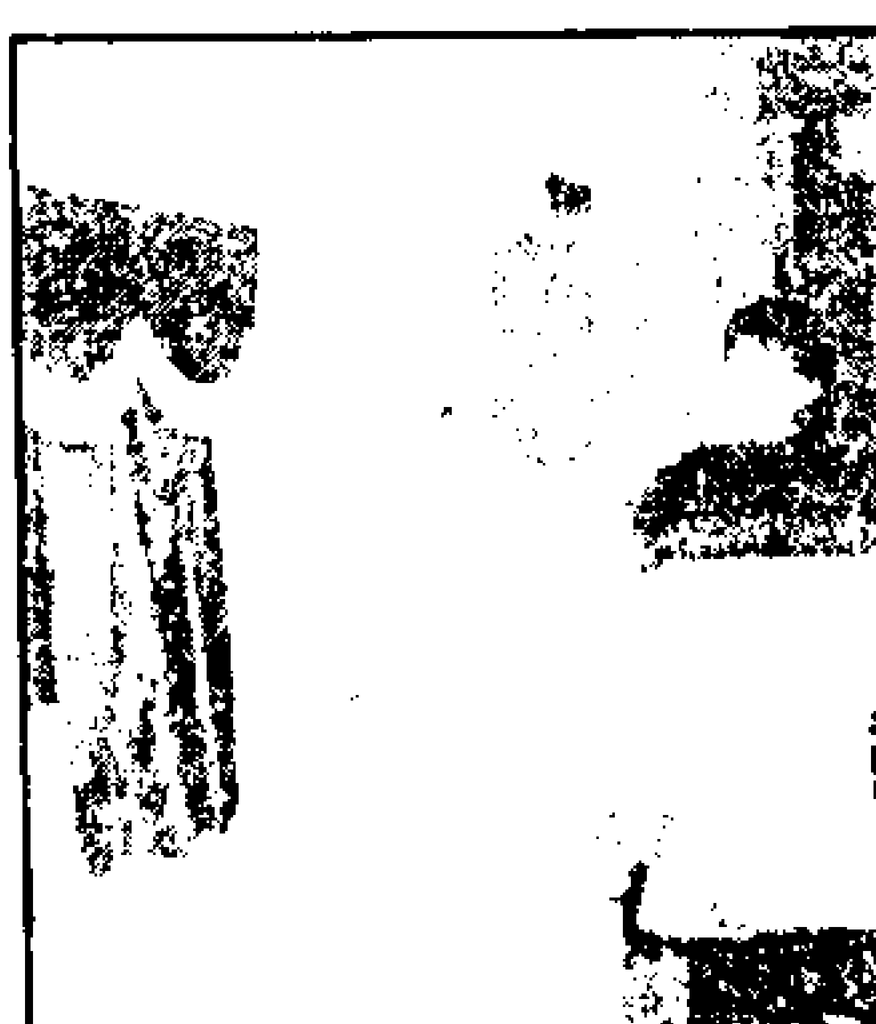

سروے آف پاکستان ٹریننگ انسٹیوٹ سے دوسال تربیت لی۔ ٹریننگ کی تکمیل کے بعد ڈیپوٹیشن پر میری تعیناتی پاکستان آرمی میں ہوگئی۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ اور اسکے بعد پاک آرمی میں بطور سروے آفیسر رحیم یار خان اور سیلمانکی کے معاذ پر کام کیا۔ اور وہ علاقے جو پاکستانی فوج نے انڈیا سے حاصل کیے انکی نقشہ بندی کروائی۔ 69ء کے عرصہ میں پاک چین بارڈر پر باونڈری کے تعین کے سلسلہ میں پاکستان

Marfat.com

کی نمائندگی کی۔ اسکے علاوہ میں اقوام متحدہ کی اُس منتظر ٹیم کے بھی ممبر تھے جس نے پاکستان اور انڈیا کے سیز فائر لائن کی حد بندی کے مسئلہ کو سلجھایا۔ ۷۱ء سے ۷۳ء تک میں پاکستان انڈیا جوائنٹ کمیشن کا بھی ممبر رہا جو پاکستان اور بھارت کے درمیان لائن آف کنٹرول کے تعین کے لیے بنایا گیا تھا۔ دورانِ سروے ہم لائن آف کنٹرول کے قرب وجوار میں واقع علاقوں بمبھر وغیرہ میں پیدل چل کر اسکا تفصیلی سروے کرتے ،ایک دن رحیم یار خان میں سروے کے دوران اچانک بھارتی حدود میں چلے گئے ،36 گھنٹے جھاڑیوں میں چھپے رہے اور اس حوالے سے ہم نے اپنے وائرلس سیٹ سے پیغام بھیجا تو ہمیں آرمی کا ایک آدمی لینے آیا۔ اللہ کے فضل سے متنازعہ جگہوں کے حوالے سے 80ء فیصد کیس ہم نے جیتے۔ آج فوجیں جہاں موجود ہیں اس حد کا تعین بھی اسی کمیشن نے کیا تھا جسکا میں ممبر تھا۔

۷۶ء سے ۸۷ء تک میں سعودی عرب کی ایک پٹرولیم کمپنی کے انجینئر اور پراجیکٹ منیجر کے طور پر کام کرتا رہا۔ ۸۷ء میں وطن واپسی پر برادری کی مشاورت سے بلدیاتی انتخابات میں حصہ لیا اور ضلع کونسل کے ممبر منتخب ہوگیا۔ میں نے نوے میں اپنے دوست منور حسین کے ساتھ مل کر ایک انجیئرنگ کنسلٹنٹ فرم ''مائیکو کنسلٹنگ انجیئرز'' کا بنیاد رکھی جو روڈ ڈیزائنگ اور سروے کا کام کررہی ہے۔ ہم فرم نے ہی لاہور اسلام آباد موٹروے کا سروے اور ڈیزائن بنا کر کورین فرم ڈائیو کے حوالے کیا۔

2002ء کے بلدیاتی انتخابات میں یونین ناظم کی نشست پر میں نے الیکشن میں حصہ لیا مگر ناکام رہا، الیکشن جیت کر میرے مخالفین نے میرے گھر کے باہر آکر نعرے لگائے اور ان نعروں میں گندی زبان استعمال کی۔ لیکن میں نے استقامت کا مظاہرہ کیا۔ پھر ضلعی کسان کونسلر کے انتخاب میں بھی کامیابی حاصل نہ کرسکا۔ اسکے بعد صوبائی اور قومی اسمبلی کے الیکشن آئے تو مجھے اپنے قبیلے کے معززین نے مجبور کیا کہ میں اس ان میں حصہ لوں، میں صوبائی اسمبلی کی سیٹ کیلئے کھڑا ہونا چاہتا تھا مگر میرے والدہ نے کہا کہ بیٹا ''بڑا الیکشن لڑو'' اللہ تمہیں کامیاب کرے گا۔ والدہ کی اس دعا سے میرے حوصلے بلند ہوئے اور میں نے قومی اسمبلی کیلئے کاغذات نامزدگی کا اندراج کروادیا۔ اس بار مجھے پانچ ہزار ووٹوں سے کامیابی ہوئی۔ پھر

Marfat.com

بلدیاتی انتخابات میں میں نے جس امیدوار سے شکست کھائی اُسے میرے بیٹے نے شکست سے دوچار کیا۔ڈپٹی سپیکر بننے کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا میں ہزارہ کے ایم این ایز کا مشکور ہوں جنہوں نے مجھ پر اعتماد کیا۔ برسرِاقتدار آنے کے بعد میں نے اپنے حلقہ انتخاب کا تفصیلی جائزہ لیا، میں جو لوگوں کے اجتماعی مسائل سنتا سروے آف پاکستان کے کارندے کی آنکھ سے موقع پر انکی جا کر تصدیق بھی کرتا اور دیگر تعمیری پہلوؤں کا جائزہ بھی لے لیتا۔میرے علاقہ کے آٹھ سو دیہات بجلی نہ ہونے کی وجہ سے تاریکیوں میں ڈوبے تھے، الحمدللہ ان میں سے نصف کو بجلی کی سہولت فراہم کر چکا ہوں۔علاقے کی وہ پانچ ندیاں جنہیں بارش میں لوگ عبور نہیں کر پاتے تھے ان پر پُل قائم کیے۔ حلقے میں پانچ نئی ٹیلیفون ایکسچینج کا قیام عمل میں لایا، بے شمار دیہاتوں تک روڈ پہنچائی اور علاقے کے وہ درینہ مسائل حل کیے جو پچھلے ساٹھ سال سے موجود تھے۔

حصول تعلیم کے دوران جب میں آٹھویں جماعت کا طالبعلم تھا تو علاقہ کے ایم پی اے سردار غلام نبی مرحوم کا بہت چرچا سنا، اور انہیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ میں بھی بڑا آدمی بنوں گا۔میں نے آٹھویں میں ایوب خان کے نام ایک درخواست لکھی کہ ہمارے مڈل سکول کو ہائی کا درجہ دیا جائے تو اس کا بڑا مثبت ردعمل سامنے آیا۔

میں نے اساتذہ سے سیکھا تھا کہ ہمیشہ سچ بولنا، اپنے اس اصول کو میں نے اسمبلی تک بحال رکھا۔سیاسی طور پر بھی جھوٹ نہیں بولے۔انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ پاکستان میں آج تک حقیقی جمہوریت آئی ہی نہیں، جسکو جو ملا اُس نے سمیٹا۔

چار بھائی اور ہماری تین بہنیں ہیں۔ بڑے بھائی زمیندار ہیں، ان سے چھوٹا میں ہوں، مجھ سے چھوٹا بھی زمینداری کے پیشے سے وابستہ ہے اور سب سے چھوٹا بھائی نتھیا گلی میں سکول ٹیچر ہے۔میرے چار بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا سردار نسیم احمد اپنی یونین کونسل کا ناظم ہے، دوسرا سردار شبیر احمد آرمی میں بحثیت کرنل فرائض سرانجام دے رہا ہے، سردار ظہیر احمد میری بنائی ہوئی فرم کو چلا رہا ہے اور سردار نصیر احمد میرے کاموں میں معاونت کرتا ہے، ان چار بھائیوں کی کوئی بہن نہیں، زمین وراثت میں ملی اور ایک گھر نوکری کر کے بنایا۔

Marfat.com

میں نے زندگی میں کبھی آس کا دامن نہیں چھوڑا بلکہ آہستہ آہستہ لگا رہا ہوں۔

اپنی اسمبلی کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ قومی اسمبلی کے ساڑھے چار سالوں میں ارکین اسمبلی کی جانب سے 39 ہزار سے زائد سوالات داخل ہوئے اور جو سوالات قواعد پر پورے اُترتے تھے انکے جواب ایوان نے دیئے ہیں۔ ہماری اسمبلی سادہ اکثریت رکھتی تھی پھر بھی اس میں 185 آرڈیننس آئے اور ان میں سے 49 باقاعدہ اسمبلی سے منظور ہوکر قانون بن چکے ہیں اور سو سے زائد آرڈیننس قائمہ کمیٹی کے پاس زیر غور ہیں۔ بحیثیت سپیکر میری کوشش رہی ہے کہ ہر ممبر کو پورا وقت دیا جائے۔ میں اس بات کا بھی خیال رکھتا ہوں کہ ایک ممبر کو زیادہ وقت دینے میں دوسرے کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ کورم کے مسئلے سے متعلق پوچھے گئے سوال پر اُن کا کہنا تھا کہ یہ بات درست ہے کہ اسمبلی میں ارکین اسمبلی کی مطلوبہ تعداد نہ ہونے کے باعث وقت اور سرکاری وسائل کا ضیاع ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ دنیا کی اکثر اسمبلیوں میں اس حوالے سے اصول وضوابط موجود ہیں، ہمیں بھی اس مسئلے کے حل کیلئے قانون سازی کرنا ہوگی اگر ارکین اسمبلی ایوان کے اندر سیاسی کاموں کے بجائے آئینی کام کریں تو کورم کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ گفتگو کے تسلسل کو توڑتے ہوئے میں نے کہا کہ حزب اختلاف کی جماعتوں کا موقف ہے کہ انہیں قومی ایشوز پر اظہار رائے کا موقع فراہم نہیں کیا جاتا آپ کیا کہتے ہیں؟ سردار یعقوب کا کہنا تھا کہ اس بات میں صداقت نہیں، اکبر بگٹی، صدر کی وردی، وزیرستان، امن وامان، سٹیل ملز کیس، چینی بحران، چیف جسٹس سے متعلقہ صدارتی ریفرنس اور اسی طرح کے کئی دیگر امور پر اپوزیشن ارکین نے کھل کر بات کی۔ ایک سوال پر کہ نقطہ اعتراض پر حزب مخالف کے نمائندوں کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے انہوں نے کہا کہ اسمبلی اجلاس کے دوران اگر کوئی بات قواعد وضوابط سے ہٹ کر ہو ہی ہو تو اس پر کوئی رکن اسمبلی اُٹھ کر نقطہ اعتراض اُٹھا سکتا ہے لیکن یہاں اس پر لمبی لمبی تقریریں ہوتی ہیں اس لیئے سپیکر سب کو مناسب وقت دینے کی کوشش کرتا ہے۔ جو نقطہ اعتراض بنتا ہے اسے تسلیم بھی کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

''چھوٹے گھر'' سے اُبھرنے والا ''بڑا'' آدمی

سردار محمد یوسف کی زندگی ایک فلمی کہانی کی مانند ہے، دکھوں اور محرومیوں کی چھاؤں میں آنکھ

کھولنے والے یوسف جب چار سال کے تھے تو انکے والد سردار شاہ زمان کا انتقال کر جاتے ہیں، اسوقت انکے علاقے میں بڑی جاگیریں چند لوگوں کی ملکیت تھیں باقی لوگ رعایا کی حثیت رکھتے ہوئے ہونگے۔ تب اس جوان نے مانسہرہ کی پسماندہ سیاسی فضاء میں جینے کا ایک جدید اُصول وضع کیا اپنے اردگرد عوامی انقلاب پر مدتوں سے پڑے پردے کو اُٹھایا غریبوں کیلئے بہتر ماحول کے متلاشی یوسف نے قوم کو اتحاد کا شعور دے کر لوگوں سے محبت، دردمندی اور خلوص کے لہجے میں مخاطب ہو کر نظام کے خلاف جدوجہد کا جھنڈا اُٹھاتے ہوئے غریبوں کے دلوں کو گرمایا اور پھر ''انکی'' حکومت قائم کر دی۔

ضلعی ناظم کی حثیت سے ذمہ داریاں سرانجام دینے والے سردار یوسف اپنی داستان بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ بچپن میں میرے والد کے انتقال کے بعد میرے بڑے بھائی حاجی اسماعیل نے میری کفالت کی جو زمینداری کرتے تھے۔ میرے دوسرے بڑے محمد اختر 62ء میں انگلینڈ چلے گئے تھے انہوں نے ہی زندگی بھر میری مالی معاونت کی۔ اُنیس سو باون میں مانسہرہ کے پسماندہ علاقہ ''جھال گلی'' میں ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے گورنمنٹ ہائی سکول بٹل جو ہمارے گھر سے تقریباً چھ کلومیٹر کے فاصلہ پر تھا سے روزانہ پیدل چل کر تعلیم حاصل کی۔ مانسہرہ انٹرمیڈیٹ کالج سے ایف اے کیا پھر نیشنل کیڈٹ کالج کورس کی چھ ماہ کی ٹریننگ کھاریاں کینٹ سے مکمل کرنے کے بعد میں نے بی اے میں داخلہ لیا اور فائنل ائیر میں پہنچا ہی تھا کہ ایک حادثہ کا شکار ہو گیا، یہاں سے تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ اسی دوران ستمبر انیس سو چھتر کو سویڈن کالج انگلستان میں تعلیمی ویزا پر چلا گیا، وہاں تین سال پانچ ماہ رہا، میں نے سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کالج لائف سے ہی کر دیا تھا اور انگلینڈ میں بھی انکو جاری رکھا۔ یہاں میں پاکستان مسلم ایسوسی ایشن سویڈن کا سیکرٹری جنرل بھی رہا۔ جب پاکستان آیا تو بلدیاتی انتخابات کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ علاقہ کے لوگوں کے اسرار پر میں نے ان انتخابات میں حصہ لے لیا اور غیر متوقع طور پر ڈسٹرکٹ کونسل کی نشست پر

Marfat.com

ضلعی ناظم سردار یوسف انٹرویو دے رہے ہیں اس موقع پر انکے فرزند سردار شاہجہاں یوسف بھی موجود ہیں

کامیابی حاصل کی۔ پھر ان سیاسی سرگرمیوں کی بناپر میں واپس انگلینڈ بھی نہ جاسکا۔ چونکہ میں علاقہ کے سرمایہ داروں اور وڈیروں کو شکست دے چکا تھا اس لیئے غریبوں کی توقعات مجھ سے زیادہ تھیں۔ میں دن رات علاقہ کی تعمیر و ترقی کیلئے مصروف رہا اور انیس سو بچاسی میں جب دوسرا بلدیاتی الیکشن ہوا تو کامیابی ایک بار پھر میرے حصے میں آئی۔ قومی وصوبائی انتخابات میں کامیابی کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ اسی طرح مجھے مرحلہ وار صوبائی اور قومی انتخابات میں بھی کامیابیاں حاصل کرتا رہا۔ پچاسی کے غیر جماعتی الیکشن میں مجھے صوبائی وزیر حق نواز اور علاقے کے دیگر وڈیروں کے مقابلے میں فتح نصیب ہوئی۔ اٹھاسی تک میں ممبر صوبائی اسمبلی اور حکومت سرحد کا مشیر رہا...... اسی سال جب دوبارہ انتخابات کا انعقاد ہوا تو مجھے چند سو ووٹوں سے فیض خان نے شکست دی۔ اسی طرح میں ضمنی انتخابات اکانوے میں بھی کامیاب نہ ہوسکا۔ لیکن الیکشن ہارنے کے باوجود میں نئے جذبے سے علاقے کے لوگوں کی خدمت کرتا رہا۔ انیس سو نوے میں مانسہرہ پی ایف پینتالیس اور این اے پچاس دونوں سے میں آزاد امیدوار کی حثیت سے سامنے آیا اور یہاں سے قومی اور صوبائی دونوں نشستوں پر الیکشن جیت لیا۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے سردار یوسف کہتے ہیں کہ میں نے پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے بھی انتخابات میں حصہ لیا لیکن اس سے اس لیے الگ ہوا کہ میرے مقابلے میں جیتنے والے خان آف الائی نے بھی پی پی میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔ تیرنوے میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن میں حصہ لیا اور سابق وزیر سید قاسم شاہ کو چھبیس ہزار ووٹوں کی برتری سے شکست دی۔ پھر اس تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے انیس سو ستانوے میں بھی مانسہرہ کی تمام سیاسی قوتوں کو شکست سے دوچار کیا۔ مسلم لیگ سے علیحدگی سے متعلق پوچھے گئے سوال کے جواب میں سردار یوسف کہنے لگے کہ جب نواز شریف پاکستان میں تھے تو ہم بھی انکے ساتھ تھے۔ لیکن انہوں نے ہمارے مشورے بغیر جب ملک چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو ہمیں مجبوراً ان سے الگ ہونا پڑا۔ یوسف کے مطابق جب نواز شریف گئے تو اسوقت میں حج پہ گیا ہوا تھا واپس آیا تو ''ق'' لیگ بن رہی تھی ہم نے اسمبلیوں کے وجود اور جمہوریت کی بحالی کیلئے اس جماعت میں آنے کا فیصلہ کیا چونکہ یہ ہمارے ''ن'' کے بھی اکثر

Marfat.com

ساتھیوں کا فیصلہ تھا۔ ''کیا آپ کی سیاسی فتح میں ہمیشہ آپکی برادری کردار ادا کرتی ہے''؟ میں نے سوال داغ دیا کہنے لگے کہ یوں تو پورے پاکستان میں لوگ برادری کے لحاظ سے ووٹ دیتے ہیں ہم نے برادری نہیں اُس محروم طبقے کی نمائندگی کی ہے جو پسماندگی کے چنگل میں گرفتار تھا۔ میرے علاقے میں صرف ایک برادری ''گجر'' ہی نہیں بلکہ یہاں بہت سی برادریاں ہیں ہمارے علاقے میں سواتی، تنولی، اعوان، سید اور کئی دیگر قومیں بستی ہیں۔ میرے انتخابی نتائج گواہ ہیں کہ ہم نے برادری کے زور پر الیکشن نہیں جیتے بلکہ ہمیشہ محروم لوگوں نے ہمارے ہاتھ مضبوط کیے ہیں۔ ''آپ کی سیاست نے محروم طبقے کو کیا دیا......؟'' میں آپ کو بتا تا چلوں کہ میرے سیاست میں آنے سے پہلے جتنے بھی دیہاتی گاؤں تھے وہ ہمیشہ نظر انداز رہے، وہاں سڑکیں نہیں تھیں، بجلی ناپید تھی، طبی سہولیات کا فقدان تھا اور سکول نہیں تھے لیکن ہم نے پچاسی سے آج تک ہمیشہ نظر انداز علاقوں کو اولیت دی، آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے اور میرے بیٹے سردار شاجہان یوسف نے ضلع مانسہرہ میں اربوں کے ترقیاتی کام کروائے۔ ہزارہ یونیورسٹی کے قیام کے حوالے سے اپنی کوششوں سے اگاہ کرتے ہوئے انہوں نے دعویٰ کیا کہ میں نے ہزارہ یونیورسٹی کے مانسہرہ میں قیام کی مہم کا آغاز کیا۔ میں نے وزیراعظم نواز شریف سے 90ء میں جلسہ عام میں مطالبہ کیا تھا کہ مانسہرہ ''مغل ہسپتال'' کی جگہ پر یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اسی طرح ہم نے اپنے دور میں مانسہرہ کیلئے ائیرپورٹ کا سروے بھی کروایا مگر یہاں زمین کی عدم دستیابی کے باعث اس خاکے میں رنگ نہیں بھرا جاسکا۔

اُن کا کہنا تھا کہ میری سیاست نے نہ صرف محروم طبقے کو آواز دی بلکہ ان کے مزاج میں تبدیلی لائی ہے اور انکے اندر موجود احساس محرومی دور کیا ہے، زندگی بھر ہمیشہ سیاست میں پُرامن راستے کا انتخاب کیا۔ میرا سیاست میں آنا ناگوار ترین عوامل کا ناگزیر ردعمل تھا۔ استحصالی طبقے سے عوام کو بچانے کی تمنا تھی جو سیاست میں لے آئی۔ یہ تجربہ مشکل ترین ہونے کے باوجود نصرتِ الٰہی سے بڑا دلچسپ اور خوشگوار رہا۔ غریب مزدوروں، کسانوں اور غریب لوگوں کی محبت میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ غریب عوام کی جنگ جیتنے کے کئی اعزاز حاصل ہیں۔ قائداعظم میری پسندیدہ شخصیت ہیں جنہوں نے اپنے موافق کو منوانے کیلئے تلوار کا سہارا نہیں لیا، دہشت گردی نہیں کی، انتہاپسندی کے اقدامات نہیں کیئے بلکہ مذاکرات کا راستہ اپنایا، ہندو سکھ اور انگریز کے سامنے قانونی دلائل دیئے اور اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گئے۔

پاکستانی لوگوں کے مزاج کا جائزہ لیتے ہوئے سردار صاحب کا کہنا تھا کہ ہمارے ہم وطن سیدھے سادے ہیں۔ ہر عہد میں انہیں طرح طرح کے لالی پاپ دیئے گئے۔ تعلیم ہمارے معاشرے کا

Marfat.com

بنیادی مسئلہ ہے، درسگاہوں میں حب الوطنی کے مضامین پر اگر زور دیا جائے تو بہت سے قومی مسائل حل ہو جائیں گے۔

میں آج جو کچھ ہوں یہ میری غریب ماں اور باپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ جو چاہا وہ پایا۔ غلطیوں کا شکار ہوا ہوں گا، میں بندہ بشر ہوں، معصوم نہیں غلطیاں میرے پیکر کا تقاضا کرتی ہیں۔

اندھیرے سے روشنی کی جانب کامیابی سے سفر کرنے والے سردار یوسف نوجوانوں کے نام اپنے پیغام میں کہتے ہیں کہ آج کا نوجوان کل کا حکمران ہے، اسے شبانہ روز محنت کے ذریعے اپنے شاندار مستقبل کیلئے جدوجہد کرنی چاہیے۔ تعلیم انسانیت کا زیور ہے اور شباب حصول تعلیم کیلئے بہترین وقت نوجوانوں کو اپنا بہترین وقت تعلیم حاصل کرنے میں لگانا چاہیے۔

میں چونکہ مڈل کلاس سے ہوں اور وڈیرے مجھے عوام سے دور کرنے کیلئے مجھ پر کرپشن کے الزامات لگاتے ہیں۔ اللہ نے ہمیشہ مجھے کرپشن اور دیگر برائیوں سے پاک رکھا۔ میں نے کبھی اوروں کے مفاد پر اپنے مفاد کو ترجیح نہیں دی۔ ''پاکستان کے غریب طبقے اور اپر کلاس میں آپ نے کیا فرق دیکھا''؟ میں سمجھتا ہوں کہ دوسروں کے دکھ کو سمجھنے اور اسے دور کرنے کا جذبہ اسی شخص میں ہوتا ہے جو اس میں سے گزرا ہو یا اسے اپنے اسلاف کی مشکلات کا اندازہ ہو۔ میری نظر میں دکھ انسانی زندگی کی تعمیر کرتا ہے۔

Marfat.com

نہ جانے کون سی آنکھیں وہ خواب دیکھیں گی

وہ خواب! ہم جس کے انتظار میں ہیں

؟

Marfat.com

Marfat.com

''زمینی ستارے'' حنان علی عباسی کی پہلی کاوش ہے، فلک کے ستاروں، فلمی ستاروں اور کرکٹ کے ستاروں کے متعلق تو ہم نے بہت سُنا اور پڑھا لیکن حنان علی نے مختلف طبقہ ہائے فکر کی نامور شخصیات کو ''زمینی ستارے'' قرار دے کر انہیں ایک ضخیم کتاب میں بند کر دیا، حنان علی عباسی کی ''زمینی ستارے'' کئی لحاظ سے ایک بہترین کوشش ہے، اس میں اسلوب کی روانی بھی ہے اور اندازِ بیان کی چاشنی بھی۔ میں نے زمینی ستارے کا مطالعہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ کتاب کسی بڑے ادیب یا دانشور نے تحریر کی ہے اور حنان علی عباسی کوئی ساٹھ سالہ بزرگ ہوں گے لیکن جب میری ان سے باضابطہ ملاقات ہوئی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ حنان علی صرف بیس، بائیس سال کے نوجوان ہیں۔ مجھے حنان علی کی کم عمری میں اتنی عمدہ کتاب لکھنے پر دِلی خوشی ہوئی۔ ''زمینی ستارے'' کے مطالعے سے دِل میں یہ احساس جاگزیں ہوتا ہے کہ کاش یہ کتاب ہر شخص تک پہنچ پائے۔ میں اتنی اچھی کوشش پر حنان علی کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد میرا خیال ہے کہ اگر انہوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا تو وہ بہت جلد پاکستان کے اچھے مصنفین میں شمار ہونے لگیں گے۔

جاوید چوہدری

Ds: Fine World Designers & Advertisers

Marfat.com